تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی اُردو

نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ

محقق

عاصمہ کبیر

39-FLL/PHDURDU/S13

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عاصمہ کبیر رجسٹریشن نمبر 39-FLL/PHDURDU/S13 نے ایم۔ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ"** رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

تنقید کی اہمیت اور ادب کے لیے اس کی ناگزیر ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کے نتیجے میں ادب کی تفہیم کے نئے لب و لہجے اور نئے تنقیدی رویے سامنے آتے رہتے ہیں۔ تانیثیت یانسائیت یا فیمینزم بھی ایک ایسا ہی تنقیدی رویہ ہے جس کی مدد سے ادبی سرمایے کو جانچنے کی روش عام ہو رہی ہے۔ کئی ناقدین ادب اس تنقیدی رجحان کے زیرِ اثر شعر و ادب کی مکرر تعبیر و تشریح میں مصروف نظر آتے ہیں۔ غالباً صنفِ تانیث ہونے کے باعث ہی میرے لیے بھی یہ رجحان وجہ کشش اور نذر سجاد حیدر کی تحریریں مرکز توجہ بنیں۔

پی۔ایچ۔ڈی کا کورس ورک مکمل کرنے کے بعد موضوع کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا۔ مختلف اسکالر اور اساتذہ کرام نے مختلف موضوعات تجویز کیے جس پر کام کرنے کی ضرورت تھی لیکن موضوعات کی اس بھیڑ میں مجھے کسی ایسے موضوع کی تلاش تھی جو محض لائبریری کی زینت بن کر نہ رہ جائے بل کہ ادبی متن کی کوئی ایسی جہت آشکار کرے جس کے اندر کئی تکثیری جہات موجود ہو۔ تانیثیت ایک ایسا ہی تکثیر الجہات تنقیدی رویہ نظر آیا۔ بالآخر کافی چھان پھٹک کے بعد "نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ "میرے لیے باعثِ کشش بنا۔

اُردو ناول کے آغاز وارتقاء میں اگرچہ بہت سے ناول نگار سامنے آئے جنھوں نے نہ صرف اپنے وقت کی تہذیب کو ناول کے فن میں سمو کر دوام بخشا بل کہ انیسویں و بیسویں صدی کے ہندوستان کی عورت کی الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کی بھی بھرپور نمائندگی کی اور حقوق کی ادائیگی میں مرد و عورت کی تخصیص کو غیر منصفانہ عمل گردانا۔ نسائی شعور کی بے داری میں مرد و خواتین نے مل کر ناول کے میدان میں قدم رکھا اور اصلاح نسواں کے لیے تگ و دو کی۔ ان اولین ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر کا نام نمایاں ہے۔ ان کے ناول اُردو کے تانیثی ادب کا نادر سرمایہ ہیں جن کا تانیثی مطالعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل کام ہے جو انیسویں صدی کی تانیثی فکر سمجھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو گا اور اس عہد کی خواتین ناول نگار کے تانیثی رویوں اور رجحانات سے آگاہی فراہم کرے گا۔ مزید بر آں نو آبادیاتی ہندوستان کی تانیثی جہات دریافت کرنے میں راہنما و معاون ہو گا۔ انھی مقاصد کے پیشِ نظر موضوع کا انتخاب کیا گیا۔

مقالہ پانچ ابواب اور ماحصل پر مبنی ہے۔ پہلا باب تانیثیت کی تعریف، مغربی و اُردو ادب میں فیمی نزم کی تحریک کا مختصر جائزہ، اُردو کلاسیکی ناولوں میں نسائی شعور اور اسلام میں عورت کے مقام و مرتبے پر مبنی ہے۔ دوسرے باب میں اوائل ہندوستان کے اُن حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف تحاریک کو جنم دیا جس کے نتیجے میں ہر تحریک اور شخصیت عورت کی حیثیت اپنے طور پر طے کرتی رہی۔ تیسرے اور چوتھے باب میں نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے کرداروں اور موضوعات کا تانیثی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں نذر سجاد کے ناولوں کا ہم عصر خواتین ناول نگاروں کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا گیا ہے تا کہ اس پس منظر میں اُس صدی کی تانیثی جہت واضح اور نمایاں ہو سکے۔

میں اپنے کام کی تکمیل پر اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس کی رحمتوں و کرم نوازیوں کے صدقے مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں کام یاب رہی۔ میں شکر گزار ہوں اپنی والدہ ماجدہ کی جن کی دُعائیں میری رفیق کار رہیں۔

میں بے حد ممنون ہوں اپنی پیاری استاد محترمہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی، جنھوں نے میری بے ربطی و بے ضابطگی کے باوجود شفقت و محبت سے بھرپور راہنمائی کی اور میرے کام کرنے کے حوصلے کو بڑھایا۔ میں بے حد شکر گزار ہوں شفقتِ پدری جیسی شجر سایہ دار شخصیت محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی جن کی سرپرستی اور معاونت نہ صرف تعلیمی سفر بل کہ عملی زندگی میں بھی میرے شامل حال رہی۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی ان اسکالرز اور کاس فیلوز کا جنھوں نے مواد کی فراہمی میں ہر ممکن مدد کی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں شکر گزار ہوں اپنے رفیقِ حیات یاسر رشید کا جن کا تعاون حاصل رہا اور میں محترمہ عاصمہ نذیر صاحبہ کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے اس مشکل مرحلے کو سر کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ انھیں کمپوزنگ کرنے میں بارہا میرے کام کی وجہ سے دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقالے کو حتمی صورت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

عاصمہ کبیر

پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	مطالعۂ ادب کا تانیثی منہاج	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	نذر سجاد حیدر اور معاصر خواتین قلم کاروں کے سماجی، معاشرتی اور فکری رویوں کا تجزیاتی مطالعہ	۷۴
۳۔	**باب سوم:**	
	نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے موضوعات کا تانیثی مطالعہ	۹۱
۴۔	**باب چہارم:**	
	نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے کرداروں کا تانیثی مطالعہ	۱۱۹
۵۔	**باب پنجم:**	
	معاصر خواتین ناول نگاروں سے نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تقابلی مطالعہ	۱۴۹
	ماحصل	۱۷۱
	کتابیات	۱۸۷

باب اوّل

مطالعۂ ادب کا تانیثی منہاج

تانیثیت کیا ہے؟

تانیثیت کی تفہیم کے لیے لفظ "عورت" کا ادراک حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ چوں کہ تانیثیت کا موضوع عورت ہے اس لیے اولاً یہ سمجھنا ضروری ہے عورت کیا ہے؟ زمین پر انسان کے دو طبقے ہیں مرد اور عورت ۔عورت کو انسان کا نسوانی روپ کہا گیا جو کئی سطحوں پر مرد سے مختلف ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "مرد اور عورت میں کئی سطحوں پر فرق ہے جس کا برقرار رہنا معاشرے کے ارتقا کے لیے اشد ضروری ہے۔"[1]

مرد اور عورت میں یہ فرق اختلاف جنس (Sex) اور صنف (Gender) کا ہے۔ جنس کا فرق فطری ہے جب کہ کسی گروہ کے اختیارات بڑھانے اور کسی کے کم کرنے کے لیے صنف کا فرق ہم خود مہیا کرتے ہیں۔ مثلاً شجاعت، جنگ جوئی، مہم جوئی، تفکر پسندی، قائدانہ کردار جیسی خصوصیات سے مردانہ طبقے کو نواز دیتے ہیں جب کہ کم زوری، کم عقلی، نازک دلی، رقیق القلبی، شرم وحیا، اور ضد وغیرہ عورتوں سے منسوب کر کے انہیں اہم صلاحیتوں سے سبک دوش کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں کہ "عورت اور مرد کے درمیان صنفی اختلافات کی بنیاد پر کسی طبقے کو کم تر یا بہتر نہیں قرار دیا جا سکتا۔"[2]

عورت کو تاریخ کا قدیم، متنازع، ناقابلِ فہم، الجھا ہوا موضوع کہا گیا جس کی وجہ تاریخ کے ہر عہد میں یہ رہی کہ عورت کو ہمیشہ تصورات کی عینک سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

> عورت کیا ہے؟ شاعروں کے دیوان، عالموں کی فصاحت، اہل زبان کی مہارت اور اہل نظر کے تصورات اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ عورت دنیا کا قدیم اختلافی موضوع ہے۔ بائبل کی حوّا اور یونانی مائتھالوجی کی پنڈورا سے آج تک متعدد تہذیبوں، مذاہب اور اقوام نے جنم لیا اور اپنے انجام کو پہنچیں لیکن ہر عہد میں مصلحین، مفکرین، مبلغین اور ناقدین نے عورت ذات پر لکھا، لیکن عورت ایک نہ سمجھ آنے والی حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت جسے ہمیشہ تصورات کی آنکھ سے دیکھا جاتا رہا۔[3]

کلاسیکی ادوار کے مبلغین و مفکرین کا تصورِ عورت:

تاریخ کے نامور مبلغین و مفکرین جب عورت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اسے تمام برائیوں کی جڑ اور قوموں کے زوال کی وجہ گردانتے ہیں۔ مشہور مورخ ٹوائن بی کے مطابق "انسان کے شجاعانہ دور میں تمام تباہیاں عورتوں کی وجہ سے آئیں۔"[4] ارسطو جیسا نامور مفکر و مدبر بھی عورت کو ایک غلام سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ ارسطو کے خیال

میں "نیکی ہر قسم کے لوگوں میں ہو سکتی ہے مثال کے طور پر ایک عورت یا غلام بھی نیک ہو سکتے ہیں۔ حالاں کہ عورت ایک کم تر درجہ کی چیز ہے اور غلام عام طور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" [۵] سقراط نے عورت کی وجۂ تخلیق محض جنسی لذت، بنی نوع آدم کی نسل کشی اور اس کی بقاء قرار دی۔" [۶] فادر ترلولیان عورت کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسے شیطان کا مدخل قرار دیتا ہے جو اسے بھی تباہ کر دیتا ہے جس پر شیطان براہِ راست حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔" [۷] تھیوسی ڈائیڈس عورت کی عظمت کا معیار مقرر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی عورت کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس کا تذکرہ مردوں میں کم سے کم ہو۔" [۸] ڈاکٹر گستاؤلی بان عورت کو موت سے بھی تلخ قرار دیتا ہے۔" [۹]

درج بالا نظریات عورت کے وجود کی مکمل نفی کرتے ہوئے اسے گناہ پھیلانے والی اور گناہ کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں عورت کو محض جنسی کھلونا یا مرد کے تابع ایک حقیر مخلوق گردانا گیا۔ عورت کو اچھائی اور برائی کے پیمانوں میں ماپنے والا مردپوری کلاسیکی تاریخ میں جابر آقا و مالک کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

مختلف مذاہب و تہذیب میں عورت

یونان میں عورت کی حیثیت:

یونانی قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ قانون، حقوق اور معاشرتی برتاؤ غرض یہ کہ ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت گری ہوئی تھی۔ یونانی خرافیات میں ایک خیالی عورت پانڈورا (Pandora) کو تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔ پانڈورا ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی خرابیاں دینے والا ہے۔ یونانی کہانی کے مطابق ایک دیوتا پرومی تھیس (Parometheus) نے آسمان سے آگ چُرائی اور اس کو زمین میں بسنے والے انسانوں تک پہنچا دیا۔ دیوتاؤں کے بادشاہ زیوس (Zeus) کو یہ بات ناگوار گزری۔ چناں چہ اُس نے زمینی مخلوق سے اس نعمت کو کالعدم کرنے کے لیے ایک عورت تخلیق کی جس کا نام پانڈورا رکھا۔ اس کے بعد اس نے اُس پہلی عورت کو زمین پر بھیج دیا۔ زمین پر موجود اس وقت ایک دیوتا پرومی تھیس آباد تھا جس نے پانڈورا کے حسن سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لی۔ اس پہلی عورت کے ساتھ ایک بکس (Box) تھا جس کو فرضی طور پر پانڈورا بکس کہا جاتا تھا۔ پانڈورا نے زمین پر قیام کے بعد ایک روز یہ بکس کھول دیا اس بکس کے اندر ہر قسم کی بُرائیاں بھری ہوئی تھیں اور بکس کے کھلتے ہی یہ تمام بُرائیاں زمین پر پھیل گئی اور اس کے بعد یہ برائیاں زمین سے ختم نہ ہو سکیں۔ [۱۰]

یونان میں عورت مرد کی غلام اور خدمت گزار تھی۔ یونانی عورتوں کو کم تر مخلوق سمجھتے تھے جس کا مصرف محض خانہ داری اور افزائش نسل تھا۔ عورت کی ازدواجی زندگی کا مقصد خالصتاً سیاسی تھا کہ وہ طاقت ور اولاد پیدا کرے

جو ملک کی حفاظت کے کام آئے۔ یونان کے شہر اسپارٹا میں تو عورت کی حالت یہ تھی کہ جس سے کسی قومی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی اُسے مار ڈالتے تھے۔ یونانی ملکی فوائد کی غرض سے عورت کو دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتہً لے لیتے تھے۔ اہل یونان اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن میں بجز طوائف کے کسی عورت کی قدر نہیں کرتے تھے۔ یونان میں طوائف کی حیثیت آزاد عورت کی تھی جو یونان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جان تھی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنی سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفر، شعرا، مؤرخین، اہلِ ادب اور ماہرینِ فنون غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی بل کہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے۔[11]

امیر علی لکھتے ہیں:

> یونانیوں کے ہاں عورت کی حیثیت لونڈی کی سی تھی جسے فروخت کیا جاتا اور دوسروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اسے ایک ایسے ناگزیر برائی سمجھا جاتا تھا جو امور خانہ داری اور بچوں کی پرورش کے لیے ضروری تھی۔[12]

یونانیوں کا عقیدہ تھا آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے۔ لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔ یونانی عورت کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کر دی جاتی۔ بعض دفعہ باپ مرتے وقت اپنی بیٹی کی کسی کے حق میں وصیت کر جاتا تو بیٹی کو وہ وصیت پوری کرنا پڑتی تھی۔ بھائی کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دی جاتی۔"[13]

عورتوں کو گھر سے باہر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ عورت کی تعلیم کے بارے میں خیال تھا کہ "عورت کو پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے سانپ کو زہر آلود کر دیا جائے، اسے مہمانوں کے سامنے آنے اور کسی کے آنے پر گھر کا دروازہ کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ نہ تو شوہر کے ساتھ کسی محفل میں جا سکتی تھی اور نہ ہی اسے بازار جا کر خریداری کرنے کی اجازت تھی۔"[14]

لیکی یونانی عورت کے سماجی مقام کے بارے میں کہتا ہے کہ "بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ پست تھا۔ اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہر کی، بیوگی میں اپنے فرزندوں کی۔۔۔"[15]

رومی نظام معاشرت اور عورت:

روم میں عورت ایک لونڈی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ جائیداد کی

طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اہلِ روم کے نزدیک عورت کی گواہی نا قابل قبول تھی۔ ان کے نزدیک عورت کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ نسل انسانی میں اضافہ کرے۔ اسے کسی عہدے کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روم والوں نے عورت کو کچھ آزادی تو دی مگر اسے تحفظ فراہم نہ کر سکے۔ خاندان کا سربراہ مرد ہوتا تھا جو خاندان کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یہاں تک کہ اگر وہ بیوی کو قتل بھی کر دے تو کوئی مقدمہ نہ بن سکتا تھا۔ بل کہ یہ اُس کا حق تصور کیا جاتا تھا۔ عورت بالکل مرد کے زیرِ اثر تھی۔ اس لیے پلوٹاک شوہر نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ بیوی کو اپنی نگرانی میں رکھے ورنہ بے کار کی عادتوں کا شکار ہو جائے گی۔ اسے ساتھ کھانا کھلائے ورنہ اکیلے میں بہت کھائے گی۔ شوہر کے دیوتاؤں کی عبادت کرے ورنہ توہمات میں مبتلا ہو جائے گی۔ پی۔ براؤن کے بقول "مشہور رومن شاعر جووئل (Juvenal) کی رائے میں روم جیسے بڑے شہر میں کوئی ایک عورت بھی اس قابل نہ تھی کہ اس سے شادی کی جا سکے۔"[۱۶]

ایرانی معاشرت اور عورت:

ایران کی اخلاقی حالت نہایت شرمناک تھی، عورت کا تقدس بُری طرح پامال کیا گیا باپ بیٹی بہن کا رشتہ انتہائی کریہہ تھا۔ مرد بیویوں کو طلاق دینے داشتائیں رکھنے کا مجاز تھا۔

مصری عورت:

مصر میں بھی عورت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اسے حقیر جان کر انسانیت کے تمام حقوق سے محروم رکھا گیا۔ مصری تہذیب میں مرد کی وفات پر اس کی تمام جائیداد اس کی بیوی کے رشتہ داروں کو منتقل ہو جاتی تھی۔ حکومت اور دولت حاصل کرنے کی خاطر فراعنہ اپنی بہنوں سے شادی کر لیتے تھے۔ مصری اپنی بیٹیوں کو بطور خراج دیتے۔ بیوی کی سماج میں اتنی حیثیت تھی کہ وہ بچے پیدا کرے۔ اگر کام کرنے والی ہو تو اسے بُرا بھلا نہ کہا جائے اگر سُست ہو تو اسے سزا دی جائے۔ فدا حسین ملک کے بقول "مصر اور یورپی ممالک میں عورتوں سے جو سلوک کیا جاتا تھا وہ غلاموں سے بھی بدتر تھا۔"[۱۷]

عورت یہود کے نزدیک:

یہود کی کتاب مقدس میں عورت کو موت سے بھی تلخ کہا گیا۔ یہودی معاشرے میں عورت کی حیثیت گھر کے اثاثے کی مانند تھی باپ کو اپنی بیٹی بیچ دینے کا اختیار حاصل تھا۔ بیل، گدھے، غلام کی طرح عورت کو بھی ورثے میں منتقل کیا جاتا تھا۔ بیٹی کی پیدائش پر سوگ منایا جاتا۔ دوسری طرف مرد کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اپنی

جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے جتنی چاہے بیویاں اور لونڈیاں رکھ سکتا تھا۔ خاوند عورت کے لیے آقا و خدا کی درجہ رکھتا
تھا۔

یہودیت میں عورت کی خواہشات اور عزت نفس کو اہمیت نہ تھی۔ اگر کسی عورت کا شوہر بے اولاد فوت ہو جائے تو یہودیت میں یہ اصول تھا کہ اس بیوہ عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے نہ کیا جائے بل کہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کریں تو یوں جو بچہ پیدا ہو گا وہ متوفی بھائی کے نام منسوب ہو گا۔ مختصراً یہودیت میں عورت کو جنس ناروا سمجھ کر اس سے کم تر درجے کا سلوک کیا جاتا تھا۔

مسیحیت میں تصورِ عورت:

دین عیسوی میں ابتداً تو عورت کا مقام بلند تھا جس کا اندازہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اولین اعلان "اور والدہ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا اور اس (اللہ) نے مجھے سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا۔"[۱۸] سے واضح ہوتا ہے دین عیسوی میں باوقار مقام عورت کو دینا مقصود تھا۔ بعد میں کلیسا نے عورت کی حیثیت کو یہاں تک گرایا کہ ۵۸۱ء میں آئمہ کلیسا کی مجلس منعقدہ کولون اس بات پر زور دار بحث ہوئی کہ عورت انسان بھی ہے یا نہیں۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد اسے معمولی اکثریت کے ساتھ انسان تسلیم کیا کیا۔ انسان تو اسے مانا گیا لیکن اس کا اندازہ دین عیسوی کے پیروکاروں کے رویے سے لگایا جا سکتا ہے۔ عیسائی، عورت کو نجاست کی پوٹ، سانپ کی نسل، منبع شر، بُرائی کی جڑ، جہنم کا دروازہ خیال کرتے تھے یہاں تک کے بڑے بڑے راہب اپنی ماں تک سے ملنا اور اس کے چہرے پر نظر ڈالنا مصیبت سمجھتے تھے۔[۱۹] موسوی شریعت کے یشوع بن سیراخ کا کہنا تھا کہ "تمام بدی عورت کی بدی کے مقابلے میں خفیف ہے۔ عورت ہی سے گناہ شروع ہوا اور اسی کے سبب سے ہم مرتے ہیں۔"[۲۰]

عیسوی شریعت کو پھیلانے والے "پولوس رسول" نے عہد نامہ جدید میں (تیموتاؤس) کے نام اپنے پہلے خط میں لکھا:

> اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت تعلیم دے یا مرد پہ حکم چلائے کہ بل کہ خاموشی کے ساتھ رہے کیوں کہ آدم پہلے بنایا گیا۔ اس کے بعد حوا اور آدم نے فریب نہیں کھایا مگر عورت فریب کھا کر گناہ میں پھنس گئی۔[۲۱]

عورت اور ہندومت:

ہندو مذہب اور تہذیب بھی قدیم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دوسری تہذیبوں کی طرح ہندوستان میں ابتدائی دور میں مادرانہ نظام رائج تھا۔ ہندوستانی تہذیب کو عام طور پر ویدک عہد سے شروع کیا جاتا ہے لیکن آثار ِ قدیمہ کی دریافت نے ثابت کیا کہ آریاو ٔں کی آمد سے قبل یہاں دراوڑی قوم آباد تھی جو مادرانہ نظام کی حامل تھی۔ اس میں عورت کی حیثیت بڑی اور افضل تھی۔ یہی وجہ ہے عورتوں کی نسبت سے دیویوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> عورتوں کے سلسلہ میں اس دور میں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ دیویاں دیوتاؤں کے مقابلہ میں زیادہ اہم نہیں۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ معاشرے میں عورتوں کو اعلیٰ مقام حاصل تھا یا تو عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی یا پھر دونوں کو مساوی مقام حاصل تھا کیوں کہ اس وقت تک شادی کے بعد عورت اپنی رہائش تبدیل نہیں کرتی تھی اور جائیداد و وراثت میں اس کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ [۲۲]

مادری نظام میں دھرتی کو ماں کا درجہ حاصل تھا۔ ہندو مت میں پراکرتی وہ مقدس دیوی تھی جو دنیا کی تخلیق کار تھی جس بنا پر اسے شکتی دیوی بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں شرمت دور کو عورت کی سربراہی کا دور کہا گیا جس طرح بابل کی قدیم تہذیب میں عورت نے جادو اور توہمات کو فروغ دیا اسی طرح ہندوستان میں بھی عورت نے مردانہ تسلط سے حفاظت کے لیے تنترازم کو فروغ دیا۔ تنترمائیتھالوجی نے دیویاں تخلیق کیں۔ اسی لیے تنترازم میں عورت تقدس کا درجہ رکھتی تھی اور تخلیق کا سرچشمہ بھی۔ [۲۳]

ہندوستان میں مادرانہ نظام اچانک یا ایک دم ختم نہیں ہوا۔ آریاو ٔں کے تسلط کے ساتھ سے زوال آیا۔ آریاؤں نے مہابھارت جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد دراوڑ عورتوں کو قیدی بنا کر ان سے شادیاں کر لیں۔ اب ایک نئی تہذیب نے جنم لیا اور یوں دراوڑی معاشرے کی روایات کم زور ہونے لگیں۔ یوں دیویاں تو باقی رہ گئیں مگر عورت اپنے سماجی مقام و مرتبے سے گرنے لگی اور مردوں کا اقتدار بڑھتا چلا گیا۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

> عورت راج میں مردوں کی بالادستی ختم کرنے کے لیے دیویوں کے چرنوں میں لڑکوں کی قربانی دی جاتی تھی اور عورتوں کی مخصوص عبادت گاہوں اور طلسم کدوں میں مردوں کو خصی ہو کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ عورت راج میں عورت کی قربانی منع تھی نتیجتاً جب مرد اقتدار میں آئے تو انھوں نے کم سن لڑکیوں سے شادی اور ستی کو رواج دے کر بدلا چکایا اور مندروں میں دیوداسی نظام کو پروان چڑھایا۔ [۲۴]

اب عورت زندگی کے ہر مرحلے میں مردوں کی محکوم تھی۔ عورت صفر سنی میں باپ کی مطیع، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی، اگر شوہر نہ ہو تو اپنے اقربا کی کیوں کہ عورت ہر گز اس لائق نہیں کہ خود مختار طور پر زندگی بسر کرے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب منو سمرتی میں ہے کہ "عورت نابالغ ہو یا جوان یا بوڑھی گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے۔" [۲۵]

آریاؤں کے تسلط کے نتیجے میں دیویاں تو باقی رہ گئیں مگر عورتوں کی حیثیت کم تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں رگ وید اور منوسمرتی میں عورتوں کی حالت کے بارے میں تضاد ملتا ہے۔

> ویدک عہد کے ابتدا میں عورتیں تعلیم کے حوالے سے مردوں کے برابر تھیں، فلسفہ اور شاعری میں ماہر ہوا کرتی تھیں۔ مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے کسی قسم کی قید و بند کا شکار نہیں تھیں۔ ویدوں کے ابتدائی دور میں ''سوئمبر'' کی رسم میں اپنا اپنا شوہر منتخب کرنے میں آزاد تھیں۔ اس مقام و مرتبے کو پا لینے کے بعد ویدک دور میں ہی اس کی سماجی حیثیت کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ اب عورت پر نہ صرف تعلیم کے دروازے بند ہو گئے بل کہ اس کو وید تک پڑھنے سے روک دیا گیا۔ عبادت پر مردوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی مہابھارت میں عورت کو تمام خرابیوں اور بُرائیوں کی جڑ کہا گیا اور کہا گیا کہ عورت سے زیادہ گناہ گار دنیا میں کوئی چیز نہیں جب کہ جتنی دیویوں کا ذکر ہندو دھرم میں ملتا ہے۔ کسی اور مذہب میں نہیں۔ [۲۶]

کہا جا سکتا ہے ہندوستان میں آریاؤں سے قبل عورت برتر ہستی تھی۔ وہ کئی شوہر رکھنے کی مجاز تھی اور اسے بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شادی کے بعد شوہر بیوی کے گھر جاتا تھا اور بیوی اپنے گھر میں رہتی تھی مگر برہمن سماج میں عورت کا سماجی مقام گرانے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔ بیوہ کی شادی قطعی طور پر منع کر دی گئی۔ ستی ایک قابلِ تعریف رسم بن گئی اس کے لیے لکھنا پڑھنا غیر ضروری قرار دیا گیا اور اس کی زندگی کا مقصد شوہر کی خدمت قرار دیا گیا اور اسے وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ بیوہ عورت کو اپنے شوہر کی جائیداد سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ عورت کو بطور تحفہ دینے کا رواج بھی پروان چڑھا۔ الغرض ہندو دھرم اور تہذیب میں عورت کو اگر ایک طرف دیوی سمجھ کر پوجا گیا تو دوسری طرف پاؤں کی جوتی جان کر دھتکارا بھی گیا۔

قدیم ہندوستان میں عورت کا ایک اور تصور بدھ دھرم بھی پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طرف عورت کو بطور بیوی بے وفا، چلتر، خود غرض، شوہر کی حاکم کے طور پر پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف شرم و پریم کا مجسمہ، دکھ درد کی ساتھی، شوہر پر جان قربان کی دینے والی نظر آتی ہے۔

بدھ دھرم کا عورت کے حوالے سے اول الذکر تصور اس کو طرح طرح کے الزام دے کر اس سے نفرت دلاتا ہے جب کہ ثانی الذکر تصور میں بھی عورت کی مدح سرائی کے برعکس محکومی کا احساس نمایاں ہے جس میں شرم، وفا، پریم، ایثار، صبر جیسی صفات عورت سے مختص کر کے مرد مرکز معاشرے نے خود کو اس سے بری الذمہ کر لیا ہے۔

سومیری تہذیب اور عورت:

سومیری تہذیب نے تو عصمت فروشی کو تقدس کا درجہ دے کر عورت کو ذلت کے جس گھٹا ٹوپ اندھیرے

میں دھکیل دیا تھا۔ اس کا اندازہ ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> اس دور کے عراق اور سمیر میں دھرتی دیویوں کے معبدوں میں سینکڑوں دیو داسیاں رکھی جانے لگیں جن سے یاتری بلا تکلف مستفید ہوتے تھے۔ دیو داسیاں اپنی دیوی کے نام پر ان یاتریوں سے چاندی کے جو سکے وصول کرتی تھیں وہ پروہتوں کی جیب میں جاتے تھے اور پروہت خود بھی ان سے آزادانہ فیض یاب ہوتے تھے۔ [۲۷]

سومیریوں کے نزدیک طوائف ہونا بھی کوئی بری بات نہ تھی۔ عصمت فروشی نے ان کے ہاں تقدس کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کے مندروں میں نہ صرف دیو داسیاں (پجارنیں) بل کہ طوائفوں کی بڑی تعداد بھی رہتی تھی۔ ان کے ہاں بیوی کا تصور اعلیٰ تھا۔ گھریلو عورت کے بارے میں بھی لطیف تصور موجود تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ عورت کی بدچلنی زیادہ بُری سمجھی جانے لگی اور مرد کے مقابلے میں اسے زیادہ سخت سزا دی جاتی۔ اس کو قتل کر دیا جاتا اور مرد کو چھوڑ دیا جاتا۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ہاں عورت کی عزت یا اس کی کوئی اہمیت نہ تھی بل کہ حرف عورت کے شوہر یا وارث کی عزت پر آتا تھا۔

اسلام میں عورت کا مقام:

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب اور مذہب نے عورت کو وہ مقام و مرتبہ دیا جو نہ صرف باقی مذاہب اور تہذیب و تمدن کے مقابلے میں مثالی تھا بل کہ موجودہ دور بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عورت کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے حقوق و فرائض اور حیثیت متعین کی۔ اسلام نے معاشرت کے باب میں صنفِ مقابل مرد کو خصوصی طور پر مخاطب کر کے صنفِ لطیف کے بارے میں سورۃ النساء میں اس کے ساتھ معاشرے میں معروف کا حکم دیا۔

اور ان عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کے ساتھ زندگی گزارو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے
کہ تم کوئی چیز ناپسند کرو اور اللہ اس میں خیر کثیر رکھ دے۔[۲۸]

قرآن مجید نے صرف معاشرت میں ہی معروف سے کام لازمی قرار نہیں دیا بل کہ ہر طرح کے معروف سے کام لینا مردوں پر فرض الٰہی ہے۔

ترجمہ:

ایذا دہی کے خیال سے ان کو نہ روک رکھو تا کہ تم زیادتی کرو۔[۲۹]

یعنی شریعت اسلامیہ کے مزاج کی رو سے مرد کا بیوی کو تکلیف پہنچانا اس کے ساتھ ظلم کرنا بے اعتنائی کرنا ان کو ان کے حق سے روکنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

ازواجی معاملہ میں عورتوں کی رائے کا مقام:

جس طرح دینی حدود کے اندر تمام دینی اور دنیاوی معاملہ میں عورت کو مرد کی طرح آزادی حاصل ہے اس طرح دینی حدود کے اندر اپنی ذات کے متعلق شادی کے معاملہ میں بھی عاقل بالغ عورت کو مرد کی طرح آزادی حاصل ہے۔ یعنی شرعاً اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے کرے۔ اگر کوئی اس کی مرضی کے خلاف کسی مرد سے اس کا نکاح کر دے گا۔ تو شرعاً اس کو اختیار حاصل ہے کہ اس نکاح کو رد کر دے رسول اللہ کا ارشاد پاک ہے۔

بے شوہر والی بالغہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنی ذات پر حق رکھتی ہے۔[۳۰]

ازواجی رشتہ کے قیام کی طرح بقا رشتہ میں آزادی:

شریعت نے جس طرح ازواجی زندگی کے رشتہ کے قیام میں عورت کو آزادی دی ہے اور مجبور نہیں کیا ہے۔ اسی طرح شریعت نے ازواجی رشتہ کے قائم ہو جانے کے بعد اس کو مجبور نہیں کیا ہے کہ وہ مظلومیت کی زندگی گزارے اور ظالم شوہر کے مظالم اور بے توجہی کا اپنے کو شکار بنا کے رہے۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق مالکانہ:

ہر طرح کے عقود مالیہ میں جس طرح مرد کو اسلام نے آزادی بخشی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو بھی اس طرح کی آزادی بخشی ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات خرید و فروخت میں ہبہ اور صدقہ میں مردوں کی طرح آزاد ہیں۔ ان کو اپنے تمام اموال میں ملکیت اور قبض و تصرف کے پورے حقوق حاصل ہیں۔ جن میں نہ شوہر مداخلت کر سکتا

ہے۔ نہ ماں باپ اور نہ کوئی عزیز و اقارب دخل دے سکتا ہے۔ عہد رسالت میں ہر عورت اپنی مالکانہ حیثیت کو سمجھتی تھی اور بذاتِ خود اپنے مال میں ہر طرح کا تصرف کرتی تھی شوہر یا اس کے اقارب و عزیز اس میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

اسلام میں عورت کا سیاسی مقام:

عہد رسالت میں عورتیں سیاسی کاموں میں حصہ لیتی تھیں اور ان کو سیاسی اختیارات حاصل تھے۔ وہ دشمنانِ اسلام کافروں کو پناہ دیتی تھیں اور سرکار رسالت ان کی پناہ کو برقرار رکھتے تھے وہ سیاسی امور میں مشورہ دیتی تھیں اور ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ وہ سیاسی مجرمین کے قتل و عفو کے بارے میں رسول اللہ سے اپنی رائے کا اظہار کرتی تھیں۔ جہاد میں شرکت کرتی تھیں اور پورے جوش و خروش سے حصہ لیتی تھیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ شہدا کو پانی پلاتی تھیں شہدا کو میدان جنگ سے اٹھا کر مدینہ منورہ پہنچاتی ہیں۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ام سلیطؓ بھی جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی والدہ تھیں۔ غزوہ احد میں پانی مشک میں بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں۔

اسلام میں عورتوں کا دینی مقام:

دین ایمان اور عمل صالح کا نام ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے قرآن مجید میں اس کا واضح طور پر اعلان ہے کہ عورت ہو یا مرد ایمان کے ساتھ جو بھی عمل صالح کرے گا ہم اس کو دنیا میں بھی اچھی پاکیزہ زندگی کی نوازش دے گے اور آخرت میں بھی اس کو اجر دیں گے جس کا جتنا عمل ہو گا اسی کے مطابق اس کو اجر ملے گا۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

کسی عمل کو کرنے والے کے عمل کو میں ضائع نہیں کروں گا چاہے مرد ہو یا عورت۔[۳۱]

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں ایمان و عمل صالح کے اعتبار س مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلام میں عورت کی تعلیم و تربیت:

اسلام چوں کہ وحدت و مساوات کا داعی ہے اس لیے تعلیم کے بارے میں عہد رسالت میں رسول اللہ کے وعظ ورُشد اور تعلیم و تفہیم سے صحابہ کرام کی طرح صحابیات بھی فائدہ اٹھاتی تھیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق دینی مسائل میں ان کی خصوصی جگہ تھی۔ چناں چہ جس طرح صحابہ کرام میں صاحب افتا دبزرگ تھے اس طرح صحابیات میں بھی صاحب افتاد خواتین تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے متعلق امام زہری کی روایت ہے

کہ "حضرت عائشہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ علم رکھتی تھی ان سے بڑے بڑے صحابہ (مسائل) پوچھا کرتے تھے۔"[۳۲]

اسلام میں عورتوں کا عزت نفس کی حیثیت سے مقام:

عہد جاہلیت میں چوں کہ عورتوں کی کوئی عزت مردوں کی نگاہ میں نہ تھی وہ معمولی معمولی بات پر بگڑ جاتے تھے اور جو جی میں آتا کر گزرتے تھے اور معمولی سی غلطی پر بھی وہ غصہ اتارنے میں بے باک ہو جاتے تھے۔ ان کی اسی نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی۔

> کوئی مومن کسی مومنہ عورت کو غضب کا نشانہ نہ بنائے اس لیے کہ اگر کوئی عادت اس میں ناگوار خاطر ہے تو اس میں بہت سی عادتیں پسندیدہ ہوں گی۔[۳۳]

اسی کی طرف قرآن مجید میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

> اگر تم ان کی فروگزاشتوں کو معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ غفور الرحیم ہے۔[۳۴]

جامع صفیر میں یہ روایت ہے:

> شریف النفس انسان عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔ اور ادنی الطبع انسان عورتوں کے ساتھ کمینہ برتاؤ کرتے ہیں۔[۳۵]

اسلام میں عورتوں کی آبرو اور عفت و عصمت اتنی بڑی قیمتی چیز ہے کہ اس کے مجرمین کے لیے حد جاری کی گئی اور ثبوت جرم کے بعد کسی طرح کی کوئی معافی کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ جنس لطیف کو یہ حقوق اسلام نے اس وقت دیئے جب ہندو، یونانی، رومی اقوام اور حال کے کل "قوانین" نے عورت کو لونڈی و غلام اور ادنی خادمہ سے زیادہ حیثیت نہ دی تھی۔ اسلام نے عورت کی آزادانہ اور مستقل ہستی تسلیم کی ہے اور انھیں معاشرے میں عزت و احترام کا وہی درجہ دیا ہے جو مرد کو۔ اسلام اسے آزادانہ شہری کے تمام حقوق دیتا ہے جو ایک آزاد فرد کی حیثیت سے اس کا حق ہے۔ جائیداد میں اس کا حق ہے، اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جاسکتی۔ شادی کے بعد وہ نان نفقہ اور حق مہر کی حق دار ہے۔ اسے شوہر سے علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت ہے۔ لڑکی کی پیدائش کو باعث رحمت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے ایک طرف عورت کو شرفِ انسانیت سے آراستہ کیا اور حقوق سے نوازا تو دوسری طرف اس کے اخلاق و کردار کا تحفظ بھی کیا۔ اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق ذمہ داریاں سونپیں اور عورت کے ہر روپ کے

لیے احترام پیدا کیا۔ اس کے تمام مسائل حل کیے، اسے فوز و فلاح کی منزل سے ہم کنار کیا۔ اسلام نے سب سے پہلے عورت کا احترام گردانا، اسے ذلت و رسوائی کی دلدل سے نکال کر عزت کے تخت پر بٹھایا۔ عورت کو ماں، بہن، بیٹی، بیوی کی حیثیت سے بلند مقام دیا، اس کے حقوق کا تعین اور تحفظ کیا۔ اس کے متعلق خالقِ کائنات نے فطرت میں اس کی نشان دہی یہ فرمائی "عورتیں ان کی محبت لوگوں کے لیے خوش آئند بنائی گئی۔"[۳۶]

عورتیں اپنے صنفِ مقابل کے مقابلہ میں خوش آئندہ اور محبوب بنائی گئی اور یہ خصوصی شرف جس کی بناء پر اپنے مقابل ہونے والے صنفی مقابلہ کے میدان میں مردمات کھا جاتا ہے۔ اس طور پر عورتوں کو بہ حیثیت عورت مردوں میں اتنا اونچا مقام دیا گیا ہے کہ اگر عورت کو اور کچھ نہ دیا جاتا اور صرف یہی دولت اور نعمت اس کے حصہ میں آتی تو اس کا بدل صنفی حیثیت میں مردوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کے ساتھ اس کو محبوبیت اور خوش آئندگی بھی دی گئی لیکن ان شان دار قوانین اور حقوق کے باوجود بھی رسول پاک ﷺ کے بعد کے آنے والے معاشروں میں عورت کا درجہ بلند نہیں ہو سکا اور گزرتی ساعتوں کے ساتھ ساتھ یہ حقوق بھی گردش حالات تلے دبتے چلے گئے۔

آج بھی قانون اور شریعت کی رو سے مسلمان عورت اپنے حقوق و مقام کے حوالے سے مغربی عورت سے ممتاز ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے تو عورت کو بہت حقوق دیے ہیں مگر اہلِ اسلام نے انھیں سلب کر رکھا ہے اگر مسلمان عورت کو معاشرے میں واقعی وہ مقام مل جائے جس کا وہ استحقاق رکھتی ہے تو مسلمان ممالک کے معاشرتی نظام میں ایک بڑا انقلاب رونما ہو سکتا ہے لیکن بد قسمتی سے مسلمان معاشرے عورت کے معاملے میں دو غلے پن اور منافقت کا شکار ہیں۔[۳۷]

دوسری طرف دیگر مختلف مذاہب اور تہذیبیں عورت کے جس روپ کو پیش کرتی ہیں۔ اس میں عورت یا تو داشتہ ہے۔ گناہوں و برائیوں کا پنڈورا باکس یا ستی ساوتری۔ ڈاکٹر مبارک علی کے بقول "تاریخ میں عورت جس مشکل میں ظاہر ہوتی ہے اس میں کوئی عظمت، عزت و وقار نہیں۔ بل کہ یہ ایک ایسا امیج ہے کہ جس سے کبھی نفرت ہوتی ہے اور کبھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔"[۳۸]

تاریخ نے ہر مقام و موقع پر عورت کے وجود کو جھٹلایا۔ سلطنت مغلیہ کے نظام میں در آنے والی خرابیوں کی وجہ ایک عورت (ملکہ جہاں گیر نور جہاں) کی حکومت کو قرار دیا گیا۔ مورخ کی اس الزام تراشی کا نشانہ نہ صرف مشرقی بل کہ مغربی عورت بھی بنی۔ متحدہ جرمنی کے پہلے چانسلر نے جرمنی کی فرانس سے انتہائی اہم جنگ کو رکوانے کا الزام پروشیا ملکہ پر لگاتے ہوئے لکھا۔

وہ تہتر سال کا بوڑھا ہے اور امن پسند ہے اس کو کوئی خواہش نہیں کہ وہ ۱۸۶۶ء والی عظمت کو ایک نئ

جنگ کے ذریعے حاصل کرے۔ اگر وہ نسوانی اثرات سے آزاد ہوتا تو اس کو احساس ہوتا کہ وہ
فریڈرک اعظم اور بروشیا کے عظیم ہیروز کا جانشین ہے۔ [۳۹]

یہاں کو تاہ نظر یہ ادراک حاصل نہ کر سکی کہ محض جنگوں میں بے مثال بہادری کے جوہر دکھلانا ہی کامیابی کی دلیل نہیں بل کہ لاکھوں انسانی جانوں کو تلف ہونے سے بچانا بھی ایک عورت کی فتح عظیم ہے۔ ہمارے مور ٔخ نے ماں کے روپ میں عورت کو مقدس ہستی بنا کر تو ضرور پیش کیا مگر یہاں بھی اس کے وجود کی شناخت اس کا لڑکا بنا۔ عظیم

بیٹے کو جنم دینے کے بعد اس کا وجود تاریخ کے صفحات میں گم ہو جاتا ہے۔

اس تناظر نے عورت کو سوچنے پر مجبور کیا کہ کیا اس کی اپنی کوئی ذات نہیں ؟ اگر وہ واقعی انسان ہے تو کوئی انسان، عمل ردّ عمل، سوچ، فکر، جذبات و احساسات، تاثرات سے کیسے عاری ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں اس کے وجود کو بطور کٹھ پتلی پیش کر کے اتنی طویل انسانی تاریخ کی تشکیل میں اس کے وجود کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔ عورت کے اسی شعور ذات کو تانیثیت یا فیمینزم (Feminism) کا نام دیا گیا۔

تانیثیت کا مفہوم:

تانیثیت جس کے لیے انگریزی میں فیمینزم (Feminism) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی لفظ تانیث کا اسم کیفیت ہے۔

فرہنگِ آصفیہ میں تانیث کے لغوی معنی ہیں۔

تانیث: اسم مونث تذکیر کا نقیض۔ مونث ہونا، ضد نر، مادہ مادین [۴۰]

فیروز اللغات میں اس کے معنی ہیں۔

تانیث: (ع۔ مونث) مونث کرنا، مونث بنانا [۴۱]

نور اللغات میں تانیث کے معنی اس طرح ہیں۔

تانیث: مونث بنانا۔ مونث کرنا۔ مونث۔ عورت۔ مونث تذکیر کی نقیض مونث کی علامت لگانا۔ [۴۲]

جامع اللغات میں تانیث کا مفہوم ہے۔

تانیث: (ع) مونث ہونا۔ مونث کی علامت، انث مادہ ہونا [۴۳]

لغوی معنی و مفہوم سے ہٹ کر اصطلاحی لحاظ سے دیکھا جائے تانیثیت (Feminism) سے مراد خواتین

کے حقوق کے لیے جہد وجہد کرنا، اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا۔ بطور انسان اپنے وجود کو منوانا تانیثیت ہے۔ بقول انیس ہارون:

خواتین پر ظلم وزیارتی کے خلاف آواز اٹھانا ان کے حقوق کی بات کرنا فیمینزم ہے۔ [۴۴]

تانیثیت عورتوں کی اس ذہنی بیداری کا نام ہے جس کی تفہیم نے عورت کو احساس دلایا کہ وہ ایک شے یا مال نہیں جسے تحفے تحائف میں، قبیلوں کی لڑائیوں میں بطور تاوان پیش کیا جائے، اثاث البیت کی طرح وراثت میں منتقل کیا جائے۔ بل کہ وہ ایک مکمل انسانی وجود کی مالک ہے جس کے کچھ حقوق واوصاف ہیں جو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، نفسیاتی ہر سطح پر اپنی ذات کا شعور رکھتی ہے۔ اسی بیداری شعور کا نتیجہ خواتین کا استفہامیہ انداز ہے۔ اگر ایک مرد کے لیے اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے شوہر اور باپ ہونا لازمی نہیں تو عورت تکمیل ذات کے لیے مرد کی مرہون منت کیوں؟ جیسے جیسے یہ شعور بیدار ہوتا گیا ایک تحریک کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ جسے بیداری نسواں، حقوق نسواں، آزادئ نسواں، تعلیم نسواں، تحریک نسواں کے نام دیے گئے۔

تانیثیت (Feminism) کا ترجمہ کچھ لوگوں نے نسائیت بھی کیا ہے۔ نسائیت وہ ہے جو مردانگی نہیں، یہ لفظ محض عورت کے حقوق واوصاف تک محدود ہے۔ اس لیے نسائیت کی بجائے تانیثیت کا لفظ مستعمل ہے جو اپنے دامن میں لامحدود معنی سمیٹے ہوئے ہے۔

ممتاز نقاد شمس الرحمان فاروقی جب نسائی تنقید کی ضرورت واہمیت پر زور دیتے ہیں تو تانیثیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ تانیثیت کے لیے انگریزی میں "فیمینزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کی لغوی وضاحت آکسفورڈ ڈکشنری میں یوں کی جاتی ہے۔

The Advocacy of Woman's on the ground of equality of the sexes.

45

انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا کے مطابق:

The beleif in the social, economic and political equality of sexes. [46]

Merrian-Webster's Collegiate ڈکشنری کے مطابق:

i. The Theory of the Political, Economic and Social equality of the sexes.

ii. Organized Activity on behalf of woman's rights and interests. [47]

فیمینزم نے مختلف ممالک کی ضرورت، مزاج اور معاشرے کے مطابق شکل اختیار کی۔ جنوبی ایشیا کے پس منظر میں دیکھیں تو پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، اور سری لنکا کی خواتین نے اپنی مختلف ورکشاپس میں فیمینزم کی تعریفیں اس طرح کی ہیں۔

Feminism is an awareness of woman's oppression and exploitation in society, at the place of work, within the family and conscious action to change this situation.

فیمینزم اس احساس کا کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور اس کا استحصال کیا جارہا ہے اور اس صورت حال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔ [۴۸]

Feminism is an awareness of patriarchal control, exploitation and oppression at the material and idelogical level of woman's labour, fertility and sexuality, in the family, at the place of work and in society in general and conscious action by woman and men transform the present situation.

فیمینزم نام ہے اس احساس کا کہ معاشرے میں پدری نظام مسلط ہے اور مادی اور نظریاتی سطح پر عورت کی محنت ، حیثیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا خاندان میں اور کام کرنے کی جگہ پر غرض پورے معاشرے میں استحصال کیا جاتا ہے اور اسے کچلا جاتا ہے، اور وہ تمام مرد اور عورتیں جو اس حالت کو بدلنا چاہتے ہیں فیمینسٹ ہیں۔" [۴۹]

اس تانیثی رویے نے عورت کو جو شعور دان کیا اس نے عورت کو سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیوں اس کی ذات ہر جگہ مرد کے حوالے سے پہچانی گئی۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی، داشتہ ویشیا، رنڈی، کھیل، ہر رشتہ مرد کے ساتھ تعلق کا غماز ہے۔ مرد ہی تقدس عطا کر رہا ہے اور مرد ہی حقیر القابات سے نواز رہا ہے۔ اس حقیقت کے ضمن میں میری ایئے فرگوسن نے کہا ہے کہ " مرد کو تو پوری دنیا، فطرت، سماج، حتیٰ کہ خدا کے ساتھ رشتے کی رو سے پیش کیا گیا ہے، مگر عورت کا تصور مرد کے ساتھ تعلق کی رو سے کیا گیا ہے۔" [۵۰]

عورت کے ساتھ استحصالی سلوک اور فرسودہ ذہنی رویے پدر شاہی نظام کے پیدا کردہ تھے۔

> پدر شاہی نظام مردوں کی معاشرتی بالا دستی کو کہتے ہیں جس کی بنیاد سماج، خاندان، سیاست، معیشت اور مذہب پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ اس پورے نظام کی تاریخ ہے جس کی جڑیں مختلف سماجوں، مروجہ رسوم وروایات اور مختلف ادوار تک پھیلی ہوئی ہے۔ سترھویں صدی کے زمینی حقائق کچھ اور

تھے۔ اس کے بعد آنے والی صدیوں کے مختلف اور اکیسویں صدی کے اپنے خیالات ہیں۔ جس نے عورتوں کی جدوجہد کو مختلف سانچوں میں ڈھالا ہے۔ [۵۱]

قدیم تاریخ کی بازیافت سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مرد مرکز معاشرہ ہمیشہ سے قائم نہ تھا۔ بل کہ اس پدرشاہی نظام سے کئی ہزار برس پہلے مادری نظام رائج تھا جس میں عورت ہی ہر نظام کی کرتا دھرتا تھی۔ مرد صرف شکار کرتا تھا یا گلہ بانی، عورت ماں، دیوی، آپس کے جھگڑے چکانے والی، مرد کے شکار کا حصہ لگانے والی، اپنے لیے مرد کا انتخاب کرنے، اس سے تعلق رکھنے، بچوں کو جنم دینے، ان کی پرورش کرنے، خوراک کا ذخیرہ کرنے، سالوں سے لباس بنانے، غرض کہ ہر شعبہ زندگی پر حاوی ایک حاکم کا درجہ رکھتی تھی۔ نسب اس سے چلتا تھا۔ اولاد اور مال اس کی ملکیت تھے۔ اسی دور میں مرد نے اس کے ساتھ زراعت میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ زرعی نظام میں در آنے والی منافع بخش تبدیلیاں مرد کے لیے باعث کشش بنی جس کی بناء پر معاش کا یہ مضبوط ترین شعبہ ایک طویل ترین مدت کے بعد عورت کی بالادستی سے نکل کر مرد کے دائرہ اختیار میں چلا گیا۔ ول دیوراں لکھتے ہیں:

> عورتوں کے سدھائے ہوئے جانور جب کھیتوں میں کام کرنے لگے اور وہ عورتوں کا نعم البدل ثابت ہوئے۔ جو اب تک خود کھیتوں میں کام کرتی تھیں تو مردوں نے انھیں بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور وہ زراعت کے تمام امور پر قابض ہو گئے۔ کدال سے ہل کی طرف ترقی سے جسمانی قوت (کے استعمال) میں اضافہ ہوا، اور مرد اس قابل ہو گیا کہ اپنی قوت کا دعوی کر سکے۔ اس کے بعد مویشیوں اور زمینی پیداوار کو اس نے اپنی ملکیت ٹھہرایا۔ [۵۲]

ملکیت کا اصول بدلنے سے عورت اپنے مقام و مرتبے سے گرنا شروع ہو گئی۔ اب دیوی سے داسی کا سفر شروع ہوا جس کا کام محض بچے پیدا کرنا اور ان کی پرورش تک محدود رہ گیا۔ یہ مردانہ اجارہ داری عورت کو پیچھے دھکیل کر پیداوار کے تمام ذرائع پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ بقول فریڈرک اینگلس کے بقول "سماجی پیداوار کے دائرہ سے الگ کر دیے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی۔" [۵۳]

صدیوں کی اس پامالی کے بعد اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے ہوئے تانیثیت نے جہاں اور بہتیرے سوال کیے وہاں دو نئے سوال بھی ابھر کر سامنے آئے۔ کیا انسان کی اتنی لمبی تاریخ میں تاریخ و ثقافت کی تشکیل میں عورت کو کوئی حصہ نہیں؟ انسانی مفکروں کے نزدیک تاریخ نے عورت کو مساوی کردار کے اہل نہیں سمجھا اس کی تخلیقیت کو محسوسات سے عبارت قرار دیا۔ جس کی وجہ سے اسے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، فکری، روحانی مسائل سے الگ کر کے اس کی فکر کو مرد تک محدود کر دیا۔ ایسے میں اس کا اظہار محسوساتی و جذباتی ہو گیا۔

تانیثیت نے عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہوئے ایک دوسرا سوال یہ اٹھایا کہ تاریخ نے عورت کے مکمل انسانی وجود کا اثبات نہیں کیا۔ بل کہ شجاعت، جنگ جوئی، مہم جوئی، تفکر پسندی، قائدانہ کردار ادا کرنے کی لگن کو مردوں سے منسوب کرتے ہوئے مردانگی کو زندگی کی اہم قدر قراد دیتے ہوئے عورت کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ تانیثیت نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے کہا انسانی پیمانے پر دونوں طبقے (مرد، عورت) کے برابر ہیں۔

تانیثیت نے تاریخ و تہذیب میں عورت کے اس مقام و مرتبے کو دیکھتے ہوئے اس کے وجود کی اصل شناخت کو از سرِ نو دریافت کرکے مرتب کرتے ہوئے اس بات کا پرچار کیا کہ عورت کسی بھی طور پر بے کس، بے بس، لاچار، قابل رحم، ناقص العقل نہیں ہے بل کہ مردوں جیسی صلاحیتوں سے متصف ہے۔ اب تانیثیت نے ماضی کے دھندلکوں سے کئی نامور خواتین کو سامنے لایا۔ جنھوں نے نہ صرف علم و ادب کے میدان میں اپنی قابلیت کے جواہر دکھائے بل کہ اپنی دانش مندی، بہادری، جرات و شجاعت سے اہم کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

رضیہ سلطانہ تاریخ میں ایک ایسا ہی نام ہے جو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ امورِ سلطنت اور فن حرب میں بھی طاق تھیں۔ سلطان التمش نے تین بیٹوں کی موجودگی میں اپنی غیر شادی شدہ جواں سالہ بیٹی رضیہ کو سلطنت دہلی کی بادشاہی سونپنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے بیٹے نالائق تھے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے نامور مورخ نے جناب پی۔ این، ترپاٹھی نے اپنی کتاب ہندوستان میں مسلم خواتین کا رتبہ (انگریزی) میں لکھا کہ دہلی کے سلطان کے حیثیت سے ایک جواں سال عورت رضیہ کی نامزدگی سے تیرھویں صدی عیسوی میں ترکوں کی فکر کی تازگی اور قوت کی نشان دہی ہوتی ہے۔" [۵۴]

دوسری طرف بے جاپور سے مغلوں کے خلاف اپنی سلطنت کا بے مثال دفاع کرتے ہوئے بطور سلطان چاند بی بی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسی طرح شہنشاہ جہاں گیر کی ملکہ نور جہاں کسی کے لیے اجنبی نام نہیں تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ نہ صرف مملکت کا نظام چلانے میں جہاں گیر کے ساتھ شریک تھی بل کہ شاہی حکم ناموں پر بھی ملکہ کی مہر اور دست خط ثبت ہوتے تھے۔

تانیثیت جیسے جیسے تاریخ کے اوراق پلٹتی ہے تو بڑے بڑے فرمانروا عورت کی کارگردگی، ذہانت و لیاقت کو سراہتے نظر آتے ہیں۔ مغل حکومت کا جانشین بابر اپنی تزک میں نانی کی دانش مندی، دوراندیشی، معاملہ فہمی کا معترف نظر آتے ہوئے کہتا ہے کہ "میری نانی بے مثال شخصیت تھیں۔ وہ اتنی دانش مند اور دوراندیش تھیں کہ خاندان بھر میں ان کا ثانی نہ تھا میرے زیادہ تر معاملات ان کے مشورے سے ہی طے ہوئے۔" [۵۵]

احسان دولت بیگم کے بعد مشاورات و رہنمائی کا یہ کام ہمایوں کی بڑی بہن خانزادہ بیگم سر انجام دیتی ہیں۔ عورت کا یہ قائدانہ کردار تاریخ میں عورت کے مکمل انسانی وجود کو ظاہر کرتے ہوئے ڈی۔ ایچ لارنس کے اس نظریے کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ جس کی رُو سے لارنس نے مرد کی کارکردگی کو عقل اور عورت کے تمام اعمال کو جذبے سے منسوب کیا تھا۔[۵۶]

اسی تانیثی رویے نے شاہی خاندان کی اُن تجارت پیشہ خواتین کو بھی سامنے لایا جن کے ذاتی بحری بیڑے تھے جو تجارت کی غرض سے سورت اور احمر کی بندر گاہوں کے درمیان استعمال ہوتے تھے۔ عورت کے مکمل انسانی وجود کا اثبات کرتے ہوئے تانیثی جستجو نے کئی ادبا و شاعرات کے لازوال کارناموں سے ادب کو روشناس کروایا۔ "مونس الاروح" سلسلہ چشتیاں کے بزرگوں کا تذکرہ جو آج بھی محققین کے لیے اہم ماخذ ہے شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز بیگم کی دختر جہاں آرا کے علم و دانش کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ مغل شاہ زادی زیب النسا مخفی صاحب دیوان شاعرہ سے جب تانیثیت زمانے کی گرد ہٹاتی ہے تو اس کے کلام کے ترجمے مغرب کی درس گاہوں میں ہونے لگتے ہیں۔ الغرض زیب النساء مخفی، چاند بی بی، رضیہ سلطان، گل بدن بیگم، لکشمی بی، سیفو، قلو پطرہ، ترکان خاتون، بیگم نوک محل، حضر محل، احمد بیگم، محمدی بیگم، صغرا ہمایوں، ملکہ نور جہاں، ملکہ زنوبیہ، ایری کوئین، ملکہ وکٹوریہ، نذر سجاد حیدر جیسے گوہر نایاب کو تانیثی مفکروں نے ہی گم نامی کے پردوں سے باہر نکال کر اصل مقام و مرتبے کا تعین دیا۔

تانیثیت کا یہ نظریہ سب سے
پہلے مغرب سے ابھرا۔

تانیثیت کا آغاز وارتقا:

عورت کے حقوق اور وجود کے اثبات کا نظریہ تانیثیت، فیمینزم کے نام سے اگرچہ مغربی معاشرے سے اٹھارویں صدی میں جنم لیتا ہے۔ اسی سلسلے میں (۱۷۹۲ء) Mary Walstone Craft کے مضمون *A Vindication of the Rights of Woman* کو پہلا اظہاریہ کہا جاتا ہے لیکن مغربی تاریخ کا مطالعہ تیسری صدی عیسوی میں رومن خواتین کے کیپٹولائن ہل (Captioline Hill) میں جمع ہو کر اس بات پر احتجاج کہ خواتین کو مہنگی اشیا استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے، کو تانیثیت کی پہلی آواز قرار دیتا ہے۔ جب مغرب نے گھر کی چار دیواری عورت کے لیے اور عام معاشرتی زندگی مرد کے لیے مخصوص کر رکھی تھی، اور یہی چیزیں اور رویے تحریک نسواں کا محرک ہے۔[۵۷] بعد کے ادوار میں کئی خواتین نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ گیارھویں صدی کے مذہب اساس یورپین معاشرے میں ایک نن ہلڈیگرڈ ایک مذہبی مبلغ و ادیب کے طور پر متعارف ہوئیں۔

جنھوں نے مذہبی سکالر کے طور پر جرمن کا بھی دورہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم وتربیت کی مالک ہونے کے باوجود مروجہ اقدار کے اس قدر زیرِ تسلط تھیں کہ کبھی کبھی اپنے موسیقی کے ذوق اور تصنیف و تالیف کے باعث مجرمانہ احساس میں مبتلا ہو جاتی اور پھر کلیسائی عالم کے مشورے کی طلب گار ہوتی کہ انھیں اپنی غیر نسائی سرگرمیاں تصنیف و تالیف، موسیقی کی مشق کو جاری رکھنا چاہیے یا ترک کر دیں۔ [۵۸] اس زمانے میں اگرچہ مذہبی عقائد و تعلیمات کا سہارا لے کر خواتین نے اپنے حقوق کی جنگ چھیڑ دی تھی لیکن وہ اب بھی متعین نظام کے رد عمل سے خائف تھیں۔ پہلی تانیثی مفکر کرسٹین ڈیڈ پی سان (Christine Ded Pisan) نے چودھویں صدی میں فرانس سے عورتوں کے حقوق و تعلیم کے لیے نعرہ احتجاج بلند کیا۔ بعد میں لاراسیریٹا (Laura Cerata) نے ۱۴۸۸ء میں اپنے فرانسیسی خطوط

i. Episotloc Familiares Eng. Trans.

ii. Collected Letters of Arenaissance Feminist.

کے ذریعے کرسٹین کی آواز کو مزید تقویت دی۔ اپنے خطوط میں ''لاراسیریٹا'' نے عورتوں کے ساتھ جہالت پر مبنی جبر اًروا رکھے گئے رویوں، ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ [۵۹] اسی استحصالی سلوک کی بنا پر پندرھویں صدی کی جولین آف ناروے کو سوال کرنا پڑا کیا صرف اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں، میں یہ تسلیم کر لوں کہ مجھے تمھارے سامنے خداوند کی عظمت بیان نہیں کرنی چاہیے۔ جولین نے خدا کے نسائی پہلو کو سامنے لاتے ہوئے یسوع مسیح کو ایک مادر مہربان کے روپ میں دکھایا۔ انگریزی ادب میں مارگرے کیمپ خود نوشت کی خالق قرار پاتی ہیں۔ جولین کی ہم عصر ہی ہیں جن کی خود نوشت شادی شدہ عورت کی زندگی کا دردناک بیانیہ ہے [۶۰] سولہویں صدی تک خواتین کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ اگرچہ کلیسائی ٹھیکے دار عورتوں کے مذہبی امور سے متعلق سوالات کرنے کے روادار نہ تھے لیکن تعلیم نے عورتوں کو سوال کرنا اور استدلال کرنا سکھا دیا تھا۔ جین اینگر (Jane Anger) کا یہ دعویٰ کہ ''حوا آدم کی نسبت اعلیٰ مقام کی حامل ہے کیوں کہ آدم کو غلیظ گارے سے جب کہ حوا کو خود آدم کے پاک و منزہ جسم سے تخلیق کیا گیا تھا اور عورت ہی وہ پہلا انسان ہے جس نے ایمان قبول کیا۔ عورت ہی نے پہلی بار توبہ کی جس کے باعث مرد کو نجات حاصل ہوئی۔'' اس کے مجتہدانہ استدلال کا ہی نتیجہ تھا۔ عورت کی اس آواز کو اصلاحِ کلیسا (ریفرمیشن) نے اجاگر کیا۔ جین اینگر (Jane Anger) کے *Her – Protection for Women* نے انگلینڈ میں تانیثیت کی راہ ہموار کر دی۔ تحریروں کے ذریعے بیداری نسواں کا یہ سلسلہ ایک صدی تک چلتا رہا۔ ایک اور خاتون میری آسٹل (Mary Astell) نے اپنی کتاب *A Serious Proposal to the Ladies* دو جلدوں میں لکھ کر تجویز پیش کی کہ خواتین کے لیے ایسے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں وہ مذہبی تعلیم کے

حصول کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کے فرائض بھی انجام دیں سکیں۔ اسی صدی میں ایک اور اطالفہ مصنفہ (Moderate Fonte)اپنے مضمون *The Worth of Women* میں عورتوں کے حقوق کو متعارف کراتے ہوئے نمایاں ہوتی ہیں۔ [۶۱]عورتوں کو مردوں کے برابر لانے کی اس جدوجہد میں اگرچہ عورت کو کلیسائی استبداد کا نشانہ بھی بننا پڑا لیکن انھی کلیسائی عقائد کو اپنی عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس مذہب میں ایک عورت کو خدا کی ماں ہونے کا اعزاز حاصل ہے اس کے پیرو معاشروں میں اسے مذہبی تعلیم دینے کی اجازت کیوں نہیں۔"

کچھ خواتین نے مریم کو حوا ہی کا ایک دوسرا روپ ثابت کیا۔ بعض نے اپنے تشخص کی بحالی کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ "ہبوط آدم کے واقعے کی ذمہ داری صرف حوا پر ڈالنا درست نہیں کیوں کہ اگر حوا نے اسے بہکایا بھی تھا تو کیا آدم پر لازم نہیں تھا کہ اس کا رہنما اور نگہبان ہونے کی حیثیت سے اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی بجائے اپنی قوت فیصلہ سے کام لیتا۔" خواتین کی ہر ایسی سعی کا نتیجہ نفرت و ناپسندیدگی کی صورت میں سامنے آتا بل کہ بعض اوقات کفر کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ [۶۲]

سترھویں صدی میں کلیسائی رسوم میں اصلاح کے باعث اگرچہ عورتوں کو کچھ آزادی اور حقوق مہیا کیے گئے، لیکن اس صدی تک بھی ابھی معاشرے نے خواتین کی تذلیل اور اسے کم تر ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ شوہروں نے بیویوں کی کتابیں جلا ڈالیں۔ جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا۔ غلیظ گالیوں سے نوازا اور انھیں ذہنی امراض و دیوانگی کا شکار قرار دیا۔ رد عمل میں عورتوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جلسے جلوس نکالے، ہاؤس آف لارڈز میں حقوقِ نسواں کے ضمن میں قرار دادیں پیش کیں یہاں بھی تذلیل ان کا مقدر بنی۔ اٹھارھویں صدی تانیثی خیالات کو پروان چڑھانے کے لیے بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ تصنیف و تالیف سے خواتین کی بڑھتی ہوئی دل چسپی ہے۔ [۶۳]میر وول سٹون کرافٹ (Mary WollstoneCraft) کو پہلی فیمینسٹ رائٹر کہا گیا اس کی مشہور زمانہ کتابیں (1787) *Thought On The Education of Daughters*، *A Vindication of the Right of Women* (1792) تانیثیت کا ایک نیا باب وا کرتی ہیں۔ [۶۴]یہ کتاب انقلاب فرانس کے کچھ عرصہ بعد منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں میری وول سٹون نے سیاست، معاشرت، مذہب غرض نہ صرف ہر شعبہ زندگی میں مرد کے مساوی حصہ لینے کا حق قرار دیا۔ بل کہ اس بات کا مطالبہ بھی کیا کہ برابری کی سطح پر تعلیم کے بھی مواقع فراہم کیے جائیں۔ [۶۵]

۱۷۹۱ء میں مشہور ڈرامہ نگار اور اولمپی ڈی گوجز(Olympe De Goiges)نے *Declaration of the rights of women and of the female Citizen* میں مردوں کے متعصب و تنگ نظر رویوں کے خلاف کھل کر اظہار کیا اور واضح کیا کہ عورتیں نہ صرف حقوق و فرائض میں برابر ہیں بل کہ مردوں کی ساتھی بھی ہیں۔[۶۶] اس کے بعد یہ تحریک بڑی تیزی سے پنپنا شروع ہوئی۔ انیسویں صدی میں خواتین نے منظم انداز میں کام کرنا شروع کیا۔ معاشرے میں روا امتیازی رویوں (وراثت سے محرومی، تعلیمی مواقع کی عدم فراہمی، ملازمت میں اجرت کی کمی۔ ووٹ کا حق) کو نشانہ تنقید بنایا۔ شارلٹ برونٹے اور جارج ایلیٹ کی تحریریں JaneEyre, The Mill on the Floss معاشرے کی انھی غیر منصفانہ رویوں کی عکاس ہیں۔[۶۷] اسی ضمن میں جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill)کی *The Subjugation of Woman* اور مارگریٹ فُلر (Margret Fuller) کی *Woman in 19th Century* بھی اہم کتابیں ہیں۔ مل کے خیالات ایک لبرل سیاسی مفکر کے خیالات ہیں۔ وہ عورتوں کی تعلیم کی حمایت کرتا ہے کہ عورتیں علم حاصل کر کے مفید شہری بن سکیں۔[۶۸] ۱۸۲۵ء میں ولیم تھامسن نے بھی حقوقِ نسواں کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ۱۸۴۷ء میں Anneknight اور Elderly Quaker عین نائٹ نے اشتہارت کے ذریعے خواتین کے حقوق کے اجاگر کرنا شروع کر دیا۔ جان اسٹورٹ مل کی بیوی ہیرئٹ ٹیلر(Harriet Tayler)نے خواتین کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے ۱۸۵۱ء میں West Minister Review میں اس بات پر سیر حاصل بحث کر کے ثابت کیا کہ خواتین کو ووٹ دینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک مرد کو حاصل ہے۔ ۱۸۷۰ء تک آبادی کے ایک تہائی جوان مردوں کو، ۱۸۸۴ء تک Reform Act کے تحت ۶۳ سے ۶۸ فیصد مردوں کو ووٹنگ کا حق حاصل تھا لیکن عورتوں کو اس سے محروم رکھا گیا۔ حقوقِ نسواں کے تحت جب یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا تو طے پایا کہ ووٹ کا حق صرف غیر شادی شدہ عورتوں کو دیا جائے گا۔ کیوں کہ شادی شدہ عورت کی دل چسپیاں محض شوہر تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بیوی کی رائے شوہر کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ ۱۸۶۶ء میں خواتین کے ساتھ ملکر باربرالے سمتھ Barbara LeighSmith نے ایک قرار داد جمع کروائی جو عورتوں کے حق خودارادیت کے متعلق تھی اس پر ۱۴۹۹ عورتوں کے دست خط تھے۔ عورتوں کے حق خودارادیت کی حمایت میں ایملی ڈیویز(Emily Davies) کی دی ہوئی ایک قرار داد جان اسٹورٹ مل نے ۱۸۶۶ء اسمبلی میں پیش کی۔ اگرچہ قرارداد کی مخالف ہوئی۔ ۱۹۴ اسمبلی اراکین میں صرف ۷۳ ارکان کی حمایت نصیب ہوئی لیکن یہ اقدام بڑا سود مند ثابت ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں غریب اور ناخواندہ مردوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا لیکن خواندہ اور ٹیکس ادا کرنے والی خواتین کو اس حق سے محروم رکھا گیا۔ اس پر

خواتین کی طرف سے احتجاج میں اضافہ ہوا۔ ۱۸۹۷ء کی قرارداد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جسے پذیرائی تو ملی مگر ووٹ کا حق پھر بھی نہ مل سکا۔ حق خود ارادیت کی یہ جنگ اور تیز تر ہو گئی۔ جب تحریکِ نسواں کی ایک اہم رکن ایملی ڈیوسن (Emily Davison) نے ڈربی ریس کے موقع پر خود کو بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے پھینک دیا یوں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دنیا سے چل بسی۔ بالا آخر ۱۹۱۸ء میں تیس سال کی عمر کو ووٹ دینے کا حق اور پھر ۱۹۶۸ء میں یہ حق مردوں کے برابر مل گیا۔[۶۹] اس صدی میں کئی لکھاری خواتین ایسی آئیں، جنھوں نے پدری معاشرے کے غیر مساویانہ رویوں کو نئے طریقے سے اجاگر کرنا شروع کیا۔ ریبیکا ویسٹ (Rebecca West) اور ورجینیا وولف (Virginia Wolf) نے اپنی تحریروں میں ثقافتی اور معاشی سطح پر خواتین کو درپیش مسائل اور تعصبات کو موضوع بنایا۔ ورجینا کی کتاب *A Room of One's Own 1969* کو تحریک حقوق نسواں کی کلاسیکی دستاویز قرار دیا گیا۔ ڈورتھی رچرڈسن (Dorthy Richardson) کا *Pilgrimage* اس ضمن میں لکھا گیا ایک اہم ناول ہے۔ تاہم فکری سطح پر تانیثیت کو نئی سمت عطا کرنے والی کتاب سیموں دی بووا (Simone De Beauvoin) کی *The Second Sex (1949)* ہے۔[۷۰] اس کتاب میں بوا کرنے عورت کا نفسیاتی، معاشی، اور ثقافتی پہلو سے تجزیہ کیا۔ بوا کرنے عورت کو اس کی کھوئی ہوئی ہستی سے آشنا کرایا اور چند لفظوں میں عورت کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی جسے تاریخ بھی نہیں جھٹلا سکی کہ "عورت پیدا نہیں ہوتی، بنا دی جاتی ہے۔" مطلب یہ کہ معاشرے میں عورت اور مرد کی تقسیم فطری سے زیادہ ثقافتی ہے مردوں کے جداگانہ دائرکار کا تصور فطرت کے کسی قانون میں نہیں ہے بل کہ معاشرتی رسم ورواج ہی کسی فعل کو ناممکن یا خلافِ فطرت قرار دیتے ہیں۔[۷۱] تانیثیت کی بحث کو پروان چڑھانے میں سیمون کی تحریروں نے بھی اہم کردار ادا کیا اور مختلف پہلوؤں سے اس کا رشتہ جوڑ دیا۔ علاوہ ازیں جوڈتھ مول ایلین لیوں اور جو فریمسین ایسی خواتین نے عورتوں کی تاریخ پر مضامین اکٹھے کیے جو بالآخر سٹینٹن کے ساتھ ۲۳ عورتوں کے ہاتھوں مرتب ہو کر عورت کی انجیل The Women Bible) نامی کتاب کی صورت میں سامنے آئے جس میں عورت کے زاویہ نظر کو پیش کیا گیا۔[۷۲]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مغرب سے جنم لینے والی اس تحریک کی کئی جہات ہیں جن میں لبرل یا آزاد خیال فیمینسٹ مرد و عورت کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کرنے کے بجائے دونوں فریقین میں اتحاد کے قائل ہیں۔ جب کہ انارکسٹ فیمینسٹ پدرسری، معاشرے کے برعکس مادر سری نظام کے نفاذ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ مارکسی نظریے کے حامی طبقاتی نظام کے خاتمے ہی کو عورت اور مرد کے اختیارات کا خاتمہ قرار دیتے ہیں اور ریڈیکل فیمینسٹ

مردوں سے قطع تعلق کر کے اپنی دنیا کے اصول خود طے کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اب مابعد تانیثیت کے عنوان سے ایک نیا موضوع زیرِ بحث آ چکا ہے۔[۴۳]

اس تحریک کے اثرات مشرق میں بھی نمودار ہونا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ تانثی فکر کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

اردو ادب اور تانیثیت:

دنیا کے مختلف ممالک میں تانیثیت وہاں کے مزاج، ماحول، ضروریات کے مطابق صورتیں اختیار کرتی رہی ہے۔ جس میں خود عورتوں کی تعلیم، شعور اور ماحول کا عمل دخل ہوتا ہے۔

"Feminism Theories start from the assumption that the personal is the political that all theories about women and sender need to be checked Asiainst real life experience."

مغرب میں اس تحریک کے آغاز پر ابتدائی رد عمل منفی تھا۔ اٹھارویں صدی تک اس تحریک میں کچھ زور پیدا ہوا۔ یہی زمانہ برصغیر میں عورتوں کی اصلاحی تحریکیوں کا نقطہ آغاز تھا۔ اگرچہ برصغیر کے سماج میں اس بات کی گنجائش نسبتاً کم تھی کہ عورتیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور طریقے سے استعمال کر سکیں۔[۴۴] لیکن برصغیر کی تاریخ میں ایسی کئی عورتوں کے نام ملتے ہیں۔ جنھوں نے نسائی کردار سے آگے بڑھ کر اس میدان میں بھی قدم جمائے جو مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے اور منفی برابری کے دعویٰ دار ہوئیں۔ رضیہ سلطان، چاند بی بی، شاہ زادی، زیب النسا، ملکہ نور جہاں تاریخ کے ایسے ہی نام ہیں۔ جنھوں نے مردوں کے لیے مختص میدانوں میں اپنے کمالات کے جوہر دکھاتے ہوئے مسلمہ کردار سے بغاوت کی۔ اس طرح اردو ادب کی تاریخ بھی شہر زاد اور امراؤ کی صورت میں عورت کے منحرف کردار پیش کرتی ہے۔[۴۵]

آنے والی دہائیوں نے عورت کی علیٰحدہ شناخت کو مٹا ڈالا اور اس کے وجود کو بے جا اور خود ساختہ پابندیوں میں جکڑ لیا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بھی اپنی شناخت کی بجائے مرد کا مرہونِ منت ٹھہرا۔ یہ صدی رسم و رواج میں جکڑی عورت کی مظلومیت کی تصویر پیش کرتی ہے جہاں اسے تقدس نہ مل سکا جن کی وہ حق دار تھی۔ اس کی پیدائش کو نحوست سمجھا گیا۔ وراثت کے حقوق سے محروم کر کے تعلیم کا حق بھی چھین لیا۔ شادی جیسے اہم اور حساس معاملے میں اس کی مرضی و پسند کو شرم و حیا کے منافی گردانتے ہوئے کبھی بچپن کی منگنی اور کبھی کم عمری کی شادی جیسے کرب انگیز فیصلے کی نذر کر دیا جاتا۔ بیوہ ہونے کی صورت میں کئی جنت کا لالچ دے کر ستی جیسی بھیانک اور قبیح

رسم کی بلی چڑھا دیا جاتا اور کئی عقدِ ثانی پر مہر ثبت کر کے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جاتا۔ اسی بنا پر عورت بے بسی، مظلومیت اور پسماندگی کی وہ زندگی گزار رہی تھی جس میں اس کی حیثیت محض باندی کی سی تھی یا وہ جنسی کھلونا تھی جو اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھی۔ عورت کی اسی حالتِ زار کا نقشہ ڈاکٹر سید جاوید اس طرح کھینچتے ہیں:

۔۔۔۔۔اگر اس زمانے کی مسلم عورت کا تصور کیا جائے تو گھر کی چار دیواری میں بند علم و عقل سے بے بہرہ زندگی کے مسائل سے بے خبر محض بچے جننے والی مشین کا ہیولا ابھرتا ہے۔ لوگ اپنی بچیوں کو مدرسوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔ پردے کی پابندی اپنی جائز حدود سے آگے تھیں۔۔۔[۷۶]

مغرب میں اپنے حقوق کی پاس داری کے لیے اٹھائی گئی انقلابی آواز جب مشرق بالخصوص برصغیر پہنچی تو یہاں بھی عورت کے مروجہ کردار اور مقام کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور پھر سے عورت محکومیت سے حاکمیت کے سفر پر گامزن ہوئی۔ ثاقب رزمی آزادی نسواں کا نیا سویرا میں لکھتے ہیں:

یہ کتنی اندوگیں روش ہے کہ عورتوں کو برائے تسکین حظ جنسی گھروں میں پودوں کی چارپایوں کی طرح قید و بند رکھا ہے اور ان کو انسانیت کے ارفع مقام سے بھی گرا دیا ہے۔ وہ عورتیں جو اٹھیں تو مردوں کو مات دیں جو قابلیت کے جوہر دکھائیں ان کی سلطنت چلائیں۔[۷۷]

جب عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی تو ان پر مغرب زدگی، جنس زدگی کا الزام عائد کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگی ہیں لیکن یہ محض ایک الزام تھا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ عورتوں نے تحریک میں شمولیت کے ساتھ اپنے فرائض بھی احسن طریقے سے نبھائے۔ وارث میر نے عورتوں کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک مخصوص گروہ کے پراپیگنڈہ کے برعکس ان عورتوں نے اپنی گھریلو زندگی کو گھر سے باہر کی مصروفیات کے باوجود پراگندگی اور انتشار کا شکار نہیں ہونے دیا۔"[۷۸]

دراصل ان خواتین نے جس دور میں قلم اٹھایا وہ ذہنی و شعوری بیداری کا ابتدائی دور تھا۔ نئے زمانے اور جدید تعلیم نے ذہنوں کو جلا ضرور بخشی تھی مگر صدیوں پرانے معاشرتی رویوں اور روایات سے رہائی حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ قدیم نظریات کے پیروکار یہ سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم عورت کو نافرمان اور سرکش بنا دے گی۔ اس لیے اس نظام نے ہر اس آواز کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی جو عورت نے اپنے حق کے لیے بلند کی لیکن ان باہمت عورتوں نے کبھی بھی شکست کو غالب نہ آنے دیا اور ہر طرح کے حالات میں اس کو قائم رکھا۔ حقوق نسواں کی اس تحریک میں تین حوالوں سے رکاوٹ تھی جس کی نشان دہی ڈاکٹر عقیلہ جاوید نے یوں کی ہے۔ "درحقیقت ہمارے سماج میں عورت پر تین طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ اول قانون، دوم رسم و رواج اور سوم غربت اور جاہلیت۔"[۷۹]

خواتین کے مسائل پر پہلی بار قلم اٹھانے والی خواتین ہی تھیں۔ لاہور سے محمدی بیگم کے جاری کردہ "تہذیب نسواں"(۱۸۹۸ء)، علی گڑھ سے شیخ عبداللہ و بیگم عبداللہ کا ماہ نامہ "خاتون"(۱۹۰۶ء) کا مقصد خواتین کے شعور کو بیدار کرنا ہی تھا۔ راشد الخیری کا "عصمت"(۱۹۰۸ء) بھی انھی مقاصد کا حامل تھا۔ محمدی بیگم، صغرا ہمایوں، اکبری بیگم، ض۔ حسن بیگم، نذر سجاد حیدر، آصف جہاں، انجمن آرا کی افسانوں تحریریں اسی سلسلے میں کی جانے والی نمایاں کوششیں تھیں۔

حقوقِ نسواں کی اس تحریک میں مردوں نے بھی حصہ لیا۔ حالی تو اس تحریک کے علم بردار کہلائے۔ انھوں نے برصغیر کی عورت کو اپنی شاعری اور نثر کا موضوع بناتے ہوئے اس کے معاشرتی مسائل اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی عمدہ ترجمانی کی۔ اپنے ایک مضمون ہماری معاشرت کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے، کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ہمارا معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک عورتوں کی تعلیم نہیں ہو گی سماج سے غلط رسوم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں وہ خود ان کو غلط نہ سمجھیں ان کی اور دل چسپیاں نہ ہو۔[۸۰]

حالی نے "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" جیسی شاہ کار نظمیں پیش کر کے عورت کی بے بسی، مظلومیت، مسائل اور اس پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور پہلی بار عورت کو ماں، بہن، بیٹی کے روپ میں اس کے حقیقی مسائل کے ساتھ سامنے لایا۔ "چپ کی داد" میں مسلمان عورت کی تعلیمی حالت زاد کا نقشہ کھینچا۔ "مناجات بیوہ" ہندوستانی بیوہ کی کرب انگیز زندگی کا حصہ ہے جس میں بیوگی طعنہ بن کر اس کی زندگی اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں سلب کر لیتی ہے۔

ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیوں کر الٰہی کاٹیے غم کو
گر سسرال میں جاتی ہوں — نحس قدم کہلاتی ہوں
سوچ میں میرے سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں میں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا ہوں نہ کھاتی
جانتی ہوں نازک ہے زمانہ — بات ہے اک یاں عیب لگانا
مہندی میں نے لگانی چھوڑی — پئی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی — عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گندھواتی

دو دو چاند سر نہیں دھوتی اٹھواروں کی کنگھی نہیں ہوتی[۸۱]

"مناجات بیوہ" کے درج بالا اشعار برصغیر کے اس بے رحم سماج کی تصویر کشی ہے جس میں بیوہ کے اپنی مرضی سے ہنسنے، بولنے، پہننے، اوڑھنے حتٰی کہ کھانے پینے سب پر قدغن ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں "حقوق نسواں" کی تحریک اصلاحی مقاصد کی حامل تھی اور حالی اصلاح پسند نسائیت کے علم برداروں میں سے تھے۔ جن کا مقصد خواتین کے لیے کوئی انقلاب لانا نہ تھا بل کہ ہندوستان کے خوف ناک رسم و رواج کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کر کے ان کا خاتمہ کرنا تھا۔ ان رسم و رواج میں بچپن کی شادی، بیوہ کا عقد ثانی، تعلیم سے محرومی، جائیداد سے محرومی، کثرت ازدواج وغیرہ شامل تھے۔ اصلاح پسندوں نے عورتوں کے تمام مسائل کا حل تعلیم نسواں کو قرار دیتے ہوئے جدید تعلیم کا حصول لڑکیوں کے لیے ضروری ٹھہرایا کہ اس سے عورتیں بہتر بیویاں اور مائیں بنیں گی اور اس طرح معاشرے کا نظام بہتر ہو گا۔

اصلاح پسندی کے ابتدائی دور میں اس تحریک کے اثرات سرسید اور ان کے دیگر رفقائے کار کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ عورت کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے حامی سرسید بھی تھے۔ اگرچہ وہ مرد کی تعلیم کو عورت کی تعلیم پر فوقیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مرد تعلیم پالیں گے تو وہ عورت کی تعلیم کا خود انتظام کر لیں گے۔ ان کا یہ خیال آنے والے وقت نے سچ ثابت کر دکھایا۔ علی گڑھ کی تعلیم یافتہ نسل نے ہی تحریک نسواں کو تقویت دی۔[۸۲]

جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت آنے والے وقتوں میں یہ تحریک اصلاحی نسائیت سے لبرل نسائیت میں تبدیل

ہو جاتی ہے اور آزادئ نسواں کا رومانوی پہلو پیش کرتے ہوئے پردے کی روایات کو پس پشت ڈال کر مردوں کی ہم سری میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہے لیکن بنیادی تبدیلی کی یہ بھی نفی کرتی ہے۔[۸۳]

سرسید کے ہم نواؤں میں ڈپٹی نذیر احمد اور مصورِ غم علامہ راشد الخیری بھی عورت کے مسائل کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے اس کی زندگی اور زندگی کے مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔ اگرچہ بعد کے ناقدین نے ان تحریروں کو مردانہ برتری کا عکاس قرار دیتے ہوئے اس حد تک کہا کہ ان تحریروں کی عورت کو اس احساس کے پیش نظر تراشا گیا ہے کہ وہ مروجہ کردار کو احسن طریقہ پر نبھانے کے قابل ہو سکے۔[۸۴]

اصلاح پسندوں کی تحریروں کے ضمن میں یہ رائے دراصل اس امر کی غمازی ہے کہ ان کو آج کی نسائیت کے پیمانے پر پرکھا گیا ہے۔ نتیجتاً یہ مردوں کی برتری اور پرانی اقتدار کی حامل تحریروں کے پروپیگنڈے کے طور پر

سامنے آئیں۔ لیکن اگر انھیں ایک خاص تاریخی مناظر کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ اس زمانے کی ترقی پسند سوچ کی عکاسی ہیں۔[۸۵]

تاہم "حقوق نسواں" کے حوالے سے جو پہلی بلند آہنگ آواز ترقی پسندی تحریک کے پلیٹ فارم سے ابھری وہ رشید جہاں کی تھی جن کا افسانہ "دلی کی سیر" افسانوی مجموعہ انگارے میں شامل تھا۔ رشید جہاں کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، قرۃالعین حیدر، خدیجہ مستوراور ہاجرہ مسرور شامل تھیں جنھوں نے صدیوں پرانے معاشرتی رویوں اور اقدار وروایات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اگرچہ انھیں کڑی تنقید اور مخالف کا سامنا بھی کرنا پڑا۔[۸۶]

لیکن ان کی چلائی حقوق نسواں کی اس تحریک کی بدولت ہندوستان میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ ستی، بچپن کی شادی، کثرتِ ازواج، تشدد جیسی برائیاں دم توڑنے لگیں۔ انھی جرائت مند خواتین کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۵ء تک خواتین کو ووٹ کا حق بھی مل گیا۔ ۱۹۳۰ء۔ ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرس میں عورت کی طرف سے یادداشت پیش کی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد تحریکِ نسواں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ تحریکِ نسواں کی رہنماؤں میں صغریٰ ہمایوں، محمدی بیگم، عطیہ بیگم، نفیس دلہن، فاطمہ بیگم، بیگم یعقوب جیسی خواتین سے متاثر ہو کر ہی قیامِ وطن کے بعد بیگم رعنا لیاقت علی خان، بیگم نصرت بھٹواور بے نظیر بھٹو نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اسے قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عصرِ حاضر میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن جیسی خواتین تانیثی شعور کے فروغ کے لیے کوششیں کر رہی ہیں۔[۸۷]

آزادئ نسواں کی تحریک پاکستان میں اس سطح پر فعال نہیں ہو سکی۔ جس سطح پر مغربی ممالک میں نظر آتی ہے۔ معاشرے میں انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کی تحریکیوں کے باوجود آج بھی ونی، سوارہ اور غیرت کے نام پر قتل ہونے والی خواتین کی تعداد میں کمی نہیں ہو سکی ہے۔ تحریک حقوقِ نسواں ابھی بھی اردو ادب میں اپنے مکمل اور
تخلیقی اظہار کی منتظر ہے۔[۸۸]

کلاسیکی ادب میں تصور عورت: اجمالی جائزہ:

اردو ادب کا آغاز داستانوں اور شاعری سے ہوتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے سماج میں عورت کی دگرگوں حالت کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں یہاں کی عورت کو تو پردے اور گھر کی چاردیواری تک محدود رکھا گیا مگر اس معاشرے نے طوائف کو ہر طرح کی آزادی اور اختلاط کی اجازت دے رکھی تھی۔ اگرچہ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے

روپ میں عورت تقدس کا درجہ رکھتی تھی۔ گھر کے اندر اسے اساسی حیثیت حاصل تھی لیکن اردو ادب نے اپنے ابتدائی عہد میں عورت کے اس کردار کو پسِ پشت ڈال کر اس کا وہ تصور پیش کیا جس میں وہ محض نمائشی حیثیت رکھتی تھی اسے حسن کی دیوی کہا گیا جس کا کام مرد کی حیوانی خواہشات کی تکمیل کرنا اور اس کے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچانا اور اس کا دل بہانا قرار دیا گیا۔ عورت کے اسی دیومالائی حسن سے متاثر ہو کر اگرچہ کلاسیکی ادیب نے اس کے وجود کی تراش خراش کو ادب میں دل کھول کر جگہ دے دی مگر اس ظاہری وجود میں چھپے جذبات و احساسات کو درخورِ اعتنانہ سمجھا اور شاید یہ اس وقت کے ادیب کا مقصد ہی نہ تھا۔ [۸۹] ابتدائی دور کی کلاسیکی شاعری پر نظر دوڑائیں تو عورت آزادی و انفرادیت سے محروم ایک بے حیثیت ہستی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس شاعری میں عورت ایک ٹائپ کا کردار ہے جس میں اسے ہی محبوب فرض کر کے جسمانی حسن کا مجسمہ، شیوہ غمزہ وادا، بے رخی، بے وفائی، کم نگاہی، غرور و ستم جیسی صفات سے متصف اور بہترین سیرت سے عاری ٹھہرایا گیا ہے۔ اردو شاعری کا محبوب اسی سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں فردیت کا سوال ہی بے معنی ہے۔ [۹۰]

ابتدائی اردو شاعری محض سراپا نگاری ہے جس میں عورت کو محبوب بنا کر اس کے ساتھ فحش حرکات، ابتذال گوئی اور سوقیانہ پن کا انداز اپنا پیدائشی حق سمجھ کر روا رکھا گیا۔ اس عہد کی شاعری میں اوسط درجے کی عورت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیوں کہ اس دور میں کسی شریف زادی کا نام تک لینا عیب گردانا جاتا تھا۔ چہ جائیکہ اسے اردو شاعری کا محبوب بنایا جاتا۔ لہٰذا شعراء کی دست رس میں دو قسم کی عورتیں رہ گئیں تھیں۔ ایک وہی کوٹھے کی عورت اور دوسری خیالی عورت۔ پہلی قسم کی عورت لکھنوی شاعری میں جلوہ گر ہوتی ہے اور دوسری قسم کی عورت دکنی اور دہلوی شعراء کی شاعری کا مرکز ہے۔ زاہدہ حنا اسی ضمن میں میر اثرؔ کی مثنوی "خواب و خیال" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ان مرد درویش صفت اور پیر فقیر نے عورت کو مرکز نگاہ بنا کر جس فحش نگاری سے کام لیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی میں ابتذال کس انتہاہ کو پہنچ چکا تھا اور عورت کی توقیر کس طرح اپنا مقام کھو چکی تھی۔ میر اثرؔ نے جس معشوق کا بیان کیا وہ مثنوی میں بیان ہونے والے احوال کے مطابق خود میر اثرؔ کی عاشقی کا دم بھرتی تھی۔ مثنوی کے اشعار میں وہ ہمیں روٹھ کے بات نہ کرتی، چھاتی پر لات مارتی ٹھنکتی، بلکتی اور آہ وزاری کرتی، گلو خلاصی کے لیے منتیں کرتی، پاؤں پڑتی، رانوں پر ہاتھ رکھ کر چوٹ بجاتی، ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی، ہولے ہولے پکارتی، لڑتی بھڑتی اور کسی کو پکار بیٹھنے کی دھمکی دیتی نظر آتی ہے۔ خدا رسیدہ بزرگ اثرؔ نے اس مثنوی میں ناف اور زیرِ ناف کے بیان پر ۱۲۸ اشعار قلم بند کیے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب معاملات تن و بدن بیان کرنے میں ایک زاہد و عابد کا یہ حال ہے تو جعفر زٹلی، رنگین جان صاحب یا میر زاشوق سے کیا شکایت۔ [۹۱]

یہ سرسری تذکرہ اردو غزلیہ شاعری میں عورت کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ لیکن جب عورت کے اس امیج کو منہا کرنے کی مساعی کی گئیں تو محبوبہ کی صورت میں ایسی عورت کا تصور سامنے آیا جو سماجی عورت سے بالاتر ہو جسے با آسانی اپنے جذبات کی اعلیٰ قدروں کا ذریعہ بنا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات و احساسات کی حامل ایک ذہین عورت کا تصور یہاں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن سرسید تحریک کے زیرِ اثر حالی نے برصغیر کی عام عورت اور اس کے کچلے ہوئے جذبات و احساسات کو اپنی شاعری کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں پاک و ہند کی عام عورت سے کلام کیا اور اس کی اصلاح اور اسے فعال بنانے کے لیے کوششیں کیں جو اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ تھیں۔ [۹۲]

سرسید تحریک کے قلم کاروں نے عورت کے حسن کی تعریف کی بجائے اس کو درپیش مسائل پر ادب تخلیق کیا۔ سرسید کی اصلاحی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ انیسویں و بیسویں صدی میں اردو شاعری روایتی مضامین سے دامن کش ہو گئی اور تصورات سے ہٹ کر اپنے اطراف میں موجود عورت کے مسائل کو زیرِ بحث لانے لگی۔ ہماری داستانوی عورت کا تصور بھی کلاسیکی اردو شاعری کی محبوبہ سے کسی طور پر کم نہیں۔ کلاسیکی داستانوں کی ہیروئن حسن و جمال میں بے نظیر، مافوق الفطرت خصوصیات اور رویوں کی حامل، اپنی حرکات اور کارناموں سے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتی ہے۔ یہاں بھی عورت کا تصور انتہا پسندانہ ہے۔ ایک طرف تو وہ وفا کی دیوی، مامتا کی ماری عورت ہے تو دوسری طرف وہ کٹنی ہے بے وفا، چلتر اور نا قابلِ اعتبار ہے۔ تمام داستان گویوں کے ہاں چاہے وہ میر امن کی "باغ و بہار" ہو یا سرور کی "فسانہ عجائب"، تقی کی "بوستان خیال" یا "طلسم ہوش ربا" یا داستان "امیر حمزہ" غرض تمام داستان گویوں کے ہاں عورت اپنی خوب صورتی، ہوشیاری، چالاکی اور معصومیت سمیت موجود ہے اسی حوالے سے زائدہ حنار قم طراز ہیں:

> "بوستان خیال" میں عورت کے حوالے سے فحش نگاری جس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اس تک طلسم ہوش ربا کی گرد تک نہیں پہنچتی۔ اس داستان کے ہر طلسم میں کافر شہزادیاں ہیں جو شہوت کی ماری اور ہوس کے ہاتھوں ہاری ہوئی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کے روز و شب کی تفصیل پڑھیے تو خیال آتا ہے کہ انھیں اس کے سوا کوئی اور کام بھی درپیش ہوتا تھا یا نہیں۔ سچ پوچھیے تو ان شاعروں اور داستان نویسوں نے زبان کے ہتھیار سے برصغیر کی عورت کا وقار اور اس کی شائستگی کو جو زخم لگائے وہ آج بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ [۹۳]

عورت کے کردار کی اس منفعیت نے طوائف کے کوٹھے کی مرکزیت کو اجاگر کیا۔ انگریزوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی عمل داری نے مرور ایام کے ساتھ واجد علی شاہ کی طرز کی رنگ رلیوں کا خاتمہ کر دیا۔ خوابوں کے رسیا

مشاعروں اور ادیبوں کے لیے حقائق کا سامنا مشکل ہو گیا اب جب گھر کی سادمرادی منھ بسورتی عورت سامنے آن کھڑی ہوئی تو ادب کے خالقوں کی تخلیقی صلاحتیں ماؤف ہونے لگیں کہ بغیر سرخی غازے غمزہ وادا سے محروم عورت کا ذکر کیسے کیا جائے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز برصغیر کے کونے کونے پر قابض ہو چکا تھا۔ روشنی کی مرموم سی کرن بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد دم توڑ چکی تھی۔ ہر شعبہ زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں معاشرتی زندگی خاص طور پر متاثر ہو رہی تھی۔ ایسے میں اصلاح پسند حقیقت نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی۔ یہ سرسید اور ان کے رفقائے کار تھے۔ جنھوں نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ خواتین اور ان سے متعلق سماجی معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔[۹۴]

علی گڑھ تحریک کے نمایاں قلم کار نذیر احمد نے اصلاحی ناول لکھے۔ حالی تو حقوق نسواں کے علم بردار کہلائے۔ نذیر احمد اور حالی کے نتتبع میں مصور غم علامہ راشد الخیری نے عورتوں کے لیے اصلاحی ادب تخلیق کیا اب حسن ظاہری کے مقاصد کی بجائے زندگی کی الجھنوں میں جکڑی عورت کو موضوع بنایا جانے لگا لیکن خواتین کے کردار اس عہد کے ادب میں بھی انفرادیت و شخصیت سے محروم نظر آتے ہیں اس کی حیثیت مردانہ معاشرے کے دوغلے معیاروں میں ڈھلی ایک بے جان مخلوق کی سی ہے۔ جو سوچنے سمجھنے اور مشاہدے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ یہاں بھی اس کا کردار ٹائپ کردار ہے۔ جس کی خوبیاں خامیاں وہی ہیں جو مرد کی طرف سے اسے تفویض کر دی گئی ہیں مثلاً ظالم ساس، ڈائن، محکوم و مجبور بہو، وفا شعار بیوہ، چڑچڑی بیوی، ڈائن نما سوتیلی ماں، اور شرم وحیا ناز و ادا کی پتلی محبوبہ وغیرہ وغیرہ ہمارے یہ ناول عورت کے کردار و اخلاق کو مجروح ہونے سے تو بچاتے ہیں۔ لیکن جیتی جاگتی منفرد وفعال عورت کو پیش کرنے سے یہ بھی قاصر ہیں۔[۹۵]

اصلاح پسندوں کا یہ قافلہ آگے بڑھتا چلا گیا لیکن بیسویں صدی میں رومانی تحریک کے زیر اثر ایک بار پھر سے عورت پر رومان کے پردے ڈالے جانے لگے۔ سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، بیگم حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری، اور مجنوں گورکھپوری جیسے رومانی ادبا نے اس کے ظاہری حسن کی ستائش کرتے ہوئے اسے دیوی کا درجہ دے کر پوجا کے لائق قرار دیا۔ ان ادیبوں کے ہاں عورت ایک خوب صورت مجسمہ ہے۔ رومانیت پسندوں نے عورت کے مسائل کی طرف سے آنکھیں پھیرتے ہوئے اس کے حسن، وفا، ہم دردی، محبت و لطافت کا ذکر افراط و تفریط سے کیا۔ اس دور کے شاعروں اور نثر نگاروں نے عورت کے حسن ظاہری پر تعریف کے قصیدے کہے۔[۹۶]

لیکن ترقی پسند تحریک نے منظر عام پر آکر جہاں ایک طرف جیتی جاگتی عورت کے مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ وہی حقیقت نگاری کی آڑ میں اس کی جنسیات سے جڑی لذتوں کو بھی ادب کا موضوع بنا دیا۔ ''انگارے'' کی

اشاعت نے اس کے جنسی اور جسمانی حد تک نجی مسائل کی نشان دہی کی۔ رشید جہاں اس وقت کی بھرپور آواز تھیں۔ ان کے بعد اردو افسانے اور ناول میں اسی نوع کی عورت کو پیش کیا جانے لگا۔[۹۷]

اردو ڈرامے کا بہ نظر غائر مطالعہ بھی عورت کے روایتی تصور سے ہٹ کر نہیں۔ واجد علی شاہ کا رہس میں داستانوی عناصر اور کرداروں کو مجسم کرنے کی شعوری کوشش دکھائی دیتی ہے۔ اس رہس میں بھی پریوں کے کرداروں کے لیے لکھنو کی بہت سی نابغہ روزگار طوالفوں اور حرم کی کنیزوں کو لاکھوں روپے کا خرچ کر کے خوب صورت لباس اور زیور سے آراستہ کیا گیا۔ ''امانت کی اندر سبھا'' میں بھی عورت کو خوب صورت پری پیکروں کی صورت میں پیش کیا گیا۔[۹۸] الغرض ہمارے کلاسیکی ادب میں عورت کا حسن، اس کا عشق اس کی طلب اس کا وصال اس کا فراق لہو بن کر دوڑ رہا ہے۔[۹۹]

بیسوی صدی کے اوائل ہندوستان میں مرد مصنفین کے تانیثی رویے:

اٹھارویں صدی مغلیہ سلطنت کے ٹوٹنے پھوٹنے اور بے وقار ہونے کی صدی ہے۔ ٹیپو سلطان کی شکست اور شہادت اس صدی کا ایک اہم واقعہ ہے اور اس اہم واقعہ نے برصغیر میں انگریزی اقتدار کا راستہ کھول دیا۔ ٹیپو سلطان کی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گی۔ سرنگاپٹم کو انگریزوں نے خوب دل کھول کر لوٹا اور اس سلطنت کے حصے کر کے اپنی عمل داری میں بدل کر لیا۔

انیسویں صدی انگریزی سلطنت کے استحکام کی صدی ہے۔ یہ تاریخ و تمدن کے لحاظ سے بھی ایک اہم صدی ہے۔ اس دور میں برصغیر میں مغرب و مشرق کی کش مکش بہت نمایاں ہو چکی تھی۔ نئے خیالات سر اٹھا رہے تھے اور روایتی معاشرہ ٹوٹ کر نئی صورتوں کا خوگر ہو رہا تھا۔ چاروں طرف حرکت و تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ مشرق دل گرفتہ اور پس ماندہ ہو کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور مغرب ایک فاتح کی حیثیت پورے برصغیر پر چھا رہا تھا۔ اب ہندوستان کا سارا منظر نامہ بدل چکا تھا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی؛

> مسلمان انگریزوں کی نظر میں بے اعتبار اور سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے قلاش ہو چکے تھے۔۔۔ مسلمانوں کے لیے اب اقتدار قصہ پارنیہ بن چکا تھا۔ جو یادیں بن کر عظمت رفتہ کو ہر دم تازہ کر رہا تھا۔[۱۰۰]

سیاسی طور پر یہ عہد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسے منجدھار میں لے آیا تھا۔ جس کے مد و جزر پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ حالات کی رو ان کے خلاف تھی۔ پرانے ادارے آہستہ آہستہ اپنی شناخت کھو رہے تھے اور نئے

ادارے سر اٹھا رہے تھے۔ انگریزی سلطنت کی دھاک بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔ پیغامات کی ترسیل نئے خطوط پر ہونے لگی۔ ریل گاڑی نے سفر کو آسان کر دیا، بندوق عام ہو گئی۔ مسلمانوں کی حالت زار ایسی ہو گئی کہ شہزادہ مرزا جہانگیر نے برطانوی ریذڈنٹ پر طمنچہ جھونکا تو انگریزوں نے اسے نظر بند کر کے آلہ آباد بھیج دیا اور ہوش آیا تو معلوم چلا کہ اقتدار اس کے پاس نہیں ہے بے بس بادشاہ کچھ نہ کر سکا اور شہزادہ وہی قید فرنگ میں مر گیا۔ انگریز جدید ترین آلات سے لیس تھے۔ سوچ سمجھ کر حکمت عملی کے تحت قدم اٹھاتے تھے۔ ہندوستانی فوج غیر تربیت یافتہ تھی۔ خاندانی روایات پر تکیہ کرتی تھی کسی نئی چیز کو سمجھنا اپنی شان کے خلاف جانتی تھی۔ ان کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں تھا۔ ذرا سی ترغیب پر کوئی بھی سپاہی دشمن سے جا ملتا تھا۔ وہ معاشرہ کسب کو عیب جانتا تھا۔ بادشاہ نام کا بادشاہ تھا۔ اصل اقتدار انگریزوں کے پاس تھا۔ بادشاہ حقیقت سے آنکھیں چرائے، ماضی کی عظمتوں میں گم تھا۔ اسے اس بدلے ہوئے منظر کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اور وہ یہ سرے سے بھول چکا تھا کہ اس کے پرکوں نے یوں ہی عظمت حاصل نہیں کی تھی۔[۱۰۱]

انگریزوں کی فتح کا اثر برصغیر کی دونوں بڑی قوموں پر مختلف انداز سے اثر پذیر ہوا۔ مسلمانوں کے نزدیک انگریز ان کا سب سے بڑا دشمن تھا، جس نے سلطنت اور اقتدار ان سے چھین لیا۔ مسلمان انگریزوں کے ہر فعل کو شک کی نظر سے دیکھتا وہ گھمنڈ میں آکر خود کو طرم خان سمجھ بیٹھے۔ ہر نئی بات نئی چیز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنی بات پر اڑ کر سارے معاشرے کو بے رونی طاقتوں کی زد پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اس سے معاشی بدحالی نے لالچ کو جنم دیا۔ خود غرضی عام ہو گئی اور مقصد و اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔[۱۰۲]

اس کے برخلاف ہندوؤں نے انگریزی اقتدار کو اس لیے خوش آمدید کہا کہ یہ انگریزی نظام اٹھارویں صدی کے مسلم نظام سے بہتر تھا۔ ہندوؤں کے لیے یہ اس وقت محض حکمرانوں کی تبدیلی تھی۔ مسلمانوں نے نئے مغربی تصورات اور انگریزی تعلیم کو مسترد کر دیا اور ہندوؤں نے اسے دل و جان سے قبول کر لیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال کلکتہ عربی مدرسے میں انگریزی زبان کو لازمی مضمون کے طور پر شروع کرنے کا ارادہ کیا تو مسلمانوں نے اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے سنسکرت کالج کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ ان کے لیے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ۱۰ جنوری ۱۸۱۷ء کو کلکتہ میں ہندو کالج کا قیام ہندوؤں کے اسی زاویۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سے انیسویں صدی میں دونوں قوموں کے انداز نظر کا فرق واضح معلوم ہوتا ہے۔[۱۰۳]

انگریزی سلطنت کے استحکام کے ہمیں دو بڑے میلاناتی دھارے نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ جاگیرداروں، نوابوں اور زمین داروں کا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انگریزوں سے چمٹا ہوا تھا اور دوسرا طبقہ تمام معاشی، سماجی اور

سیاسی خرابیوں کی جڑ انگریزوں کو سمجھتا تھا۔ اس میں علمائے دین متوسط طبقے کے لوگ شامل تھے۔ ڈاکٹر داؤد عثمانی لکھتے ہیں:

> یہ وہ دور تھا جب سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کو اخلاقی اور تہذیبی شکست وریخت کا بھی سامنا تھا۔ اخلاقی اقدار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔ مغربیت کا سیلاب تیزی سے امڈا چلا آرہا تھا اور بہت سے لوگ جدیدیت کی چکاچوند سے براہ راست متاثر ہو کر اپنی تہذیب و معاشرت میں کیڑے نکالنے لگے۔[۱۰۴]

جیسے جیسے انیسویں صدی نے آگے کی طرف سفر کیا انگریزی اقتدار کے زیر اثر تبدیلی کے اثرات واضح ہونے لگے۔ نظام تعلیم اور تعلیمی ادارے بدلنے لگے۔ عدالتی نظام اور قوانین میں ردّوبدل ہونے لگی۔ نئے سیاسی، سماجی اور مذہبی تصورات ابھرنے لگے۔ نئے حکمرانوں کے زیر اثر تبدیلی کا یہ عمل اس طرح شروع ہوا جس طرح مسلمان فاتحین کے آنے کے بعد برصغیر میں شروع ہوا تھا۔ پہلے یہ واسطہ ہندو معاشرے کو مسلمانوں کے تصورات سے پڑا۔ اب یہ دونوں قوموں (ہندو، مسلمان) کو یہ واسطہ انگریزی تصورات سے پڑا۔ جب یہ تصورات سیاسی تہذیبی سطح پر آمنے سامنے آتے ہیں تو عمل ورد عمل کے نئے تصورات ابھرتے ہیں اور پھر وہ صورت مقبول ہوتی ہے جو وقت کے تقاضوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے اور یہی انیسویں صدی کا نیا شعور تھا۔ انگریزی اقتدار نے ہندوستان کے لوگوں کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے سب سے موثر ذریعہ تعلیم سمجھا۔ پرانے نظام تعلیم کو تبدیل کرنے کی بجائے سرے سے مسترد کر دیا۔ اور ایک نیا نظام تعلیم جاری کیا۔ عیسائی مبلغین نے اپنی درس گائیں کھولی۔ اس تعلیم کا مقصد عیسائی ہندو اور مسلمان تینوں کے نزدیک جدا جدا تھا۔ عیسائیوں کے نزدیک اس تعلیم کا مقصد برصغیر کے طالب علم کو یسوع مسیح کی تعلیمات سے واقف کرانا تھا۔

لارڈ میکالے نے اسی ضمن میں لکھا ہے کہ ''مجھے واثق یقین ہے کہ اگر تعلیم کے ہمارے منصوبے قبول کر لیے گئے تو ۳۰ سال کے اندر بنگال کے طبقوں میں ایک بھی بت پرست باقی نہیں رہے گا۔''[۱۰۵]

اور ہندوؤں کے نزدیک یہ تعلیم ملازمت حاصل کر کے ملکی انتظام میں حصہ لینے کا ذریعہ تھی۔ جب کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف جلد راغب نہ ہوئے کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ان کے مذہب پر حملہ تھا۔ اس صورت حال میں مسلمان پس ماندہ ہو گئے۔

"جدید تعلیم کے حصول کے لیے مردوں کا رویہ بے لچک تھا۔ مسلمان مردوں کی حالت ابتر تھی۔ مسلمانوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر ان کے لڑکے سرکاری سکولوں میں گئے تو اپنا مذہب تبدیل کر لیں گے۔" جب کہ ۱۸۸۳ء میں ایک ایجوکیشن کمیشن نے مسلمانوں کی انگریزی تعلیم سے بے زاری اور اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کی ایک بڑی وجہ

یہ بتائی کہ مسلمانوں کے اندر نسلی غرور ماضی کی برتری کی یاد مذہبی خوف اور اسلامی تعلیم کی طرف غیر فطری لگاؤ تھا۔[۱۰۶]

رجعت پسندی اتنی عام تھی کہ عورت تو عورت مرد نے بھی جدید تعلیم کے دروازے اپنے اوپر بند کر دیئے۔ مسلمان جدید تعلیم اور خصوصاً عورتوں کی تعلیم سے خائف تھے۔ ابتدا میں مسلمان گھرانوں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم بھی کسی نہ کسی طور جاری تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ عورتوں کی تعلیم گھریلو یا خانگی زندگی کامیاب بنانے کی حد تک محدود تھی۔ لیکن انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے بعد عورت کی تعلیم خصوصاً مسلمان عورت کی تعلیم کا رواج تقریباً ختم ہو گیا۔ کم سنی کی شادی، اور پردہ کی بے جا سختیوں نے عورت کی تعلیم کے راستے اور مشکل کر دیے۔ سرسید نے اپنی مشہور کتاب اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے کہ "لوگ یقین جانتے ہیں کہ سرکاری تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں سکولوں میں آئیں، تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔"[۱۰۷]

تعلیم کا یہ حال تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا ذکر ہی کیا خواندگی برائے نام تھی اور پھر عورتوں کی تعلیم تو بہت کم تھی اور عورتوں کی اکثریت جاہل تھی۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مختلف توہمات سر اٹھانے لگے۔ عورتوں کے سماجی مرتبے میں کمی، نابالغ بچیوں کی شادی، بیواوں کی دوسری شادی پر پابندی، بیٹیوں کی پیدائش کو بدشگونی سمجھنا، ریاست میسور میں جب کسی خاندان میں بڑی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس کی ماں اپنی دو انگلیاں چھدوا لیتی، آگ پر چلنا، ستی کرنا، سب رسوم عام تھیں، عبادت کے وقت گالوں اور ہونٹوں کو لوہے یا چاندی کے تار سے بندھوانا کسی نیچ ذات والے آدمی کو اونچی ذات والے سے ملنے کے وقت جسم کے اوپر کا حصہ ننگا کر لینا، مسلمانوں میں پیر پرستی سوئم، چہلم، برسی، شادی بیاہ، کی ہندوانی رسمیں، بے جا اسراف، سوگ میں بیٹھنا عورتوں کا زیادہ مہر باندھنا بعض مہینوں کو نا مبارک سمجھا وغیرہ شامل ہیں۔

> ستی کی پہلی یادگار مدعا پردیش کے شہر سے ملتی ہے۔ ستی کے پس منظر میں عورت کی سماجی حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کی ذات اس کی شناخت ختم ہوتی جاتی ہے وہ مکمل طور پر مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے۔[۱۰۸]

ان فرسودہ رسوم کے خلاف سب سے پہلے ہندو تعلیم یافتہ طبقے نے آواز بلند کی۔ انھوں نے ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے اہل مغرب نے ہندوستان میں برتری حاصل کی اور انھوں نے اس حقیقت کو بتایا کہ ہندو سماج کی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب عورت کا گرا ہوا سماجی مرتبہ ہے۔ جب تک عورت اور مرد کے درمیان برابری کے تعلقات نہیں ہوں گے تب تک معاشرہ ترقی نہیں کرے گا۔ اس لیے ابتدائی سماجی تحریک برہمو سماج شروع کی گئی۔

اس تحریک کا بانی راجارام موہن رائے تھا۔ وہ سیاسی نظام فکر اور وسیع النظری کا حامل تھا۔ اس نے قدامت پرستی کو ختم کرنے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم تلقین کی۔ راجارام کے خیالات کی بازگشت علمی و سماجی حلقوں میں سنی جانے لگی، اس کے گرد ہم نواؤں کا ایک وسیع حلقہ جمع ہو گیا۔ ان میں مہارشی وار، کاناتھ ٹیگور برجموہن اور راج نارائن سین کو اہمیت حاصل ہے۔ تحریک میں اس بات کی خاص کوشش کی گئی کہ ہندو معاشرہ میں عورت کے لیے سماجی مقام کا تعین کیا جائے۔

انگریزی زبان کی ترویج کے لیے کلکتہ کا اینگلو ہندو مدرسہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہندوستانی کی طرف سے انگریزی علوم کی ترویج کی اولین کوشش تھی۔ انھوں نے نئے علوم کی ترویج کے لیے انگریزوں سے مفاہمت پیدا کرنے کی تدبیر بھی اختیار کی۔ یہ وہ ہی رائے عمل ہے جس پر سرسید نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد عمل کیا۔ راجا رام کے تدبر کا ایک عملی پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی ترویج اور نئے تصورات کے فروغ کے لیے بنگالی زبان میں پہلا ہفتہ وار اخبار "سمبد کمبودی" جاری کیا۔ اخبار نویسی کے میدان میں راجارام موہن رائے کا دوسرا کارنامہ فارسی کا اخبار "مراۃ الاخبار" ہے۔ یہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے جاری کیا جو انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ اخبار ہندوستانی رعایا اور انگریز حکام کے درمیان صرف اہم وسیلہ ہی نہ تھا بل کہ اس کے ذریعے راجہ صاحب نے انگریز قوم کی مشرق کی عظمت، تہذیب اور روحانیت سے بھی آگاہی بخشی اور جدید انگلستان کو ہندوستان سے روشناس کرایا۔[۱۰۹]

برہمو سماج بنیادی طور پر معاشرتی اصلاحی تحریک تھی۔ اس تحریک کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا خصوصی طور پر قدامت پرست مذہبی لوگوں سے، وہ اسے مذہبی معاملات میں مداخلت سمجھتے تھے۔ اس تحریک نے اپنے الگ عبادت خانے قائم کیے جہاں اخلاقیات کے جوہر اصلی کو نکھارنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس برہمو سماج نے کرم کانڈ کی رسموں اور پرہتوں کے ہتھکنڈوں سے عوام کو بچانے کی کوشش کی۔ راجارام موہن کے انگلستان چلے جانے کے بعد بھی اس تحریک کا شعلہ ماند نہیں پڑا۔ اس کی قیادت کیشیب چندر سین نے سنبھالی۔ اس میں عقلیت کا عنصر مزید شامل کیا۔ ویدوں کی رہنمائی کی غیر ضروری قرار دے دیا۔ زنار پرستی کے خلاف قدم اٹھایا اور نئے علوم کی بنا پر جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا۔ جمیل جالبی کہتے ہیں کہ:

> اس تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو رسم ستی پر بنگال میں پابندی لگادی گئی ، اور ۱۸۵۶ء میں ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کا قانون بھی منظور ہو گیا۔[۱۱۰]

"تاہم اس تحریک میں انتشار تب پھیلا جب کیشیب چندر سین نے اپنی بیٹی کی شادی پر قدیم رسم ورواج پر عمل کیا اسی وجہ سے اس تحریک کے سرگرم رکن آنند موہن بوس نے علیحدگی اختیار کی۔"[۱۱]

اس تحریک نے حصول مقاصد کے لیے مثبت ذرائع استعمال کیے اس کے رہنماوں نے اپنے آپ کو انسانی روپ میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی توہم پرست عوام نے ان شخصیت کے گرد تقدس کا کوئی بھی روشن ہالہ قائم نہیں کیا اور اسی وجہ سے برہمو سماج راسخ العقیدہ، ہندوؤں میں مقبول نہ ہو سکی۔ اس کا دائرہ عمل علاقائی حدود سے آگے تجاوز نہ کر سکا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان جو ہمیشہ نئی تحریکیوں کے ساتھ چلنے پر آمادہ رہتا تھا۔ وہ بھی برہمو سماج سے آشنائی پیدا نہ کر سکا۔ اس طرح اس کے اثرات جنوبی ہند تک ہی محدود رہے اور اس میں وہی لوگ شامل رہے جو خدائے واحد کی ذات پر ایمان رکھتے تھے اور بُت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

> راجارام موہن رائے کی ذات علم وروشنی کا ماخذ تھی اور برہمو سماج نے ہندوستان کی مفلسی اور غلامی کو دور کرنے کے لیے مثبت کام سرانجام دیا۔۔۔۔ اس تحریک کی جہت مستقبل کی طرف تھی تاہم اس تحریک نے تخلیقی سطح پر کسی نئے افق کو سر نہیں کیا۔ اس کی بنیادی عطایہ ہے کہ اس تحریک نے نئے سائنسی علوم کی ترویج ہندوستانی معاشرے میں کی اور انھیں جدیدیت کی طرف قدم بڑھانے پر آمادہ کیا۔[۱۲]

برہمو سماج نے جس آزاد خیالی کو فروغ دیا تھا اس نے مذہب پرستی پر شدید ضرب لگائی تھی اور معاشرے میں جدیدیت اور اعتدال پسندی کا رجحان پیدا کیا تھا۔ اس تحریک کے خلاف شدید رد عمل پیدا ہوا۔ ویدوں کے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی بھرپور کوشش کی گئی اس رد عمل کا مقصد ہندو مذہب کی قدیم روح کا احیا اور نئے نظام کو اس روح کے مطابق تبدیل کرنا تھا۔ اس رجحان اور زاویے نے نئی ہندوستانی قومیت پیدا کی۔ چناں چہ انگریزی حکومت جتنا تسلط مضبوط کرتی گئی اتنا ہی ہندو قدیم مذہب کا احیا میں سنجیدگی اختیار کرتے گئے ان میں دیانند سرسوتی کی آریا سماج تحریک کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ہندومت کے ماضی سے راہنمائی حاصل کی اور قدیم تحریروں کو مستقبل کے لیے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک ہٹ دھرم اور عقیدہ پرست مزاج کی تحریک تھی۔ اس نے تدبر کی بجائے جبر اور عقل کی بجائے جوش کو استعمال کر کے مذہبی مقاصد کی تکمیل کرنے کی سعی کی۔

آریا سماج کے بانی نے زندگی کے اولین پندرہ سال علم کے حصول میں سچے پرہم چاری کی طرح گزرے۔ انھوں نے آخری عمر میں سنیاس لے لیا۔ والد نے گھر بار کی ذمہ داری سونپنے کی کوشش کی تو گھر بار چھوڑ کر سادھو بن گے۔ اس لحاظ سے ان کی نجی زندگی اعتدال کا نمونہ نظر نہیں آتی۔ دیانند کی تحریک ایفائے عہد کا عملی

ثبوت تھی۔ اس نے یہ پیمان باندھا تھا کہ وہ عمر بھر مورتی کھنڈوں کا جھنڈا اٹھائے گا اس نے نصب العین کا منظم طریقے سے پیش کرنے کے لیے ۱۸۷۵ء میں آریا سماج قائم کر کے عوام تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے سنسکرت کے بجائے ہندی میں اس کا پرچار شروع کر دیا۔[۱۱۳]

اس زمانے میں دیانند نے آریا سماج کا عہد نامہ ''ستار تھ پرکاش'' لکھا ہے اور ویدوں کے خاص دھرم کے موید ہو گئے۔ آریا سماج کا نصب العین پرانے زمانے کی طرف لوٹنا، ہندومت سے بچھڑے لوگوں کو پھر سے ہندومت کی طرف راغب کرنا تھا۔ یہ ایک احیائے مذہب کی تحریک تھی۔ اس کی جہت ماضی کی طرف تھی۔ اس کا مزاج آتشی گلابی تھا اور اس تحریک نے قدیم ہندو تہذیب کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے سامنے نئے علوم کا چراغ نہ جلنے دیا۔ اس نے عقل سلیم کو ماضی کے شان دار کارناموں سے ڈھانپ دیا۔ دیانند نے ہندی کو ہندوؤں کی مذہبی زبان قرار دیا۔ آریہ سماج کے نزدیک ہندی زبان کا فروغ ہندوؤں کی مذہبی فریضہ تھا۔ اس تحریک نے سیاست میں بھی ہندوستانی تہذیب، ہندومت اور ہندوستانی قومیت کی آواز کو اٹھایا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو بدیشی شمار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ہندو قوم میں غلط قسم کے احساس تفاخر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنے مقلدین کو رزم آرائی اور انسانی نفرت کا سبق دیا۔ چناں چہ ہندوستان میں جارحیت کا فروغ آریا سماج تحریک کا بالواسطہ نتیجہ نظر آتا ہے۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اس تحریک کے خلاف رد عمل پیدا ہو گیا۔ اسے نئے علوم کے راستے میں رکاوٹ تصور کیا جائے گا۔ اس کا طریقہ تبلیغ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس نے صرف درمیانی اور نچلے طبقے کے ہندوؤں کو بطور خاص متاثر کیا۔

تاہم آریا سماج تحریک برصغیر کی ایک خاص فعال تحریک تھی۔ اس میں ہندوؤں کے مشہور لیڈر شامل تھے۔ جیسے کے پنڈت شردھارام، بال گنگا، مدہن مون مالویہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک کے اثرات بیسویں صدی میں بھی مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔

ہندوؤں کی نسبت مسلمان دیر سے جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے تعلیمی بے داری کا آغاز سر سید احمد خان اور ان کے رفقانے کیا۔ اس مساعی سے پچاس سال قبل راجارام موہن جدید تعلیم کی تحریک شروع کر چکے تھے۔ جب کہ مسلمان پچاس سال بعد بھی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ تعلیم کے نام پر صرف مدرسے یا دوسرے مقامی مکاتب تھے۔ جہاں کی فضا پر صرف مذہبیت چھائی ہوئی تھی۔ نذیر احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور ان سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ شکایت تو اس کی ہے نہ پڑھایا نہ پڑھنے دیا۔''[۱۱۴]

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اپنی مشہور کتاب آج کا اردو ادب میں لکھتے ہیں کہ:

> اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا ذکر ہی کیا۔۔۔ سر سید احمد خان کے زمانے تک تعلیم عورتوں کے لیے غیر ضروری تھی، بل کہ نا مناسب سمجھی جاتی تھی۔۔۔۔ معاشی نظام میں ان کی حیثیت بڑی حد تک عضو معطل کی سی تھی۔[۱۵]

اس اقتباس سے اس وقت کے تعلیمی معیار کا پتا چلتا ہے اور ساتھ ہی مولوی نذیر احمد کے اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بچے مسجد کے مولویوں کے زیر سایہ کیا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قوم کو گم راہی کے راستے پر لے جایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی پس ماندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے لڑکوں کو سرکاری سکول میں صرف اس خدشے کے تحت نہیں بھیجتے تھے مبادا کہ وہ اپنا مذہب ہی تبدیل نہ کر لیں۔ لیکن اگر وہ انھیں سکول بھیجنے پر رضامند بھی ہوتے تو ان بچوں کے لیے پہلے دینی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا۔ سکول کے سبق سے پہلے مسجد کی تعلیم ضروری تھی۔ لہذا ایک مسلمان لڑکا سکول دیر سے داخل ہوتا اور اس کو سکول پہلے ہی چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اس کے والدین کی معاشی حالت بہتر نہیں ہوا کرتی تھی۔ مسلمانوں میں اس بات کا رجحان ملتا ہے کہ وہ مسلم سماج میں اپنا ایک منفرد مقام بنا سکیں۔ نہ کہ وہ اپنے آپ کو دفتری اور دوسرے پیشہ ورانہ کاموں کے لائق بنائیں۔ لہذا کمیشن ۱۸۸۲ء۔ ۱۸۸۳ء نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں۔

۱۔ مسلمانوں کے دیسی سکولوں کی فراغ دلی کے ساتھ ہمت افزائی کی جائے۔۔

۲۔ سیکولر مضامین کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

۳۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اعلیٰ سطح پر ہمت افزائی کی جائے۔

کمیشن کی تجاویز پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے حق میں یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ علیحدہ تعلیم حاصل کریں۔ اس سے ان کے اندر علیحدگی پسندی کے رجحانات کو فروغ ملے گا لہذا حکومت کو چاہیے کہ ان رجحانات کو تقویت دینے کے بجائے انھیں کچلا جائے اور ایک قوم کے ساتھ ایک کوئی مخصوص ہم دردی دوسرے اقوام کی نفرت کا باعث ہو سکتی ہے۔

حکومت نے لوگوں کی اس نکتہ چینی کے جواب میں ایک سرکولر جاری کیا جس میں کہا گیا کہ کمیشن نے لبرل اقدامات اس لیے کیے ہیں تا کہ مسلمان جو پس ماندہ ہو گئے ہیں دیگر اقوام کے ساتھ کھڑے ہو سکیں۔

۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن نے مقامی حکومتوں کی رپورٹوں کا جائزہ لیا تو وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ مسلمان جدید تعلیم کو نظر انداز کر کے دیگر قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور ترقی نہ کر سکے۔ کمیشن کی رپورٹوں کے نتیجے میں مقامی حکومت نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایسے اقدامات کیے جس سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان

پیدا ہو۔ دوسری طرف روشن خیال مسلمانوں نے مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی تحریکیں شروع کیں۔ جن میں سر سید احمد خان کی علی گڑھ، کلکتہ کے نواب عبد الطیف کی محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی بدر الدین طیب جی کی "بدر اسلام" نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لیے بڑے پیمانے پر عملی جدوجہد شروع کی۔[۱۱۶]

سر سید کی تعلیم تحریک کے حوالے سے جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> سر سید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوشش مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیے یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کرنے کے بغیر قومیت کی تعمیر میں قابل قدر حصہ نہ لے سکتے تھے۔ بل کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جاتے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے مضبوط۔[۱۱۷]

سر سید تعلیم کو خاص و عام سب کے لیے ضروری بتاتے تھے وہ تعلیم کو چھ حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ پہلی قسم ان لوگوں کی تھی جو سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے خیال سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے، دوسرے وہ جو ملازمتوں کے متلاشی نہیں بل کہ تجارت و صنعت کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے تھے، تیسرے زمین دار اور جاگیر دار تھے۔ چوتھی جماعت ان لوگوں کی تھی جو تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرنے کے خواہش مند تھے۔ پانچواں گروپ ان لوگوں کا تھا جو علم دین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چھٹی قسم ان عوام الناس کی تھی جن کے لیے تعلیم حاصل کرنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے روزمرہ کے کام کو اچھی طرح انجام دیں سکیں۔[۱۱۸]

غرض کے سر سید نے ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت کے غار سے نکال کر علم و فنون کی روشنی سے منور کرنا چاہا۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے پر راضی نہ ہوں گے تو منتخب کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرایا۔ اس غرض کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ان کے نزدیک بے علمی ایک بیماری ہے جو بہت سی نئی بیماریوں جو جنم دیتی ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> بے علمی مفلسی کی ماں ہے، جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آجاتی ہے۔۔۔ اپنی قوم کے حال پر غور کروں تو یہ بد بخت دن ان پر آگئے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرض داری اور ذلت چھا گئی ہے۔[۱۱۹]

تعلیم کے بارے میں سر سید نے ایک اور جگہ اپنی تقریر میں کہا کہ

> اے دوستوں ہماری پوری تعلیم اس وقت ہو گی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوں گی۔۔۔۔

ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں کے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلا دے گئیں۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں میں اور کلمہ لا اللہ الا اللہ کا تاج سر پر۔ [۱۲۰]

سر سید نے تعلیمِ نسواں کا ذکر بھی اپنی کئی تقاریر میں کیا ہے۔ ان کا یہ موقف تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے عام سکول بنانے کو جہاں کے عام لڑکیاں نجانے کس قوم و خاندان کی ہیں۔ چادر یا برقع اور ڈھ کر ڈولی میں بیٹھا کر بھیجی جاویں مجھے پسند نہیں معلوم نہیں کہ کیسی لڑکیاں ہوں گی اور ان کا طرز کیسا ہو گا میں یہ کہتا ہوں اشراف لوگ جمع ہو کر لڑکیوں کی تعلیم کا کچھ ایسا بند وبست کریں۔ جو پچھلی تعلیم کی نظیر ہو وہ جو پہلے زمانوں میں ہوا کرتی تھی۔ اگر ان کی اس بات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکیوں کو وہی پرانی تعلیم دلوانے کے حق میں تھے جو ان کی نانی، دادیوں کے پاس تھی۔ اور دوسری یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے عام عورت کی تعلیم کی بات ہی نہیں کہ بل کہ انھوں نے تو اچھے خاندان کی عورتوں کی تعلیم کی بات کی ہے۔ ایک انداز کے مطابق یہ کہ دنیا کہ کہ سر سید جدید تعلیم، عورتوں میں بھی دیکھنا تو چاہتے تھے لیکن زمانے کے حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کھل کر عورت کی جدید تعلیم کی بات کرتے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے دبے الفاظ میں عورتوں کے لیے جدید تعلیم کا ہونا ضروری قرار دیا۔ جیسا کہ لکھتے ہیں:

۔۔۔ لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کی تعلیم پر اس لیے زیادہ زور دیا ہے کہ ہم لڑکوں کی تعلیم کو لڑکیوں کی تعلیم کی بنیاد تصور کرتے تھے۔ [۱۲۱]

۱۸۹۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے سالانہ اجلاس میں سر سید احمد خان نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ

میرے دوست منشی سراج الدین صاحب نے کئی مرتبہ یہ بیان کیا ہے کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف ہوں ان سب کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات غلط ہے۔۔۔ میں مردوں کی تعلیم کے لیے اس لیے کوشش کر رہا ہوں کہ جب وہ تعلیم یافتہ ہوں جائیں گے تو بیویوں اور بچیوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔ [۱۲۲]

سر سید عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے بل کہ وہ عورتوں کو چھوٹے چھوٹے مسائل بتا کر تعلیم دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی ایک تقریر جس کا عنوان ''ہندوستان کی عورتوں کی حالت'' میں بتایا کہ ان پڑھ عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ ان میں عقلی شعور ناقص ہوتا ہے۔ انھیں ایک ایسے پرندے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جو کسی قفس میں گرفتار ہو گیا اور اڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ عورتیں اپنے ذہن کے تغیرات کو موت و حیات کا باعث سمجھتی ہیں۔

وہ امراض کو بھوت اور آسیب کا اثر سمجھتی ہیں اور وہ اس پر عقلانہ طور پر توجہ دینے کی بجائے جھاڑ پھونک اور نذر و نیاز سے کام لیتی ہیں، ضرورت بشری میں اصل تدبیر کو چھوڑ کر شور و غل اور منت و سماجت سے کام لیتی ہیں اگر ان کے گھر کوئی زچہ ہو تو ایک بے ہودہ مجمع سے اسے گھیر کر اپنی معمولی رسموں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور جو صدمے اس زچہ پر ان بے ہودہ رسموں سے ہو اس کی قطعاً پروا نہیں کرتیں اور اگر کوئی عاقل ان کو زچہ کی حالت پر رحم کر دفعہ کرنا چاہے تو قیامت تک اس کو نہیں مانتی۔ دوا اور غذا میں ہرگز کسی ڈاکٹر کی مداخلت پسند نہیں کرتی ہیں۔ بل کہ اپنے پرانے دستوروں کے مطابق کام کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مردوں کی حسن معاشرت اور اعلیٰ انتظام خانہ داری کی کوشش بالکل رائیگاں جاتی ہے۔ ان کا جاہلانہ اصرار مردوں کی تدبیر پر غالب آجاتا ہے۔ اور ان کی سخت پابندی کے جو امور خاص عورتوں کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان میں مردوں کو دخل نہیں ہے۔ [۱۲۳]

جب کہ سرسید کے مغربی عورتوں کے بارے میں خیالات ان کی اس بات سے واضح ہوتے ہیں کہ یورپی عورتیں نہایت خوبی اور صفائی سے رہتی ہیں نفیس نفیس لباس پہنے ہوئے پھرتی ہیں بات چیت میں تہذیب و شائستگی ہوتی ہے۔ ان کا لباس، کھانا، اور کھانے کے برتن پاک صاف اجلے اور درست دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی بھیڑ میں ہندوستانی عورت کی حالت تباہ گن لگتی ہے۔ مہذب اور غیر مہذب قوموں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کسی مہذب قوم میں کوئی نقص نہ ہو البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی بھلائیاں برائیوں پر غالب ہوتی ہیں مگر نامہذب قوم میں برائیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سرسید ''سفر نامہ پنجاب'' میں لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> اے میری بہنوں۔۔۔ مجھ کو مخالفت ہے اس طریقہ سے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیشن مائل ہیں۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرو۔۔۔ اور کوئی بھی تعلیم دنیا میں ایسی نہیں ہے۔ جس میں مردوں کی حالت درست ہوں گی تو عورت کی حالت صحیح نہ ہوں گی۔۔۔ میری خدمت لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔ [۱۲۴]

درج بالا آرا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرسید احمد خاں عورتوں کی تعلیم جدید کے حوالے سے متضاد کیفیایات کا شکار تھے۔ وہ پوری طرح سے جدید تعلیم عورتوں میں رائج کرنے کے حامی نہیں تھے تو اس کا اظہار کھل کر نہیں کیا۔ ایک مبہم سا اظہار تھا جو ان کے تمام بیانات میں ملتا ہے۔ سرسید کے نظریات سے ایک اور بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ عورتوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینا ان کے نزدیک عورتوں میں بے پردگی کو پھیلانا تھا۔

سرسید کی اس سوچ کے ضمن میں اقبال کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن اقبال کے خیالات وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے حوالے سے مسلسل ارتقا پزید رہے اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

اگر عورت اپنے حقوق کی حفاظت پر پورے طور پر آمادہ ہو جائے اور وہ حقوق جو شریعت اسلام نے عورت کو دے رکھے ہیں آپ مردوں سے لے کر رہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ مرد کی زندگی تلخ ہو جائے گی ۔۔۔ جہاں تک شریعت اسلامی کا تعلق ہے۔ مسلمان عورتیں یہ شکایت نہیں کر سکتیں کہ انھیں شریعت نے حقوق نہیں دیے یا جو دیے ہیں وہ ایسے ہیں جن سے انھیں مساوات کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، ہر وہ حق جس کا عورت انصاف و عقل کے ساتھ مطالبہ کرے وہ قرآن پاک نے اسے دیا ہے اگر وہ خود غافل رہے اور اس سے فائدہ نہ اٹھائیں حاصل کرنے پر اصرار نہ کریں تو یہ قرآن یا شریعت اسلامی کا قصور نہیں۔ [۱۲۵]

ان سطور میں یہ الفاظ اقبال کے ہیں اوران میں اقبال کی جو شخصیت عورت کے حوالے سے ابھرتی ہے وہ اس سے قطعاً مختلف ہے جو عموماً پیش کی جاتی ہے۔ عام طور پر اقبال کو حقوق نسواں کے حوالے سے قدامت پرست خیال کیا جاتا ہے بعض مفکرین کے نزدیک وہ ایسا شاعر و مفکر ہے جو عورتوں کی دینی تعلیم اور امور خانہ داری میں روایتی شرکت کا تو حامی ہے لیکن سماجی معاشی تحرک کے خلاف ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بیشتر محققین اور ناقدین نے اقبال کی ایسی ہی تصویر پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں یا تو اقبال کی سچی فکر کو سمجھا ہی نہیں یا پھر ذاتی تعصبات کے تحت اقبال کے افکار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، کچھ ناقدین کی نظریں اقبال کی انقلابی فکری روح تک پہنچتی ہیں لیکن انھوں نے ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور اگر اظہار کیا بھی ہے تو نہایت سرسری سا۔ اس سے زیادہ المیہ یہ ہے کہ اقبال پر ایک رجعت پسند، تنگ نظر اور ملائی ذہنیت کا غلاف چڑھایا گیا ہے۔ چناں چہ آج نئی نسل کے سامنے اقبال اک ایسے فکر کی صورت میں موجود ہیں جن کے ہاں تحریک آزادی نسواں یا عورتوں کی آزادی اور مساوات کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نئی نسل یہ کہتی ہے کہ اقبال کو پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ جب کہ اقبال کا عرصہ زمانہ دار (۱۹۳۸ء۔ ۱۹۷۷ء) تانیثیت کی تحریک کے عروج کا زمانہ ہے۔ اگر تانیثیت کی تحریک کو لہروں کی صورت میں دیکھا جائے تو، تو یہ پہلی لہر کا دور ہے۔ یہ دور خاصا شدت پسند تھا۔ تحریک کے حامی گرجوں، سرکاری عمارتوں کی چلانے پر آمادہ تھے تو دوسری طرف پر تشدد حملوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ۱۹۰۶ء۔ ۱۹۱۳ء کے درمیان خواتین کو ووٹ دینے کا حق کے مطلق کئی مرتبہ قوانین بنانے کی کوشش کی گئی اور ہر مرتبہ یہ کوشش ناکام ہوئی۔ اس زمانے کی اقبال کی کسی بھی تحریر سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ تحریک نسواں سے کس حد تک شاکی تھے اور اُسے کس نظر سے دیکھتے تھے وہ خود ایک زبردستی کی شادی کے

بندھن میں بندھے تھے اپنے خط جو انھوں نے عطیہ فیضی کے نام لکھا اس میں لکھتے ہیں۔

۔۔۔ میری زندگی سخت مصیبت بنی ہوئی ہے میرے والد مجھ پر زبردستی بیوی مندھ دینا چاہتے ہیں میں

نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انھیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق حاصل نہیں میں اس کی کفالت کرنے کے لیے بالکل رضامند ہوں لیکن اسے ساتھ رکھ کر زندگی کو اجیرن نہیں بنانا چاہتا۔۔۔ اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کر دے تو میں کھلم کھلا اس کا مقابلہ کروں گا۔[۱۲۶]

اس اقتباس سے سماجی رسوم کو جلا دینے اور ان پر خاک ڈالنے کا ارادہ اور معاشرہ سے بغاوت کو خواہش جھلکتی ہے۔ اس سے یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اقبال تمدنی زندگی سے سخت عاجز تھے اور وہ سوسائٹی کو ان کی مرضی اور مسرت سے جینے کا حق دلانا چاہتے تھے۔ وہ مرد و عورت کے زبردستی کے رشتے کے قائل نہ تھے۔

انھوں نے اپنے ایک مضمون میں نارضامندیوں کی شادی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ منگنی کے بعد فریقین ایک دوسرے سے ملیں ایک دوسرے کی عادات و مزاج کا مطالعہ کریں اگر ان کے خیالات مختلف ہو تو یہ معاہدہ دونوں اپنی خواہش سے ختم کر دیں یہ خیالات ان کے یورپ جانے سے پہلے کے ہیں اس دوران وہ مغربی دستور ''کورٹ شپ'' کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ دستور نہایت ہی مفید ہو سکتا ہے اقبال کا یہ رائے پیش کرنا ایک جرات آمیز کام تھا۔ اس سے ان کی ذہنی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے خاص طور پر اس تناظر میں کہ ان کی اپنی زندگی ناپسند کی۔ شادی سے تلخ ہو چکی تھی اور وہ شدید ذہنی کش مکش کا شکار تھے ہندوستان کے سماجی ماحول میں شادیوں کے دستور فرد کی انفرادی ذہنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر خاندانی ضروریات کو اولین ترجیح دینے والے تھے۔ اس معاشرے میں کچھ قیود تھی جو ان قیود کو توڑنے کی کوشش کرتا ایسا شدید ٹکراؤ ہوتا کہ فرد کی مسرت کا امکان معدود ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے خود کے لیے اسی معاشرتی طرز عمل کو ترجیح دی۔ جاوید اقبال کے اسی رویے کی ترجیح پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اقبال اگرچہ چاہتے تو کسی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ خاتون سے شادی کر سکتے تھے۔ مگر روشن خیال ہونے کے باوجود وہ بعض معاملات میں روایتی قدامت پسندی کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔۔۔ ان کی تلاش کوئی ایسی خاتون تھی جو ان کی بیوی کی حیثیت سے ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ گہرا تعلق اور وابستگی قائم رکھ سکے۔[۱۲۷]

ایک اور اہم بات اقبال کے یورپ جانے سے پہلے کی ہے کہ وہ عورت کے پردے کے بارے میں قدرے تحفظات کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پردے کو ترک کر دینا قوم کے لیے نہایت مضر ہو گا۔ وہ پردے کو شریعت کا مقصود بالذات حکم نہیں سمجھتے تھے بل کہ اقوام کی سماجی، تمدنی اور اخلاقی صورت حال کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ اس اہم موضوع پر اقبال کے بعد کے ادوار میں زیادہ بحث نہیں ملتی ہے۔ البتہ ان کے ملفوظات میں ایسے اشارے میں مل جاتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال پردے کی پابندی کے حامی تھے۔ لیکن وہی اقبال جنھوں

نے مغربی دستور "کورٹ شپ" کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ سفر یورپ کے بعد بیگم راس مسعود سے محبت یا پسند یا رضامندی کی شادی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ''شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔''[۱۲۸]

جب کہ اقبال ازدواجی تعلق میں ذہنی ہم آہنگی کو پسند بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ سر راس مسعود اور ان کی بیگم کے درمیان اور اپنے استاد آرنلڈ اور ان کی بیوی کے درمیان محبت و رفاقت سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں لکھی جانے والی ڈائری کے اندراجات میں تعلیم نسواں کے متعلق اقبال لکھتے ہیں کہ:

> میں آزاد تعلیم کا قائل نہیں تعلیم بھی دیگر امور کی طرح ضروریات کے تابع ہوئی ہے۔ ہمارے مقاصد کے پیش نظر مسلم بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے ایسے تمام مضامین جس میں عورت میں نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے نصاب سے خارج کر دیے جائیں۔[۱۲۹]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال تعلیم نسواں کے مخالف نظر نہیں آتے بل کہ اس نام نہاد آزادی کے خلاف ہیں جو عورت کو تعلیم کے نام دی جاتی ہے۔ اس اقتباس پر اٹھانے جانے والے اور بھی کئی سوالات زیر بحث ہیں کہ کون سے مضامین ہیں جن سے عورت نسوانیت اور دین سے محروم ہو جاتی ہے اور مردوں کا دین ان سے محفوظ رہتا ہے یا وہ کون سے اوصاف ہیں جو عورت کی نسوانیت کی علامت ہیں۔ اقبال کا یہ کہنا کہ تعلیم قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ اس امر کی عکاسی ہے کہ خواتین کی تعلیم کا نصاب ہر دور میں قومی ضروریات کے تحت تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ شریعت کی رو سے جائز ہے۔ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ عہد حاضر میں خواتین کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی جتنی ضرورت ہے اس سے قبل کبھی نہ تھی۔ ہر شعبۂ زندگی میں خواتین کی شمولیت ناگزیر ہے۔ اگر مجموعی طور پر عورتوں کی تعلیم کو خانگی امور سے مشروط کر دیا جائے تو تمدنی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو سکتا ہے۔[۱۳۰]

عزیز احمد فکر اقبال کا تجزیہ مختلف انداز میں کرتے ہوئے یہ نتائج اخذ کرتے ہیں کہ اقبال عورتوں کے لیے بے حد کم آزادی کے قائل ہیں۔ اقبال بڑی شدت سے قدامت پرستی اور روایت پرستی پر قائم ہیں ان کی تعلیم پرانی قدامت پرست تعلیم ہے اور انھوں نے عورت کو بالکل مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔[۱۳۱]

اقبال کی مختلف تخلیقات مثلاً ''قومی زندگی'' ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' ''خودی از عشق و محبت'' ''نوائے طاہرہ'' ''فلک فخر'' پیام مشرق'' کی نظم اور ''دختران ملت'' وغیرہ کا اجتماعی و ارتقائی مطالعہ اقبال کے خیالات کی ایک مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ تصویر عزیز احمد کے درجہ بالا تجزیہ سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے درست نتائج تک پہنچنے کے لیے فکر اقبال کا ارتقائی مطالعہ ضروری ہے اقبال نے دیگر تصورات کی طرح عورت کے

حوالے سے بھی ذہنی ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔

''قومی زندگی'' ان کا پہلا مضمون ہے جو ۱۹۰۴ء میں مخزن میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ان کے یورپ جانے سے پہلے لکھا گیا اس میں وہ عورت کی تعلیم پر خاص توجہ مرکوز کرتے ہیں اور اسے قومی ترقی کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ مگر عورتوں کی کیسی تعلیم دینی چاہیے اس بارے میں وہ کسی قابل عمل نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

> اس ضمن میں غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص میں قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے۔ مگر چونکہ اب تک کسی قابل عمل نتیجے تک نہیں پہنچا۔ اس واسطے فی الحال میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ [۱۳۲]

جب کہ یورپ سے واپسی پر وہ عورت کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے مختلف انداز میں سوچنے لگے تھے۔ اب وہ ایک عام ہندوستانی عورت کی تعلیم و تربیت کے بجائے ایک مسلمان عورت کی زندگی پر غور و فکر کر رہے تھے۔ اقبال عورت کے محدود روایتی تصور سے سفر کر کے جدید آزادی کے تصورات تک پہنچ گئے تھے یہ نہیں کہ اقبال ابتدا میں تنگ نظر مولویوں کی طرح قدامت پرست تھے بل کہ وہ متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ تاہم ان کا زیادہ تر رجحان قدامت پرستی کی طرف تھا۔ مثلاً ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' (۱۹۱۰ء) میں لکھتے ہیں کہ ''میں مرد اور عورت کے مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔'' [۱۳۳] آگے چل کر ''انجمن خواتین اسلام مدارس (۱۹۲۹ء) کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ [۱۳۴]

اس واضح موقف تک اقبال ایک ارتقائی سفر کے بعد پہنچے اگر ان کی عملی زندگی پر نظر ڈالی جائے مثلاً یورپ میں رہ کر پی۔ ایچ۔ ڈی بار ایڈ لا کی ڈگری کا حصول، مغربی تہذیب و تمدن کا مشاہدہ، مغربی خواتین و مرد اساتذہ سے حصول تعلیم، عطیہ فیضی، ایما ویگے ناست سے تعلقات ان سے خط و کتابت آگے چل کر عملی سیاست کے خار زار میں حصہ جہاں مسلم خواتین پیش پیش تھیں ان سے اقبال کی ملاقاتیں خواتین کی انجمنوں سے خطاب وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اقبال تعلیم یافتہ روشن خیال شخص ہیں جو خواتین کے معاملے میں قدامت پرست نہیں ہو سکتے۔ [۱۳۵]

اقبال دور جدید کے پہلے مفکر ہیں جنھوں نے تحریک نسواں کا مطالعہ جدید سرمایہ دارانہ اور مابعد الطبیعاتی نظام کے تناظر میں کیا ہے۔ نسوانی آزادی کا وہ پہلو جو عورت کی آزادی، خودارایت، زندگی میں مرد کے روش بدوش چلنے کی آرزو، فعال معاشی و سماجی اثبات کے ساتھ وابستہ ہے اقبال اس کی تائید کرتے ہیں، لیکن دوسرا پہلو جو مغربی

استعمار کا شاخسانہ ہے جو خاندانی وحدت کو پارا پارا کر دیتا ہے۔ اور آزادی کے نام پر بے راہ روی کو فروغ دیتا ہے۔ اقبال کے
نظریات سے متصادم ہے۔

اقبال کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اسلام نے مرد و عورت میں مساوات پیدا کی ہے۔ مرد اور عورت شانہ بشانہ کام کر سکتے ہیں صرف فطری صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے حقوق و فرائض کے ضمن میں کچھ فرق کیا گیا ہے جو تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لیے ضروری ہے۔ اقبال کا منشا یہ بھی ہے کہ عورت کا ولین فریضہ یہ ہے عورت اولاد کی تعلیم و تربیت کرے۔ اس کے علاوہ وہ اگر کوئی کام کرے گی تو یہ فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی ہو گی۔

اقبال کے تمام متضاد افکار کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں ان کی آرا آزادی نسواں، تعلیم نسواں، اور پردے کے متعلق تبدیل ہوتی رہی ہیں ان کی فکر ارتقائی مراحل طے کرتی رہی ہے۔ ہم اقبال پر قدامت پرستی کی چھاپ نہیں لگا سکتے۔ ان کے ہاں اعتدال و توازن کا رویہ ہے۔ اقبال آزادی کے نام پر بے راہ روی کے قائل نہیں تھے۔ ان کا رویہ، معتدل اور لچک دار تھا۔ وہ عورت کی عظمت اہمیت اور اس کے حقوق کے قائل ہیں۔ جہاں ہمیں تعلیم نسواں کے حوالے سے کچھ شخصیات متضاد کیفیایات کا شکار نظر آتی ہیں وہی کچھ ایسے ادباء بھی ہیں جن کا بے داری شعور نسواں میں بہت اہم کردار ہے۔ ان ادبا میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ راشد الخیری، ممتاز علی اور شیخ عبد اللہ نمایاں ہیں۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ قدامت پسند اور قدیم جاگیر دارانہ قدروں کا ٹکراو مغربی تہذیب و تمدن کے یلغار سے ہوا
۔

> ان دو تمدنوں کی کشاکش نے ہندوستانی ذہن کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کر دیا۔ پرانی تہذیب کا چراغ جھلملا رہا تھا حرم، محفلیں، مشاعرے، موسیقی کے جلسے رہس اور اندر س سبھائیں رخصت ہو رہی تھیں۔ تعلیم نسواں، پردہ، وضع داری قوم، مذہب، ذات پات کے قیود سبھی نئے سانچے میں ڈھل رہے تھے۔[۱۳۶]

اس بدلے ہوئے ماحول میں ادیبون اور فن کاروں نے بھی زندگی کے مطالبے اور تقاضے کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ داستانوں کی پر کشش اور مبالغہ آرائی سے بھری ہوئی پر تکلف رومان پرور زندگی کی جگہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے پس منظر میں انسانی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول کا آغاز ان سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی کی تبدیلیوں کا رہن منت ہے۔ جن سے انیسویں صدی

کے اختتام پر ہندوستانی معاشرہ دوچار تھا۔ خواہ اس فن کا فارم مغرب سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے اردو ناول خالص ہندوستانی ماحول کی پیداوار ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے وہ مخصوص حالات تھے۔ جنھوں نے یہاں کے ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔ چناں چہ جب نذیر احمد نے اردو میں ناول نگاری کا آغاز کیا تو انھوں نے عورتوں کے لیے ناول لکھے اور ان سماجی برائیوں کو نمایاں کیا جن سے عورتیں متاثر ہو سکتی تھیں۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہی نہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے کام کرنے والے پہلے ادیب بھی ہیں۔ ان کے اولین ناول مراۃ العروس اور بنات النعش عورتوں کی تعلیم کی غرض سے ہی لکھے گئے۔

انھوں نے اپنے ناول کے ذریعہ عورت کا مثالی کردار پیش کرتے ہوئے اس کی تربیت کرنا چاہی۔ نذیر احمد سمجھتے تھے کہ عورتوں کو تعلیم نہ دلا کر ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی جاتی ہے۔ ان کے مطابق مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اپنے نسائی کرداروں کو پیش کیا۔ جو اپنی علمیت، سلیقہ مندی اور سوجھ بوجھ کے ذریعہ اپنی زندگی کو کامیاب بناتے ہیں۔

مراۃ العروس میں اصغری کا کردار نذیر احمد کے طبقہ نسواں کے متعلق انھی خیالات و تصورات کا عکاس ہے۔ چوں کہ ان کے پیش نظر اصلاح نسواں کا مقصد تھا اور جیسا نمونہ وہ قوم کی لڑکیوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ قوم کی ہر لڑکی کو اصغری کے کردار کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے کہ اسی میں عورت کی عظمت اور قوم کی بقا کا راز مضمر ہے۔ اصغری اس جہت پر پورا اترتی تھی۔ صغری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صغری خاتم بہت عقل مند، فہمیدہ اور نیک مزاج تھی چھوٹی سی عمر میں اس نے قرآن شریف کا ترجمہ، مسائل کی اردو کتابیں پڑھ لی تھی۔ لکھنے میں بھی عاجز نہیں تھی۔ گھر کا حال اپنے باپ کو ہفتے کا ہفتے لکھ بھیجا کرتی ہر ایک طرح کا کپڑا سی سکتی تھی اور انواع و اقسام کے مزہ دار کھانے پکانا جانتی تھی۔[۱۳۷]

نذیر احمد نے اصغری کا کردار کی تخلیق کے ہندوستان کے مسلم معاشرے کی خواتین کو سلیقہ، تمیز، تعلیم اور دور اندیشی اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ نذیر احمد کو اپنے عہد میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ادراک حاصل تھا۔ اگرچہ وہ خود پرانی اقداد اور وضع کے آدمی تھے مگر بدلتے ہوئے نظام اور عہد جدید کی تبدیلیوں کو بھی نہ صرف دیکھ رہے تھے۔ بل کہ قبول بھی کر رہے تھے۔ انھوں نے اس معاشرے اور ماحول کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ جو بنیادی طور پر ایک روایت پرست معاشرہ تھا۔ جس میں پرانی اقدار کو حرزِ جاں بنا رکھا تھا۔ بالخصوص خواتین کے معاملے میں ابھی تک فرسودہ خیالات کا حامل تھا۔ مسلم متوسط طبقے میں پردے کا رواج تھا۔ نذیر احمد اگرچہ عورتوں

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عورتوں پر کچھ اس طرح کی سختی اور قید ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ آٹھ آٹھ دس دس برس کی بیاہی ہوئی اور تین تین چار چار بچوں کی مائیں۔ مگر گھونگھٹ چڑھا ہوا ہے۔ بات چیت سے معذور، گفت و شنید سے محروم، غرضے کہ شرعی پردہ داری کے ساتھ جو آزادی عورتوں کو حاصل ہونی چاہیے، دیہات میں میسر نہیں۔ غلامی کی حالت میں بے چاریوں کی زندگی بسر ہوئی ہے۔[۱۳۸]

اسلام نے عورت کو جہاں اور بہت سے حقوق فراہم کرتے ہوئے اسے تقدس کا درجہ دیا وہی اسے نہ صرف شادی بیاہ جیسے اہم معاملے میں اسے اظہار رائے کی آزادی فراہم کی بل کہ خلع کا حق اور عقد ثانی کی اجازت بھی دی۔ لیکن برصغیر کے روایت پرست معاشرے نے عورت کو ان تمام حقوق سے محروم کر دیا۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جابجا عورتوں پر ہونے والی اس زیارتی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ بنات النعش میں ضمنی حکایتوں کی ذیل میں بڑے موثر انداز میں بیان عرب عورتوں کی آزادی کے مقابلے میں ہندوستانی عورتوں کی حق تلفیوں کا ذکر کیا۔ ایک میم صاحبہ کی زبانی طنزیہ انداز میں کہلوایا کہ:

ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضامندی سے ہوتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضامندی آپ لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھتی ہوں کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔[۱۳۹]

اسی طرح اپنے ناول ایامیٰ میں بھی نذیر احمد نے ایک بیوہ عورت کی زندگی کو کہانی کے روپ میں پیش کر کے بیوہ کے کردار و غم اور معاشرے کی لغو رسموں کو نشانہ تنقید بنایا۔ یہ اردو زبان کا پہلا ناول ہے جو بیواؤں کے موضوع پر لکھا گیا۔

ناول کی ہیروئن ''آزادی بیگم'' شادی کے دو برس بعد ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ چوں کہ عام مسلمان گھرانوں میں اس وقت بیوہ کی شادی کو اچھی نظر نہیں جاتا تھا جس کا اظہار آزادی بیگم بستر مرگ پر اس طرح کرتی ہے۔ "جب جب نکاح کا خیال آیا تب تب ارادہ ہوا۔ اور جب جب ارادہ ہوا۔ رسم و رواج نے سب منصوبے غلط کر دیئے۔۔۔۔"[۱۴۰]

نذیر احمد کے تمام ناولوں کا مقصد انسانی سماج کی صلاح اور عورتوں کی اصلاح تھی۔ یہ تعلیم نسواں پر زور دیتے ہیں اور عورت کو کامیاب زندگی گزارنے کے گر سکھاتے ہیں۔ بنات النعش میں حسن آرا کی تربیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

حسن آرا مکتب میں بیٹھی تو گیارہ برس میں تھی۔ جب اس کو خیر سے چودہ برس لگا تو۔۔۔۔ اس عرصہ میں حسن آرا نے سارا قرآن شریف پڑھا۔ چوں کہ دو سپارے روز تلاوت کا معمول تھا۔ ایسا یاد تھا گویا

حفظ ہے۔ اردو بے تکان اور بے تکلف لکھتی پڑھتی ہے۔۔۔ قرآن کا ترجمہ اور کنز المعلیٰ، قیامت نامہ، راہ نجات، وفات نامہ، قصہ شاہ روم، قصہ سپاہی زادہ، معجزہ، شاہ یمن، رسالہ و مولد شریف، مشارق الانوار، اتنی تو مذہبی کتابیں اس کے نظر سے گزر گئیں۔ اور ان کے علاوہ حساب ضروری قاعدہ کسر تک اور ہندوستان کا جغرافیہ، ہندوستان کی تاریخ، چند پند، منتخب الحکایات، مراۃ العروس، سب کچھ پڑھ کر فارغ ہو گئی۔ اردو کے اخبار بے تامل پڑھ کر سمجھ لیا کرتی تھی، اور پڑھنے لکھنے کے علاوہ خانہ داری کے جو ہنر عورتوں کو درکار ہیں۔ سب اس نے حاصل کیے اور معلومات مفید کا اتنا ذخیرہ اس نے فراہم کیا کہ وہ اس کو تمام عمر کی آسائش اور مسرت کے لیے کافی تھا۔[۱۴۱]

نذیر احمد کے پیش کردہ کرداروں میں کہیں کہیں نسائی حسیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن نذیر احمد کا تعلیمی نقطہ نظر اس عہد کی مسلم خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کے نظریہ کو واضح کرتا ہے۔ انھوں نے عورت کی اصلاح تو چاہی مگر اس انداز میں جس طرح مردانہ سماج اسے دیکھنا چاہتا ہے۔

نذیر احمد کے ناول اصلاحی مقاصد کے حامل تھے جن کا چرچا پورے ہندوستان میں ہونے لگا۔ جس سے اس دور کے دیگر ادیب بھی بہت متاثر ہوئے اور نذیر احمد کی طرز پر قلم اٹھایا۔ انھی میں سے ایک حالی بھی ہیں۔ جھنوں نے نذیر احمد کے نتتبع میں اپنا قصہ مجالس النساء تحریر کیا۔ حالی نے یہ قصہ خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے تحریر کیا۔ اگرچہ یہ ناول کی فنی خصوصیات پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن اپنے سماجی شعور اور نسائی حسیّت کی بدولت اسے ناول کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ معاشرتی و اخلاقی سدھار کے لیے لکھا گیا یہ ناول ۱۸۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔ جو نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ان نو مجالس میں تہذیبی زندگی کے حوالے سے عورتوں کے لیے سیکھنے کی باتیں ہیں۔ مثلاً بچوں کی تعلیم و تربیت، عورتوں کی توہم پرستی، غلط رسومات و عقائد۔ گھریلو اور دیگر معاشرتی زندگی کے روابط و مراسم کا حالی نے گہرائی

سے اور اصلاحی انداز سے جائزہ لیا ہے۔ بچوں کی تربیت کے حوالے سے اپنی ناول ''مجالس النساء'' میں لکھتے ہیں:

کسی نے خوب کہا ہے بچہ کو پیار کرنا ایسا ہے جیسے کھیتی کو پانی دینا۔ جس طرح پانی کی طغیانی کھیتی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ پیار بچہ کو خراب کر دیتا ہے۔[۱۴۲]

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے حالی نے مجالس نے ہر باب میں ان تمام اچھائیوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو اصلاح نسواں میں معاون ثابت ہو سکے۔ ناول کا مرکزی موضوع زبیدہ بیگم اور اس کے لڑکے سید عباس کی تعلیم و تربیت ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے حالی نے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص عورت کے لیے علم کی اہمیت و ضرورت کو باب اول میں آتو جی کی زبانی یوں واضح کروایا۔

اے بوا: بچوں کی مائیں اگر اس قابل ہوں کہ اپنے بچوں کو آپ تعلیم کر لیا کریں تو اس ملک کے دن ہی نہ پھر جائیں۔ [۱۴۳]

حالی کی اس کتاب میں کہانی پن کم ہے اور مکالمہ نگاری زیادہ ہے۔ باب اول میں آتو جی، محمودہ بیگم اور مریم بیگم کا مکالمہ ہے۔ آتو جی کے کردار کے ذریعے حالی نے ہندوستانی معاشرے کی اس سوچ کی عکاسی کی ہے کہ لوگ لڑکوں کو پڑھانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آتو جی

کا درج ذیل بیان اسی ہندوستانی ذہنیت کا عکاس ہے۔

ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں نے لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھا اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانا اس لیے گوارا کیا کہ وہ ان کو لے کر کھلائیں گے۔ اس لیے لڑکیوں نے بھی تعلیم میں دل چسپی نہیں دکھائی۔ [۱۴۴]

تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہندوستانی مسلم عورت جاہل رہ گئی اور غلط رسوم و رواج کی پیروکار بن گئی۔ ناول کا کردار زبیدہ خاتون اپنی تربیت کے احوال کے ضمن میں اس عہد کی ایسی ہی ناخواندہ عورتوں کی غلط رسوم اور توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ انھوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا تھا۔ جس کا ذکر نہ قرآن میں تھا نہ حدیث میں اور اس پر وہ بڑی سختی سے نہ صرف عمل پیرا تھی بل کہ اپنے ان خیالات کی پرچارک بھی تھی۔

۔۔۔ کہا۔ بیٹا کیا تم نے ان کے مسئلے نہیں سنے؟ سچ ہے تم کہاں سنتیں؟ اگر تمھاری ماں بھی اول دن سے تم کو یہی باتیں سکھاتی اور نماز روزہ کی جگہ انھیں باتوں کی تاکید رکھتی تو تم کو معلوم ہوتا کہ عورتوں کے دلوں میں کیا کیا ضبط سمائے ہوئے ہیں۔ [۱۴۵]

آگے چل کر طبقہ نسواں کے جہالت پر مبنی رسم و رواج کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا:

ایک بات ہو تو کہوں انھوں نے تو ہزاروں خرافات جوڑ رکھے ہیں۔ قینچی نہ بجاو۔ دو آدمیوں کے بیچ سے آگ نہ نکالو نہیں تو لڑائی ہو جائے گی چھلنی سر پر نہ رکھو نہیں تو گنج ہو جائے گا۔۔۔ جھاڑو بدن سے نہ لگنے دو نہیں تو بدن سینک سا ہو جائے گا۔۔۔ ٹھکرایا ہوا یا لانگا ہوا پانی نہ پیو بدن میں کپڑا سینے سے نسیتی آتی ہے۔ دلہن کا جوڑا سیو تو سات سہاگنوں کا ہاتھ لگالو۔۔۔ پاؤں پر پاؤں نہ دھرو نحوست آتی ہے۔۔۔ غرض اس طرح کی سینکڑوں باتیں کہاں تک بیاں کرو۔ [۱۴۶]

تعلیم و تربیت کے فقدان کے باعث عورت بری طرح سے توہم پرستی کا شکار تھی۔ جس کا ذکر حالی نے مجالس النساء میں جگہ جگہ کیا ہے:

---۔ ٹہلیانہ بجاؤ نحوست آتی ہے۔ جس نے دوسرا نکاح کیا ہو اسے بیوی کی صحنک پر نہ بٹھاؤ۔ تیسری تیرھویں، تیسویں اور آٹھویں، اٹھارویں، اٹھائیسویں یہ سب تاریخیں نحس ہیں ان میں کوئی نیا کام نہ کرو۔ بدھ کے دن سفر کو نہ جاؤ۔۔۔[۱۴۷]

مجالس النساء کا یہ باب عہد سر سید میں طبقہ نسواں میں پائی جانے والی لغو قسم کے ریت و رواج کا انسائی کلو پیڈیا معلوم ہوتا ہے۔ اس عورت سے آنے والی نسل کی بہتر تعلیم و تربیت کی توقع عبث تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری مجلس سے پانچویں مجلس تک زبیدہ خاتون کی ماں کی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنی بیٹی زبیدہ خاتون کو تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت کی غرض سے کھلونوں کا سہارا لیتی ہے کہ کھلونے انسانی جذبات کو سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

میں نے کہا اماں جان! نانی اماں نے یہ کھلونے کیوں بنوائے تھے؟ انھوں نے کہا بیٹا یہ اس لیے بنوائے تھے کہ مجھے بری باتوں سے نفرت ہو جائے اور نیک عادتیں اختیار کروں۔[۱۴۸]

زبیدہ خاتون جب پانچ سال کی ہوئیں تو انھیں استانی کے حوالے کر کے سخت نگرانی میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلائی کڑھائی اور کھانا پکانے کی ترغیب بھی دی گئی۔ اور وقتاً فوقتاً ان کی ماں ان سے تعلیم کے متعلق سوالات بھی کرتیں۔ مثلاً تم یہ بھی جانتی ہو یہ سورج روز صبح کہاں سے آتا ہے۔ اور شام کو کہاں جاتا ہے۔ اس طرح سے ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کیا جاتا۔ ناول کے دوسرے حصے میں زبیدہ خاتون کے بیٹے سید عباس کی تعلیم و تربیت کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ زبیدہ خاتون چوں کہ خود پڑھی لکھی تھی اس لیے بیٹے کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی۔ اس طرح ان دو کرداروں کی تخلیق سے حالی نے ایک اصلاحی کہانی پیش کی۔ جو نصیحتوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ لیکن ناول کے ذریعے وہ اپنے مقصد کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اگرچہ حالی نے یہ کہانی عورت ی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی اور ان رسوم و رواج میں اصلاح چاہی جو ہندوستانی مسلم معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم سے غفلت کو بطور خاص موضوع بناتے ہوئے مرد اور عورت دونوں کو برابری کی سطح پر اس کا مستحق قرار دیا۔ لیکن عورت پر مردانہ تفوق کا احساس حالی کے یہاں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اری احمقوں تم سے مردوں کا دل کیا خاک ملے؟ اول تو خدا تعالیٰ نے مردوں کی ذات ہی میں عقل و شعور تم سے زیادہ رکھا ہے۔ دوسرے پڑھنا لکھنا ان کا کام ہے۔[۱۴۹]

اور حالی نے عورت کی تعلیم و تربیت کا وہ نقشہ پیش کیا جس کو اپنا کر وہ مرد کے لیے زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون طمانیت کا باعث بنے۔ درج ذیل اقتباسات اس امر کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ "اب اگر عورت میں ایک بات اتنی

بات اور ہو کہ جو بات کہے اس کے جی لگی لگتی کہے تو پھر مرد کو اور کیا چاہیے۔"[۱۵۰] "لیکن مردوں کا مزاج پہچاننا اور ہر ایک بات ان کے مزاج کے موافق کرنی اور ان کے دل میں گھر کرنا عورت کو بغیر علم کے نہیں آسکتا۔"[۱۵۱]

تاہم اس عہد کے حالات پر کھے جائے تو حالی کا یہ ناول اس عہد کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ بلاشبہ یہ قصہ نما ناول عورتوں کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ان کے لکھنے میں مردوں نے پہل کی مگر یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی ان کا موضوع عورتوں ہی کے مسائل ہیں۔ امتہ الباری کے الفاظ میں:

> عورت کی وکالت کا جو کام نذیر احمد اور ان سے متاثر ہو کر دوسرے مردوں نے اپنایا تھا اسے عورتوں نے خود شروع کیا اور اس طرح وہ قصے سامنے آنا شروع ہوئے جنھیں ناول کی ابتدا یا خام صورت کہنا چاہیے۔[۱۵۲]

شاعری کی سطح پر دیکھیں تو حالی وہ پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں عورت حقیقی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے عورت ایک محبوبہ تھی۔ حالی کے ہاں وہ ماں، بہن، بیٹی، اور بیوی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ "مناجات بیوہ" ایک بیوہ کے معاشرتی مسائل کی بھر پور عکاسی ہے۔ اور حالی کی "چپ کی داد" کے عنوان سے نظم میں حالی، مسلم عورتوں کی تعلیمی، حالت زار، کا پورا نقشہ دردناک انداز میں پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک علامہ راشد الخیری کا تعلق ہے ان کا نام عورتوں کی اصلاح کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کے اصلاح نسواں کے جذبے نے ان کی زندگی کو تبانا کی بخشی۔ علامہ کا عہد مسلم معاشرے کی زبوں حالی کا عہد تھا۔ انھوں نے معاشرے کی اس پستی کو شدت سے محسوس کیا۔ اور پنے قلم کا پورا زور اصلاح کے لیے صرف کر دیا۔ انھوں نے کثیر تعداد میں ناول، افسانے لکھے جن کا مقصد معاشرے بالخصوص عورتوں کی اصلاح تھا۔ انھوں نے طبقہ نسواں کی الجھنوں کو تحریر کا موضوع بنایا۔ وہ مشرقی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ وہ مغرب زدگی کے سیلاب کو روکنے کے لیے عورتوں کو مشرقی تہذیب و تعلیم کی اچھائیوں سے آگاہ کرتے ہیں اور گھر کی چار دیواری کو مغربی سیلاب سے بچانے کے لیے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نذیر احمد سے جس ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ راشد الخیری نے اسی طرز کی ناول نگاری کو آگے بڑھایا اور اپنے پھوپھا نذیر احمد کی طرح اپنے ناولوں حیات صالحہ، بنت الوقت، شام زندگی، نوحہِ زندگی اور صبح زندگی وغیرہ میں عورتوں کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ناولوں میں عورت کی مظلومیت بیان کی بل کہ رسالے بھی جاری کیے۔ عصمت، تمدن، سہیلی، بنات اور جوہر نسواں جیسے رسائل کا مقصد خواتین کی تعلیم و تربیت ہی تھا۔ انھوں نے ہندوستانی عورت کے مسائل کو قریب سے دیکھا اور اس پر قلم اٹھایا۔ وہ معاشرے میں رائج ایسی رسومات کے سخت خلاف تھے جن سے عورتوں کا استحصال ہوتا تھا۔ وہ مشرقی خالص اسلامی تہذیب کو عام کرنا اور مغربی

تہذیبی یلغار کو روکنا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ناولوں میں مذہب کا غلبہ اور تبلیغی انداز ملتا ہے۔ نتیجتاً حقیقت نگاری ماند پڑ جاتی ہے۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے عورتوں کی مظلومیت کے نہایت دردناک نقشے الم ناک زبان میں پیش کیے ہیں اور اردو ادب میں المیہ کا آغاز انھیں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس میں وہ حد سے تجاوز بھی کر گئے ہیں۔ مولانا نے عورت کو حور کا تصور تو بخش دیا لیکن شریک حیات بننے کا اختیار چھین لیا۔ ان کے نزدیک وہ وقار، ایثار، قربانی، پاکیزگی اور سچائی کا ایک مجسمہ ہے جس سے کبھی کوئی غلطی، سرزد نہیں ہوتی جس میں کوئی خامی نہیں پائی جاتی۔ کوئی کم زوری نہیں ملتی اور یہ یک رخی تصویر ہے۔ حد درجہ مبالغہ آمیز حقیقت سے کوسوں دور وہ صرف اس کی خوبیاں گناتے ہیں۔ خامیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے وہ خدا کی ایک بے عیب اور مکمل مخلوق ہو۔ کہ وہ اس کی سماجی حیثیت میں اصلاح تو چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے کوئی ضابطہ یا لائحہ عمل پیش نہیں کرتے ہیں۔ اس کا درد بیان کرتے ہیں۔ درد کا درماں تجویز نہیں کرتے۔ یہ ہم دردی نہیں جذباتیت ہے۔[۱۵۳]

راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے اس کی مظلومیت کو ہر طرح سے سامنے لایا ہے۔ انھوں نے مسلم خواتین کے گھریلو، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی مسئلے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے تمام ناولوں میں نصیحتیں موجود ہیں۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے حامی اس لیے میں تاکہ وہ اپنی ماں بیوی اور بیٹی بن سکیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے اپنے ناول صبح زندگی میں لڑکیوں کے لیے کھانے پکانے کی تراکیب، سلائی کڑھائی کے طریقے گھریلو چٹکلے ان کو سکھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بچپن کی غلط تربیت لڑکیوں پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔صبح زندگی کی منجھلی ماں کی غلط تربیت کی وجہ سے ہٹ دھرم اور ضدی ہے۔ مگر دوسری بیٹی نسیمہ پھوپھی کی تربیت کی وجہ سے بہت نیک اطوار جو کہیں ماں کا بس چلے تو وہ منجھلی کی طرح نسیمہ کا بھی ایسا گھر کھرچ کھوئے محلہ بھی تھڑی تھڑی کرتا۔"[۱۵۴]

مولانا راشد الخیری کی تحریروں میں اصلاح نسواں کا جذبہ سرگرم نظر آتا ہے۔ جو کہ اصلاح معاشرہ کا ایک جزو ہے ان کے ہاں عورت مظلوم، بے کس، ایثار پسند، وفادار، خدمت گزار نظر آتی ہے۔ ''شرع کا خون'' مولانا کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انھوں نے خواتین کے حق خود ادیت کو موضوع بنایا۔ وہ عورت کی مرضی کی شادی کی حمایت کرتے تھے اور انھوں نے اس بات کو واضح کیا پسند و مرضی کی شادی کرنا نئے زمانے کی دین نہیں اور نہ ہی

مغربی تہذیب کا اثر ہے بل کہ بہت پہلے سے اسلام نے یہ حق عورتوں کو دیا ہے۔ وہ والدین کے اس روپ کو سخت نا پسند کرتے ہیں کہ لڑکی کی مرضی کے بغیر یا اس کی مرضی کے برخلاف شادی کر دی جائے۔ ''صبح زندگی'' میں کہتے ہیں۔

اس کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھو جس کے سر چاہا چپکا دیا جہاں چاہا ٹپخ دیا۔[۱۵۵]

خواتین کی زندگی کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں جہاں ان کی نظر نہ پہنچی ہو۔ ان کی بات دل میں اترنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کو پہچانتے ہیں اس کے دل میں کتنے زخم ہیں اور اس کے اسباب کیا ہیں وہ اس کے دل میں جھانک کر دیکھ لیتے ہیں، اور ان سے ہم دردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ ان پھپھولوں کی اپنے قلم کے ذریعے عکاسی کرتے ہیں اور مرتے دم تک اس کے علم بردار رہتے ہیں۔

بیوہ کی زندگی اور بیوہ کی شادی جیسے اہم موضوع پر بھی علامہ راشد الخیری نے قلم اٹھایا اور معاشرے کی بڑی خرابی کی نشان دہی کی۔ "بیوی کی صحنک پر بیوہ لڑکی" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں اس موضوع کو بڑے دل گداز انداز میں پیش کیا گیا ہے اور بیواؤں پر زندگی کے دروازے بند کرنے والے معاشرے کی بد سلوکیوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ''نوحہ زندگی'' کا موضوع ہندوستانی بیوہ کی زندگی ہے جو اس قدر دردناک اور تکلیف دہ ہے کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ راشد الخیری لکھتے ہیں:

یہ اس قوم کی کیفیت ہے جس نے خاک عرب سے اٹھنے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صدا پر لبیک کہا اور دعوی کیا کہ اسلام سے زیادہ دنیا میں کسی مذہب نے عورت کی حمایت نہیں کی۔ اگر منھ پر آنکھیں موجود ہوں اور پہلو میں دل ہو تو مسلمان ذرا ان بیوہ عورتوں کی حالت دیکھیں جن کو مردوں کے مظالم نے دنیا کی ہر نعمت سے محروم کر رکھا ہے۔[۱۵۶]

ہندوستانی معاشرے میں ہندو معاشرے کی وجہ سے بیوہ سے امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سائے کو بھی منحوس سمجھا جاتا تھا۔ مبارک موقعوں اور خوشی کی تقاریب میں اس کا شامل ہونا برا سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی معاشرے کے اندر بیوہ کی حالت زار کو مصنف نے بڑے دل سوز انداز میں بیان کیا ہے:

مہینے دو مہینے کی بیاہیاں دنیا کی راحت و نعمت کو ترستی پھڑکتی بوڑھیاں ہو گئیں۔ لیکن ان کا دل نہ پسیجا، زخم پر کچوکے یہ تھے کہ پہننا اور اٹھنا سرمہ، مہندی، مسّی ہر چیز حرام تھی۔ ایسی اشد ضرورت ہو اور سر چکٹنے لگے تو دھوی تلی کا تیل وہ بھی چپکے سے ڈال کر گوندلو ورنہ برے حال بدتر احوال مامالونڈیوں کی طرح میلے چکٹ کپڑے ہاتھ ہیکٹرانہ پاوں پیکڑا، زندگی کے دن پورے کرو۔[۱۵۷]

وہ بیوہ کے عقد ثانی کو ان کے مسائل کا حل سمجھتے تھے اس دور میں بیوہ کی دوسری شادی کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن شرعی طور پر اسے اجازت تھی۔ غلط رسم و رواج اور خیالات کی وجہ سے یہ مسائل عام تھے۔ راشد الخیری نے عورتوں کے شرعی حقوق۔ شادی۔ لڑکیوں کا حق وراثت تسلیم کرنا، پردے کی سختی اور تعداد ازدواج پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالی وہ چاہتے تھے عورت اپنے حقوق سے آگاہ ہو۔ انھوں نے اپنے ہر ناول میں طبقہ نسواں کے مسائل ان کی ذہنی کش مکش اور الجھنوں کو موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں کا مقصد عورتوں کی اصلاح تھی یہی وجہ ہے کہ علی عباس حسینی نے انھیں مسلمان لڑکیوں کے سرسید کا نام دیا۔[۱۵۸]

بقول وقار عظیم:

> راشد الخیری نے عورت کے مسائل کو عورت کی نظر سے دیکھا اور اس کے دکھ درد کو اپنا رکھ درد بنا کر اس کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ان کی نظر اس کی زندگی کے ہر پہلو پر گئی ہے اور اس طرح پہلی مرتبہ ہمارا ادب عورت کی معاشرتی حیثیت کا ہے۔ مصور اور مفسر بننے کے علاوہ اس کے ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئینہ دار بنا۔[۱۵۹]

خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں مردانہ تعصب جو قدم قدم پر موجود تھا۔ علامہ راشد الخیری کی نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ وہ پوری طرح اس سے باخبر تھے۔ انہوں نے تعلیم کے حوالے سے مردانہ ذہنیت کی عکاسی عمدگی سے کی ہے۔

> کوتوال ہاں تو جناب یہ معاملہ کیا ہے۔ ماشاءاللہ صاحب زادی خوب چٹاخ پٹاخ ہے۔ پڑھی لکھی بے جھجک، بے حجاب آپ نے معلوم ہوتا ہے تعلیم پر بہت توجہ کی۔[۱۶۰]

انھوں نے عورت کو وہی درجہ دلانے کی لگاتار کوشش کی جو اسے اسلام نے عطا کیا ہے۔ وہ تقریباً ۵۰ سال تک مسلمان عورت کے حقوق کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی تمام کتابیں صرف ایک مقصد کی حامل ہیں۔ یعنی صنفِ نازک کو ذلت سے نکال کر ترقی کی راہ پر لے جانا۔

وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کو ان کی ضرورت کی مناسبت سے تعلیم و آزادی حاصل ہو اور وہ تمام حقوق مل جائیں جو شرع اسلام نے دیے ہیں۔ مگر وہ اپنی معاشرت میں ''جوہر قدامت'' کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور مغرب کی تقلید ہرگز نہ کرے۔ انھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو لغو قرار دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان عورت کے مستقبل کی تعمیر ماضی کی بنیاد پر ہو۔ اور ان کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی کوئی اس سے انکار نہیں کر

سکتا۔ علی عباس حسینی کے بقول ''ملک کی کسی اہل قلم نے صنف نازک کی اصلاح کی اتنی سعی کامیاب نہیں کی جتنی مولانانے تاعمر جاری رکھی۔''[۱۶۱]

حقوق نسوں، تعلیم نسواں، اور فرائض نسواں کے موضوع پر مولانا کی درد انگیز تقاریر کی بناپر کہا گیا کہ اردو ناول کی تاریخ میں مولانا بسیار نویسی کے لیے ہمیشہ یاد رکھ جائیں گے۔ وہ برصغیر کی خواتین کی محسن عظیم اور عورتوں کی مظلومیت کے ترجمان تھے۔ اردو ادب اور اس ادب سے متاثر ہونے والی سوسائٹی پر راشد الخیری کا یہ احسان ہمیشہ رہے گا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کی سیاسی، معاشرتی اقتصادی زندگی میں بھونچال سا آگیا۔ ایسی صورت حال میں سرسید اور رفقائے سرسید نے ہندوستانی معاشرہ کو اس دگرگوں حالت سے نکالنے کے لیے جہاں اور بہت سی تدابیر ہیں وہی تعلیم نسواں بھی ان کا بنیادی ہدف تھا۔ اس زمانے کی مسلم عورت کی حالت بڑی ناگفتہ تھی۔ اس وقت کی عورت کا تصور ایک بچے جننے والی مشین کا ساتھا۔ جو گھر کی چار دیواری میں قید علم و عقل سے بے بہرہ زندگی کے مسائل سے بے خبر تھی جب کہ آزادی نسواں کی تحریک پورے ایشیا میں عروج پر تھی۔ ترکی کی نامور ادیبہ خالدہ ادیب خانم اور ہندوستان کی مسز سروجنی نائیڈو اس حوالے سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکیں تھیں۔ جب کہ دوسری طرف مسلم معاشرے کا حال یہ تھا کہ لوگ اپنی بچیوں کی مدرسوں میں بھیجنے پر آمادہ نہ تھے۔ پردے کی پابندیاں اپنی جائز حدود سے بہت آگے تھیں یہ مسلمانوں کے انحطاط کا بہت بڑا سبب تھا۔ مولوی نذیر احمد، حالی اور نواب محسن الملک و مصلحین قوم نے اس سنگین مسئلے کے پیش نظر تعلیم نسواں کا نعرہ بلند کیا۔ نذیر احمد نے اسی مقصد کے حصول کے لیے مراۃ العروس، بنات النعش جیسی کتابیں لکھیں۔

بے داری شعور نسواں کے ضمن میں ایک اور اہم نام مولوی ممتاز علی کا ہے۔ دیوبند کے طالب علم تھے لیکن علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے۔ انگریزی زبان بھی جانتے تھے۔ شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی اردو زبان و ادب کے ان مشاہیر میں سے ہیں۔ جنھوں نے علم و فن کے ذریعے معاشرتی فلاح اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ لاھور میں ''دار الاشاعت پنجاب'' کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کیا جس نے نو آموز لکھاریوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کیں۔۱۸۹۸ء میں "تہذیب نسواں" کے نام سے عورتوں کی اصلاح و فلاح کے لیے ہفتہ وار رسالہ جاری کیا جو تقریباً نصف صدی تک شائع ہوتا رہا۔ ''تہذیب نسواں'' میں عورتوں کو لکھنے کی ترغیب دینے کے لیے سونے کی انگوٹھی بطور انعام دینے کی سکیم شروع کی اور اسے تاحیات جاری رکھا۔ مولوی ممتاز علی عورت کے سماجی اور معاشرتی سدھار کے ساتھ ساتھ اس کی جدید تعلیم کے داعی تھے۔ اس اصلاحی مشن کے پرچار کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ کتب شائع کی گئیں۔ خواتین کی تربیت اولاد کے سلسلے میں راہ نمائی فراہم کرنے کے لیے ''مشیر مادر'' کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ خواتین

کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے تہذیبی فنڈ قائم کیا۔ مولوی ممتاز علی کی کوششوں سے بھاٹی گیٹ لاہور میں وکٹوریہ گرلز ہائی سکول قائم ہوا۔[۱۶۲]

مولوی ممتاز علی نے مسلمان عورتوں کی زبوں حالی اور ان کی ذہنی غلامی کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی وہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محض جسمانی بناوٹ کی وجہ سے مرد عورت پر غالب نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ایک سے زائد شادیوں کی بھی مخالفت کی اس حیثیت سے وہ چراغ علی کے ہم خیال تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے اور اسے بہت ضروری تصور کرتے تھے۔ وہ مردوں کے برابر عورتوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس خیال کی شدت سے مخالفت کی کہ تعلیم سے عورتیں خراب ہو جاتی ہیں بل کہ ان کا خیال تھا کہ تعلیم ہی کی بدولت وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کے قابل ہوتی ہیں اور مرد کی صحیح شریک حیات بنتی ہیں اور آنے والی نسلوں کو بہتر مستقبل عطا کرتی ہیں۔[۱۶۳]

بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کی تعلیمی تحریک کے سب سے بڑے مجاہد اور محرک شیخ عبداللہ تھے۔ ان کی کوششوں سے نہ صرف تعلیم نسواں کو فروغ ہوا۔ بل کہ خواتین کے اندر اک ذہنی بے داری کی لہر پیدا ہوئی۔ شیخ عبداللہ ایک کشمیری نو مسلم تھے۔ انھوں نے قانون کی ڈگڑی علی گڑھ سے حاصل کی ان کی شادی دلی کے مغل خاندان کی ایک روشن خیال لڑکی سے ہوئی۔ شیخ عبداللہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کی ایک شاخ قائم کی گئی تھی جو کہ تعلیم نسواں کی اشاعت کے لیے مختص تھی۔ اس کے سیکرٹری شیخ عبداللہ ہی تھے۔ انھوں نے اس پلیٹ فارم سے اس تحریک کو کافی آگے بڑھایا۔

۱۹۰۴ء میں عورتوں کے لیے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام ''خاتون'' تھا۔ اس رسالے میں ''تعلیم نسواں'' کے متعلق مضامین شائع کیے جاتے اور ساتھ ساتھ کانفرس کی روداد بھی شائع کی جاتی۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے علی گڑھ میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا۔ انھیں اس سکول کے قائم کرنے میں بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رجعت پسند عناصر نے دل کھول کر اس تحریک کا مذاق اڑایا۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ لیکن انھوں نے صبر و تحمل کے ساتھ تمام مصیبتوں کو برداشت کیا۔ جلدی ہی انھیں بیگم بھوپال کی حمایت اور سرپرستی مل گئی۔ بیگم بھوپال خود ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اور تعلیم نسواں میں کافی دل چسپی رکھتی تھی۔ انھوں نے خود ہی اپنی ریاست میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا تھا۔ انھوں نے شیخ عبداللہ کی کاوشوں سے متاثر ہو کر علی گڑھ سکول کے لیے ماہانہ رقم مقرر کی اور ایک اچھی خاصی رقم انھوں نے لڑکیوں کی رہائش کی لیے عطیہ کی شکل میں دی۔ حکومت برطانیہ نے اسی رقم کے برابر کی گرانٹ منظور کی اور ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی پہلی منظم تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی

تحریک کے پیش نظر شیخ عبداللہ نے "انجمن خواتین اسلام" کی بنیاد رکھی۔ "آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرس" بھی قائم کی ۔جس کے قیام سے تعلیم نسواں کے فروغ میں کافی مدد ملی۔ اس تحریک نے ہندوستانی مسلم خواتین کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا انھیں پریشر گروپ(PRESSURE GROUP)بنا کر ایک صحت مند رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ عبداللہ نے "علی گڑھ گرلز سکول" کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر ہندوستان کی روشن خیال مسلم خواتین کو شرکت کی دعوت دی۔ اس کی صدارت بیگم بھوپال نے کی۔ یہ خواتین ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئی ہوئی تھیں۔ ان خواتین میں بیگم آفتاب خان، بیگم نفیس، بیگم سید محمد، لاہور سے بیگم میاں محمد شفیع، بیگم شاہ دین، بمبئی سے زہرا فیضی، عطیہ فیضی، بھوپال سے بیگم بھوپال کے علاوہ ان کی پرائیوٹ سیکرٹری فاطمہ آرزو بیگم جو کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی بہن تھی۔ اس کے علاوہ وحیدہ بیگم یعقوب (ایڈیٹر تہذیب نسواں لاہور)، فاطمہ بیگم (ایڈیٹر شریف بی بی لاہور) وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بیگم بھوپال اپنی صدارتی تقریر میں تعلیم نسواں کی اہمیت اور

اس کے فروغ کے اقدامات پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ:

> حکومت برطانیہ خود اس سنگین مسئلہ کے حل کے لیے امداد دینے کے لیے تیار ہے لیکن جب تک عوام خود اس کام کو انجام دینے کے لیے کمربستہ نہ ہوں گے اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرس نے بھی اس سلسلہ میں کئی تجاویز پیش کیں ہیں۔ لیکن اس میدان میں پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں نے خود اس مسئلے کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ [۱۶۴]

انھوں نے ہندوستان کی تمام مسلم خواتین سے پُرزور اور دردمندانہ اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم نسواں کے لیے ہماری بہنیں خود قدم بڑھائیں۔

شیخ عبداللہ عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں خاصے فعال نظر آتے ہیں۔ اس کام میں ان کی اہلیہ نے بھی بھر پور ساتھ دیا۔ ان کی زیر قیادت ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ جب مسلمان مرد عورتیں دونوں اپنی اصلاح و فلاح کے لیے بحث و مباحثیں کر رہے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا ہندوستان میں مسلم خواتین کا پہلا اجلاس تھا۔ اس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ علی گڑھ میں ایک ایسا سکول بھی قائم کیا جائے جہاں استانیوں کو ٹریننگ دی جائے۔ اسی کے زیر سایہ ۱۹۰۵ء میں لکھنو میں تعلیم نسواں ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کی تعلیم سے پوری ہم دردی پیدا کی جائے اور ملک میں اس کے مخالف پھیلائے جانے والے خیالات اور جاہلانہ مخالفت رفع کی جائے اور تمام مخالفین کے اعتراضات کی معقول طور پر تردید کی جائے۔ اس کے

علاوہ مسلمان بہنوں کو تعلیم کی ضرورت اور فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ تعلیم کی ترغیب دی جائے ان میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ قومی ہم دردی کا شوق پیدا کیا جائے۔[۱۶۵]

''اخبار نسواں''خواتین کا پہلا اخبار تھا۔ ۱۸۸۴ء میں مولوی سید احمد دہلوی نے شائع کیا۔ اس میں کسی قسم کی قید نہیں تھی یہ ہر طبقے کی عورت کے لیے شائع ہوتا تھا۔ یہ مہینے میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ ضخامت سات صفحات تھی، مضامین میں عورتوں کی خانہ داری کے علوم کے علاوہ ان کی تعلیمی حالت سدھارنے کی کوشش بھی کی جاتی۔ اس رسالے نے مشرقی تہذیب کی نگہداشت کی۔ رازق الخیری اپنے مضمون ''عصمت کے پچاس سال''میں لکھتے ہیں کہ:

> ایک زمانہ ہوا دہلی میں عورتوں کے لیے اخبار نکلا تھا جس کا نام اخبار النساء تھا، اور مولوی سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ کے مشہور مولف اس کے ایڈیٹر تھے۔ رازق الخیری کے مطابق اس زمانے میں اخبار النساپر اخباروں کی جوروکی پھبتی کسی گئی تھی۔[۱۶۶]

برصغیر میں نسائی صحافت کا آغاز اخبار النساسے ہوا مگر بہت ہی جلد یہ اخبار بند ہو گیا۔ شیخ عبداللہ جن کی خدمات عورتوں کی تعلیم و بے داری کے سلسلہ میں قابل قدر ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ ''خاتون'' جاری کیا۔ ۱۸۹۹ء میں تعلیم نسواں کی اشاعت کے لیے قائم کی جانے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے پہلے سیکرٹری شیخ عبداللہ ہی تھے۔ انھوں نے اس پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ آگے چل کر ۱۹۰۴ء میں عورتوں کے لیے جاری کردہ رسالہ میں اس کانفرس کی روداد بھی لکھی۔ شیخ عبداللہ نے اپنی بیگم کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا پہلا سکول علی گڑھ بھی قائم کیا۔ ان کی بیگم ایک روشن خیال خاتون تھیں اور وہ خود بھی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی کے لیے ہر ذریعہ اپنایا اور اس راستے میں حائل بہت سی دشواریوں کا سامنا کیا۔ رسالہ ''خاتون'' کے اجراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خاتون ایک ماہوار رسالہ ہو گا جس میں صرف عورتوں کے مضامین ہوا کریں گے۔۔۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جو ان کی ذات اور ان کی حالت کے مناسب ہو اشاعت کریں گے۔ ان میں صحیح مذاق پیدا کریں اور ان میں نفیس اور اعلیٰ قوتوں کو ترقی دیں جو ان سے مخصوص ہیں اور دنیا کے لیے نعمت اور ہماری قومی ترقی کے لیے بڑی ضروری ہیں۔[۱۶۷]

اس رسالہ میں اس زمانے کے تمام وہ اہم لوگ لکھتے تھے جو تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ ان میں مولانا حالی، مولوی کرامت حسین، محمد احسن اللہ، سید احمد دہلوی، اکبر میر ٹھی، مس نصیر الدین حیدر، فاطمہ بیگم، رابعہ سلطانہ بیگم، بنت نذر الباقر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس رسالے کے مزاج کا اندازہ اس میں شائع ہونے والے مضامین کے عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً تعلیم میں مرد اور عورت کا حق برابر ہے، آزادی نسواں، تعلیم نسواں، عورتوں کی

تعلیم وتربیت کے لیے ایک نارمل سکول کی ضرورت، عورتوں کی تعلیم کے طریقے پر ایک نظر، عورتوں کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے، عورتوں ہی کی تعلیم میں مردوں کی تعلیم ہے۔ یہ رسالہ کافی عرصہ تک عورتوں کی ترقی کی راہ ہموار کرنے میں فعال کردار ادا کرتا رہا۔[۱۶۸]

۱۹۰۷ء میں خواتین کا ماہانہ "پردہ نشین" آگرہ سے جاری ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق:

۱۹۰۷

چندہ ڈیڑھ روپے تھا۔ یہ عزیزی پریس آگرہ سے چھپتا تھا۔۔۔۔۔۔ پردہ نشین میں جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا عورتوں کے لکھے مضامین جگہ پاتے تھے۔ یہ اشد ضروری مردوں کے مضامین چھپتے تھے۔[۱۶۹]

لاہور سے خواتین کا ماہنامہ ۱۹۰۹ء میں منشی محبوب عالم کی نگرانی میں جاری ہوا۔ اس کا نام "شریف بی بی" تھا۔ اس رسالے میں مسز عبدالقادر، بنت نذرالباقر، اہلیہ بابو علی احمد، بیگم عبدالستار نے خواتین کے موضوعات پر مضامین لکھے۔ اس رسالے کے موضوعات عام زندگی کے ہوتے تھے اور ان موضوعات پر آسان زبان میں مضامین پیش کیے جاتے تھے۔ موضوعات اس قسم کے تھے جیسے تربیت اطفال، خواتین کا لباس، عورتوں کے توہمات، تعلیم کی ضرورت، وغیرہ۔ یہ ہندوستان اور یورپ کی ممتاز عورتوں کے کارناموں کو اجاگر کرتا تھا۔ اس رسالے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا لہجہ خاصا جذباتی ہوتا تھا۔ جو عورتوں کو متاثر کرتا تھا۔ اس رسالے کی کتابت نہایت پاکیزہ تھی۔ کاغذ بھی عمدہ تھا۔ اس میں عورتوں کی معلومات اور ان کی اصلاح کے لیے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔[۱۷۰]

نسائی رسالوں میں سب سے زیادہ طویل عمر پانے والا اور دوررس اثرات مرتب کرنے والا پرچہ "عصمت" ہے۔ یہ رسالہ ۱۵ جون ۱۹۰۸ء کو دہلی سے جاری ہوا۔ یہ رسالہ پاکستان بننے کے بعد بھی کراچی سے شائع ہوتا رہا۔ نسائی بے داری کی تحریک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس کی ابتدا بے حد نا مساعد حالات میں ہوئی تھی۔ "عصمت" نکالنے کا مقصد خواتین میں تخلیقی شعور کی بے داری اور ایک ایسا معتبر رسالہ مہیا کرنا تھا جس میں خواتین کی تخلیقات شائع ہو سکیں۔ اور ان کی تخلیقی سرگرمیں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ "عصمت" کی مقبولیت اور طویل عمری کے پیچھے ایک مضبوط ارادی ٹیم تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نسائی رسالوں اور ناولوں کی ساز گار کی ہوئی فضا بھی تھی جو اس کی اشاعت سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ "عصمت" کی اشاعت اس دور کے مشہور رسالے "مخزن" کے دفتر سے شروع ہوئی۔ "مخزن میں علامہ راشد الخیری کے مضامین اور افسانے شائع ہوئے تھے۔ یہ خواتین میں بے حد مقبول ہوئے تھے۔ اور خواتین کی طرف سے علیحٰدہ پرچے کی اشاعت کی فرمائشیں موصول ہوئی انھی دنوں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک رسالہ عورتوں کے فائدے کے لیے جاری کیا جائے۔ یہ قرار پایا کہ

مسز محمد اکرام اس کی ایڈیٹر ہو گی اور راشد الخیری مضامین لکھے گے۔ جو لڑکیوں کے لیے خاص طور پر موزوں ہوں جس سے ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ سر عبد القادر مرحوم ''غم راشد'' میں لکھتے ہیں:

> شیخ محمد اکرام مرحوم کی پریس کے مہتمم شیخ عبد القادر مخزن کی طرح عورتوں کا رسالہ خود نہیں نکال سکتے تھے۔ اور راشد الخیری سرکاری ملازم تھے۔ ان کا نام ایڈیٹری میں نہ پڑ سکتا تھا۔ لہذا یہ طے ہوا کہ ایڈیٹر شیخ محمد اکرام اور ان کی اہلیہ محترمہ کو ظاہر کیا جائے اور مضامین وغیرہ راشد الخیری سے لکھوائے جائیں۔ رسالے کا نام عصمت تجویز تھا۔ اس میں اصلاحی معاشرتی، اسلامی اور تاریخی ناول اور مختصر افسانے نظمیں، مضامین وغیرہ شامل کی جائیں۔[۱۷۱]

''عصمت'' رسالے کے مقاصد یہ بھی تھے۔ عالم نسواں کی ترقی، تعلیم نسواں کی حمایت، زنانہ لٹریچر کو وسعت دینا۔ معلومات عامہ کی فراہمی وغیرہ عصمت کی مضمون نگار خواتین یہ ہیں۔ نذر سجاد حیدر، حجاب اسماعیل، اے، آر، خاتون صاحبہ، امت الوحی صاحبہ، زاہدہ مراد آبادی، ظفر جہاں، اشرف جہاں، مسز خدیو جنگ، جمیلہ بیگم، عطیہ بیگم فیضی، فاطمہ بیگم، عباسی بیگم، اور صغری ہمایوں وغیرہ۔ عصمت میں مضمون نگار ہی نہیں بل کہ مشاعرات بھی شامل تھیں۔ یہ شعر کہنے پر پوری قدرت رکھتی تھیں ان میں ز۔خ۔ش۔ نگہت شروانیہ، منجھو بیگم، خورشید آرا بیگم، بخشی بیگم، بلقیس جمال، رابعہ پنہاں، کنیز فاطمہ حیا اور صفیہ شمیمہ ملیح آبادی کی نظمیں ''عصمت'' کے صفحات کی زینت بنیں۔

عصمت کے ابتدائی شماروں میں علامہ راشد الخیری نے سادہ زبان میں خواتین کے مختلف ناموں سے مضامین لکھے۔ جس کا مقصد مضمون نگاری کی ترغیب دینا اور ایسے نمونے فراہم کرنا تھا جو گھریلو تعلیم یافتہ خواتین کو مضمون نگاری کی طرف مائل کر سکیں۔ بنت نذر باقر نے سب سے پہلے اس پرچہ کے لیے لکھنا شروع کیا، انھوں نے خواتین کی حمایت میں مدلل مضامین لکھے۔ ان کے دل چسپ افسانے عصمت میں شائع ہوئے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے لیے اور جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے دنوں میں ترکی کی حمایت میں پر جوش مضامین لکھے۔ چندہ بھی جمع کیا۔ ان کے عملی کام بھی قابل ذکر ہیں انھوں نے خواتین کے لیے مدرسے اور زنانہ کلب بھی قائم کیے۔[۱۷۲]

رسالہ ''استانی'' دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ خواجہ معین نظامی شائع کرتے تھے۔ اس کی ایڈیٹر اُن کی اہلیہ لیلیٰ خواجا بانو تھیں۔ یہ خواجا صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ انھیں لیلیٰ بانو کا لقب خواجا صاحب نے خود ہی دیا تھا۔ ''استانی'' کب شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی تاریخ نہیں ملتی۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں شائع ہونے لگا تھا۔ جنوری ۱۹۱۹ء کو ز، خ، ش کی ایک نظم اس پرچے میں شائع ہوئی تھی اور اکتوبر میں اس کا نمبر آیا تھا۔ اس رسالے کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات ملتی ہیں وہ ز، خ، ش اور ''استانی'' کی ایڈیٹر لیلیٰ بانو کی خط و کتابت

کے توسط سے ہم تک پہنچتی ہیں۔ اس کی اشاعت سے لے کر جاری ہونے کے بعد تک ز۔ خ۔ ش۔ کا مستقل اور مسلسل تعاون اس کے ساتھ رہا۔ جس کی وجہ حسن نظامی سے ان کے تعلقات اور ان کی بیگم سے گہری دوستی ہے۔[۱۷۳]

''مرشد'' ماہنامہ رسالہ تھا۔ جو ۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے چیف ایڈیٹر خواجہ حسن نظامی تھے۔ یہ صرف چھ مہینے جاری رہا اور اگست ۱۹۱۸ء کو اس کا آخری پرچا چھپا تاہم عرصہ یہ شائع ہوتا رہا بے حد مقبول رہا۔ ز۔ خ۔ ش۔ رسالہ بند ہونے پر لکھتی ہیں:

> مرشد کے بند ہونے کا بہت افسوس ہے۔۔۔۔۔ اصل میں اردو کی قسمت ہی عمدہ اخبارات کے قابل نہیں بے شک خواجا صاحب کم زور آدمی ہیں لیکن کوئی قوی سے قوی شخص بھی تنہا اخبار نہیں چلا سکتا۔[۱۷۴]

''نظام المشائخ'' جولائی ۱۹۱۹ء میں خواجا حسن نظامی اور ملا واحدی صاحب نے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر خواجا صاحب تھے۔ یہ چاند کی ٹھیک چھ تاریخ کو خواجا معین الدین چشتی کے عرس پر شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ تمام سلسلہ کے صوفیا کی دینی دنیاوی اعراض کا خامی تھا۔ اس کے روزنامچے میں کافی تاریخی، ادبی اہم شخصیات کے حالات قلم بند ہوتے تھے۔ ز۔ خ۔ ش۔ صاحبہ کی نظمیں بھی اس رسالے میں چھپی۔[۱۷۵]

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تعلیم نسواں کے فروغ میں مسیحی مشنریوں کا بھی بڑا کردار ہے۔ خصوصاً ۱۸۱۳ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان کے عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقوں میں عیسائی مشنریوں نے تعلیمی حوالے سے بہت کام کیا۔ لندن میں مشنری سوسائٹی نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے مفید خدمات سرانجام دیں۔ اس سلسلے میں لارڈ ڈ بنٹک کی کوششیں نہایت قابلِ تحسین ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان میں تبدیلی لانے کا سب سے بڑا سبب خواتین کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ تعلیم نسواں کے فروغ میں ان روشن خیال انگیریزوں کا بھی اہم کردار ہے۔ جو سیکولر نظام تعلیم کے حامی تھے اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں ہندوستانی کی ذاتی کوششوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ برطانیہ، کینڈا، آسٹریلیا، امریکہ سے آئی ہوئی مشنری خواتین نے بھی ہندوستانی خواتین کی تعلیم کے لیے راہ ہموار کی۔ چرچ آف انگلینڈ، زنانہ مشنری سوسائٹی اور زنانہ بائبل سوسائٹی کے نام سے کام کرنے والی تنظیموں سے وابستہ خواتین نے اٹھارویں انیسویں اور بیسویں صدی میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

خواتین کے لیے خصوصی طور پر جاری ہونے والا رسالہ "رفیق نسواں" تھا۔ ۵ مارچ ۱۸۸۴ء کو لکھنو سے پندرہ روزہ، اردو ہندی میں کلکتہ سے بنگالی میں اور تامل زبانوں میں نکلنا شروع ہوا۔ یہ پرچہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے عورتوں کے لیے جاری کیا گیا۔ یہ بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے جاری کرنے والے پادری قریون تھے۔[۱۷۶]

انگریزوں کی تعلیم نسواں کے حوالے سے کی گئی کوششیں لاکھ قابل تحسین سہی لیکن ان کے پس پردہ ان کے مقاصد پوشیدہ تھے۔ وہ ان کوششوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم اپنے دین کی اشاعت اور ساتھ ساتھ اپنی معاشرت و ثقافت کو ہندوستان کی سرزمین پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ہر سمجھ بوجھ رکھنے والا ہندوستانی ان کے مقاصد کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ خصوصاً مسلمان دینی اخلاقی اقدار اور مذہبی روایات کو بہتر خیال کرتے تھے۔ انھوں نے ثقافت و معاشرت اور نظام تعلیم کے تحفظ کے لیے جدوجہد بھی کی۔[۱۷۷]

تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ نے عملی طور پر قدم اٹھایا۔ وہی دوسرے گروہ نے تعلیم نسواں کے خلاف بے حسی کو دور کرنے کے لیے اپنی تحریروں سے ایک تحریک شروع کی۔ اس گروہ میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، الطاف حسین حالی، شبلی، بشیر الدین، محمدی بیگم، اور رشید النسا بیگم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس گروہ نے اصلاحی ناول لکھنے شروع کیے اور خواتین قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔

مولوی نذیر احمد پہلے ناول نگار ہی نہیں بل کہ پہلے ادیب بھی ہیں جنھوں نے شعوری طور پر عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی ان کے ناولوں میں خواتین کے مسائل سامنے آتے ہیں اور انیسویں صدی کے مسلم گھرانے کی عام عورت اپنی تمام تر کم زوریوں سمیت نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں سرشار بھی میدان میں آجاتے ہیں۔ سرشار کے ''فسانہ آزاد'' میں ایک جگہ حسن آرا، میاں آزاد سے اپنی خواہش کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ ہم مدرسہ نسواں قائم کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار خواتین کی تعلیم کے بارے میں ہم دردانہ رویہ رکھتے تھے۔ عبدالحلیم شرر اگرچہ تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں، مگر انھوں نے بھی عورت کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کا ناول "بدر النساء" کی مصیبت، پردے کی سختی پر گہرا طنز ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''غیب دان دلہن'' اور "طاہرہ" جیسے ناول لکھ کر تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ حالی نے بھی عورتوں کی اصلاح کے لیے ''مجالس النسا'' تحریر کی۔ اس میں انھوں نے لڑکے اور لڑکی دونوں کی تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا۔ سجاد حیدر یلدرم کا ایک مضمون جو انھوں نے تعلیم نسواں کی حمایت میں لکھا اس میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

> عورت کی تعلیم سے جو بے پروائی کی جارہی ہے اس کی وجہ تو میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اس بے پروائی سے سخت نالاں ہیں اور والدین ہیں کہ اس بے زاری کی پروا نہیں کرتے۔[۱۷۸]

الغرض اردو کے ابتدائی ناولوں نے اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لڑکیوں کی تعلیم، تعلیم کی ضرورت اور نوعیت پر روشنی ڈالنے کی اپنی سی کوشش کی ہے اور برصغیر کے مسلم سماج کی گھریلو عورتوں کو اس بات پر

آمادہ کیا ہے کہ وہ تخلیقی میدان میں آگے آئیں ان کی حوصلہ افزائی کے لیے رسائل و جرائد کا اہتمام کیا گیا تا کہ ان کی ابتدائی کوشش ان جرائد کا حصہ بن کر دیگر عورتوں کے سدھار کا ذریعہ بن سکیں اور عورتیں اپنے عہد کے مطالبات کے مطابق بہتر زندگی گزار سکیں اور صحت مند معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید عامر سہیل، "میں ایک زندہ عورت ہوں: تانیثی مطالعہ "مشمولہ تحقیقی زاویے (بھمبر، شمارہ۵، جنوری۔جون ۲۰۱۵ء)، ص۱۶۷۔

۲۔ شمس الرحمان فاروقی، تانیثیت Feminism کی تفہیم، ادبیات: انتخاب خواتین کا عالمی ادب، (اسلام آباد)، ص۱۷۔

۳۔ عقیلہ جاوید، اردو ناول میں تانیثیت (ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص۱۸۔

۴۔ مبارک علی، "عورت: تاریخ کیا کہتی ہے؟" مشمولہ عورت: زبان خلق سے زبان حال تک، مرتبہ کشور ناہید، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص۹۷۔

۵۔ جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک (کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۰ء)، ص۱۱۱۔

۶۔ زاہدہ حنا، عورت: زندگی کا زنداں (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء)، ص۳۱۔

۷۔ نوال سعدوی، "غلاموں کی آزادی" مشمولہ عورت: زبان خلق سے زبان حال تک، مرتبہ کشور ناہید، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص۱۳۴۔

۸۔ مبارک علی، تاریخ اور عورت (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص۱۴۹۔

۹۔ عبدالصمد رحمانی،اسلام میں عورت کا مقام(لاہور:مکتبہ دینیات،س۔ندارد)،ص۶۔
۱۰۔ جاوید اقبال،آزادی نسواں اور زوال نسواں(لاہور:علم وعرفان پبلشرز،۲۰۰۷ء)، ص۲۴۔
۱۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی،پردہ(لاہور:اسلامک پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص۱۵۔
۱۲۔ عابدہ علی،عورت: قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں(لاہور:قرآن منزل، س۔ندارد)،ص۳۳۔
۱۳۔ ایضاً،ص۳۲۔
۱۴۔ مبارک علی،تاریخ اور عورت،ص۱۴۹۔
۱۵۔ لیکی،تاریخ اخلاق یورپ،مترجم عبدالماجد،(لکھنؤ:الناظر پریس چوک،۱۹۱۷ء)،ص۲۲۰۔
۱۶۔ نذر حسین قمر،عورت کی تاریخی، معاشرتی اور مذہبی حیثیت(لاہور:اسلامیہ دار التبلیغ،س۔ن)،ص۳۴۔
۱۷۔ فدا حسین ملک،*Wives of the Prophet Islamic Publication*(لاہور، ۱۹۶۱ء)،ص۱۷۔
۱۸۔ سورۃ مریم، آیت نمبر ۳۲۔
۱۹۔ شاہ معین الدین ندوی،دین رحمت(کراچی:ایجوکیشن پریس،۱۹۶۷ء)،ص۱۰۶۔
۲۰۔ زاہدہ حنا،عورت : زندگی کا زنداں،ص۳۱۔
۲۱۔ ایضاً،ص۳۴۔
۲۲۔ مبارک علی،تاریخ اور عورت،ص۱۳۷۔
۲۳۔ ایضاً،ص۱۴۔
۲۴۔ عقیلہ جاوید،اردو ناول میں تانیثیت(ملتان:بہاؤالدین زکریایونی ورسٹی،۲۰۰۵ء)،ص۳۴۔
۲۵۔ عابدہ علی،عورت: قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں(لاہور:قرآن منزل، س۔ن)،ص۳۷۔
۲۶۔ علی احمد فاطمی،"تحریک نسواں اور اردو ادب"مشمولہ اردو ادب کو خواتین کی دین،(دہلی: اردو

اکادمی، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۴۵۔
۲۷۔ ابن حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب (ملتان: بیکن پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۳۳۔
۲۸۔ سورۃ النساء، آیت نمبر ۱۹۔
۲۹۔ سورۃ البقرۃ، آیت نمبر ۲۲۔
۳۰۔ مولانا عبدالصمد رحمانی، اسلام میں عورت کا مقام (لاہور: مکتبہ دینیات، س۔ن۔)، ص ۳۳۔
۳۱۔ سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۹۵۔
۳۲۔ مولانا عبدالصمد رحمانی، ص ۶۸۔۶۹۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۸۱۔
۳۴۔ سورۃ التغابن، آیت نمبر ۱۴۔
۳۵۔ مولانا عبدالصمد رحمانی، ص ۸۳۔
۳۶۔ سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۴۔
۳۷۔ نجیبہ عارف، حسن کی دیومالا اور عورت کا استحصال، مشمولہ جنگ (راولپنڈی، ۲۲ اگست ۲۰۱۰)، ص ۱۹۔
۳۸۔ مبارک علی، "عورت: تاریخ کیا کہتی ہے؟" مشمولہ عورت: زبان خلق سے زبان حال تک مرتبہ کشور ناھید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۸۹۔
۳۹۔ ایضاً، ص ۹۳۔
۴۰۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۵۸۹۔
۴۱۔ فیروز اللغات، (لاہور: فیروز سنز)، ص ۱۹۱۔
۴۲۔ نورالحسن نیر، نور اللغات، جلد دوم (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۲۴۔
۴۳۔ خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات، جلد اول، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۲۴۔
۴۴۔ ہارون انیس، "فیمینزم اور پاکستانی عورت" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۲۔
۴۵۔ دی آکسفورڈ ڈکشنری، (۱۹۹۵ء)، ص ۴۹۵۔
۴۶۔ انسائی کلوپیڈیا آف برٹینیکا۔ http://www.britannica.com/history of feminism retrieved on 12/4/16

۴۷۔ مریم ویبسٹر کالج ڈیجیٹل ڈکشنری۔

۴۸۔ ہارون انیس،فیمینزم اور پاکستانی عورت،ص۱۳۔

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ناصر عباس نیر،متن، سیاق اور تناظر(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۲ء)،ص۹۱۔

۵۱۔ ہارون انیس،فیمینزم اور پاکستانی عورت،ص۱۲۔

۵۲۔ زاہدہ حنا،عورت: زندگی کا زنداں،ص۱۶۔

۵۳۔ ایضاً،ص۱۷۔

۵۴۔ فہمیدہ ریاض،"فیمینزم اور ہم"مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن،(کراچی:وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)،ص۳۵۔۳۶۔

۵۵۔ ایضاً،ص۳۶۔

۵۶۔ ناصر عباس نیر،متن، سیاق اور تناظر،ص۹۰۔

۵۷۔ انسائی کلوپیڈیا آف برٹینیکا۔ http://www.britannica.com/history of feminism retrieved on 23/4/16

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ ایضاً

۶۰۔ نجیبہ عارف،"تانیثیت کے بنیادی مباحث:اقبال کا نقطۂ نظر"مشمولہ تحقیق،(جام شورو،شمارہ ۱۸،۲۰۰۹ء)،ص۲۵۷۔

۶۱۔ انسائی کلوپیڈیا آف برٹینیکا۔ http://www.britannica.com/history of feminism retrieved on 23/4/16

۶۲۔ نجیبہ عارف،تانیثیت کے بنیادی مباحث: اقبال کا نقطۂ نظر،ص۲۵۸۔

۶۳۔ ایضاً،ص۲۵۹۔

۶۴۔ فرزانہ کوکب،ارم سلیم،"کشور ناھید اور زاہدہ حنا:تانیثی شعور(منتخب اخباری کالموں کے تناظر میں)" مشمولہ بازیافت،(لاہور:شمارہ ۲۲،جنوری تا جون ۲۰۱۳ء)،ص۱۲۴

۶۵۔ ناصر عباس نیر،جدید مابعد جدید تنقید(کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۰۴ء)،ص۲۷۴۔۲۷۵۔

۶۶۔ انسائی کلوپیڈیا آف برٹینیکا۔ http://www.britannica.com/history of feminism retrieved on 23/4/16

۶۷۔ نجیبہ عارف،تانیثیت کے بنیادی مباحث: اقبال کا نقطۂ نظر،ص۲۵۹۔

۶۸۔ ناصر عباس نیر،جدید مابعد جدید تنقید، ص۲۷۵۔

۶۹۔ انسائی کلوپیڈیا آف برٹینیکا۔ http://www.britannica.com/history of feminism retrieved on 23/4/16

۷۰۔ ناصر عباس نیر،جدید مابعد جدید تنقید، ص۲۷۵۔

۷۱۔ کشور ناھید،"ادب اور نسائیت"مشمولہ خاموشی کی آواز مرتبہ فاطمہ حسن، آصف فرخی،(کراچی: وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۳ء)،ص۲۵۔

۷۲۔ شمیم نگہت،"تحریک آزادی نسواں"مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین۔(دہلی:اردو اکادمی،۱۹۹۴ء)،ص۱۸۵۔

۷۳۔ عظمی فرمان،"نسائیت ایک تعارف"مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت،مرتبہ ڈاکٹر قاضی عابد، (اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۶ء)،ص۶۴۔۶۵۔

۷۴۔ فرزانہ کوکب،ارم سلیم،کشور ناھید اور زاہدہ حنا: تانیثی شعور (منتخب اخباری کالموں کے تناظر میں)،ص۱۶۴۔

۷۵۔ نجیبہ عارف،رفتہ و آیندہ(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۸ء)،ص۵۰۔

۷۶۔ سید جاوید اختر،اردو کی ناول نگار خواتین(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص۱۹۔

۷۷۔ ثاقب رزمی،آزادی نسواں کا نیا سویرا(کراچی:مکتبہ دانیال،۱۹۸۲ء)،ص۱۹۔

۷۸۔ وارث میر،کیا عورت آدھی (لاہور:نگارشات پریس،۱۹۸۸ء)،ص۸۰۔

۷۹۔ عقیلہ جاوید،اردو ناول میں تانیثیت(ملتان:بہاؤالدین زکریایونی ورسٹی،۲۰۰۵ء)،ص۵۵۔

۸۰۔ الطاف حسین حالی،"ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کو ہو سکتی ہے"کلیاتِ نثر حالی،مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۷ء)۔

۸۱۔ الطاف حسین حالی،کلیات نظم حالی مرتبہ افتخار احمد صدیقی(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۰ء)،ص۲۳۔

۸۲۔ الطاف حسین حالی،حیاتِ جاوید،(نئی دہلی:ترقی اردوبیورو،۱۹۹۰ء)،ص۲۴۰۔

۸۳۔ تنویرانجم،"نسائی تحریک کاارتقاء"مشمولہ خاموشی کی آواز مرتبہ فاطمہ حسن(کراچی: وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۳ء)،ص۶۶۔

۸۴۔ نجیبہ عارف،رفتہ و آیندہ،ص۵۱۔

۸۵۔ تنویرانجم،"نسائی تحریک کاارتقاء"مشمولہ خاموشی کی آواز مرتبہ فاطمہ حسن، آصف فرخی، (کراچی:وعدہ تکاب گھر،۲۰۰۳ء)،ص۶۶۔

۸۶۔ نجیبہ عارف،رفتہ و آیندہ،ص۵۱۔

۸۷۔ فہمیدہ ریاض(مرتب ومترجم)،ویمنز ورلڈ(کراچی:وعدہ کتاب گھر،۱۹۹۶ء)،ص۱۸۔

۸۸۔ نجیبہ عارف،رفتہ و آیندہ،ص۵۱۔

۸۹۔ شائلہ حسین،اردو ڈرامے کے نمائندہ نسائی کردار: تحقیق، تقابل اورتجزیہ (ملتان:انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ،۲۰۱۴ء)،ص۴۹۔

۹۰۔ ساجدہ زیدی،"تانیثی تنقید"مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت مرتبہ قاضی عابد،(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۶ء)،ص۱۸۲۔۱۸۳۔

۹۱۔ شائلہ حسین،اردو ڈرامے کے نمائندہ نسائی کردار: تحقیق، تقابل اورتجزیہ، ص۴۸۔

۹۲۔ ایضاً،ص۴۸۔۴۹۔

۹۳۔ ایضاً،ص۴۹۔

۹۴۔ ایضاً،ص۵۰۔

۹۵۔ ساجدہ زیدی،"تانیثی تنقید"مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت مرتبہ قاضی عابد،ص۱۸۱۔

۹۶۔ عصمت جمیل،"جدید ادبی تحریکوں میں نسائی شعور"مشمولہ ریسرچ جرنل،(ملتان:انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ،۲۰۱۴ء)،ص۵۰۔

۹۷۔ حمیرا اشفاق،نثر رشید جہاں(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)،ص۱۱۔

۹۸۔ شاہد حسین محمد،عوامی روایات اور اردو ڈراما(نئی دہلی:حسین پبلی کیشنز،۱۹۹۲ء)، ص۴۷۔

۹۹۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، ص۱۹۸۔
۱۰۰۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء)، ص۱۷۔۱۸۔
۱۰۱۔ ایضاً، جلد سوم، ص۲۲۔۲۳۔
۱۰۲۔ ایضاً
۱۰۳۔ ایضاً، ص۲۳۔
۱۰۴۔ داؤد عثمانی، "علامہ راشد الخیری کی تحریروں کا فنی مطالعہ" مشمولہ زبان و ادب، (فیصل آباد: شمارہ ۱۵، ۲۰۱۴ء)، ص۱۰۰۔
۱۰۵۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص۴۴۔
۱۰۶۔ *Report of the Indian Education Commission*، (۱۸۸۳ء، جلد ۱)، ص۴۸۳۔
۱۰۷۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند: ۱۸۵۷ء، فصل اول، (سندھ: اردو اکیڈمی ۱۹۸۶ء)، ص۱۲۵۔
۱۰۸۔ مبارک علی، تاریخ اور عورت (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ص۴۸۔
۱۰۹۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء)، ص۲۷۶۔۲۷۷۔
۱۱۰۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ص۲۶۔
۱۱۱۔ کشن پرشاد کول، ادبی و قومی تذکرے (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، س۔ن)، ص۸۰۔
۱۱۲۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص۶۷۷۔۶۷۹۔
۱۱۳۔ آر۔ تراچند (R.Tarachand)، *History of fredeam movement in India*، شمارہ ۱، (دہلی، ۱۹۶۵ء)، ص۴۲۱۔
۱۱۴۔ سید افتخار احمد بلگرامی، حیات النذیر (دہلی: شمس پریس، ۱۹۱۲ء)، ص۱۸۔
۱۱۵۔ ابو اللیث صدیقی، آج کا اردو ادب (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس)، ص۳۲۔۳۳۔
۱۱۶۔ فاطمہ حسن، زخ ش: حیات و شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص۵۶۔
۱۱۷۔ نور الحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان (علی گڑھ: ایجوکیشنل ہاؤس، ۱۹۷۹ء)،

ص ۶۳۔

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۱۱۹۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)، خطباتِ سرسید، جلد دوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء)، ص ۵۱۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔

۱۲۲۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مکتوباتِ سرسید (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۵۱۔

۱۲۳۔ نعیم مظہر، "سرسید کا نظریہ تعلیم نسواں" مشمولہ تخلیقی ادب، (اسلام آباد، شمارہ ۶، جون ۲۰۰۹ء)، ص ۳۹۳۔

۱۲۴۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)، سید احمد کا سفرنامہ پنجاب (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۴۲۔۱۴۴۔

۱۲۵۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (شریعتِ اسلام میں مردو عورت کا مرتبہ) مرتبہ سید عبد الواحد معینی، (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۲۵۔

۱۲۶۔ نجیبہ عارف، "تانیثیت کے بنیادی مباحث: اقبال کا نقطۂ نظر" مشمولہ تحقیق، (جام شورو، شمارہ ۱۸، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۶۲۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۲۶۶۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔۲۶۸۔

۱۳۰۔ ایضاً

۱۳۱۔ عزیز احمد، اقبال کی نئی تشکیل (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء)، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴۔

۱۳۲۔ نجیبہ عارف، "تانیثیت کے بنیادی مباحث اقبال کا نقطۂ نظر" مشمولہ تحقیق، ص ۲۶۴۔

۱۳۳۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)، مرتبہ سید عبد الواحد معینی، (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۷۔

۱۳۴۔ اقبال، مقالاتِ اقبال (شریعت اسلام میں مرد و عورت کا مرتبہ)، مرتبہ سید عبد الواحد معینی، (لاہور:

آئینہ ادب،۱۹۸۸ء)،ص ۳۲۲۔

۱۳۵۔ محمد آصف،"تحریک آزادی نسواں اور اقبال"مشمولہ بازیافت،(لاہور:شمارہ ۲۲،۲۰۱۳ء)، ص ۸۲۔۸۳۔

۱۳۶۔ سیمیں ثمر فضل،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ(دہلی:ادارۂ فکر جدید،۱۹۹۱ء)،ص ۱۲۵۔۱۲۶۔

۱۳۷۔ نذیر احمد،مراۃ العروس(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص ۱۲۰۔

۱۳۸۔ نذیر احمد،بنات النعش(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص ۸۸۔

۱۳۹۔ ایضاً۔

۱۴۰۔ نذیر احمد،ایامیٰ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص ۱۴۵۔

۱۴۱۔ نذیر احمد،بنات النعش،ص ۱۶۰۔

۱۴۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی،مجالس النساء(پانی پت:حالی پریس،۱۹۲۴ء)،ص ۲۵۔

۱۴۳۔ ایضاً،ص ۱۴۔

۱۴۴۔ ایضاً۔

۱۴۵۔ ایضاً ص ۵۳۔

۱۴۶۔ ایضاً،ص ۵۴۔۵۷۔

۱۴۷۔ ایضاً،ص ۵۶۔

۱۴۸۔ ایضاً،ص ۳۱۔

۱۴۹۔ ایضاً،ص ۵۰۔

۱۵۰۔ ایضاً،ص ۶۰۔

۱۵۱۔ ایضاً،ص ۶۱۔

۱۵۲۔ اختر الباری،اردو کی ناول نگار خواتین،مقالہ ایم۔اے اردو(لاہور:پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء)،ص ۵۴۔

۱۵۳۔ سہیل بخاری،اردو میں ناول نگاری(لاہور:میری لائبریری،۱۹۶۶ء)،ص ۹۱۔۹۲۔

۱۵۴۔ علامہ راشد الخیری، صبح زندگی(کراچی:انجمن پریس،۱۹۷۷ء)،ص ۴۔

۱۵۵۔ صغرا مہدی، "اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۵۔

۱۵۶۔ ایضاً۔

۱۵۷۔ علامہ راشد الخیری، مجموعہ راشد الخیری (نوحۂ زندگی) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۸۰۔

۱۵۸۔ داؤد عثمانی، "علامہ راشد الخیری کی تحریروں کا فنی مطالعہ" مشمولہ زبان و ادب (فیصل آباد: شمارہ ۱۵، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۰۰۔۱۰۱۔

۱۵۹۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۹۷۔

۱۶۰۔ داؤد عثمانی، علامہ راشد الخیری کی تحریروں کا فنی مطالعہ، ص ۹۷۔

۱۶۱۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید (لکھنؤ: س۔ن۔)، ص ۳۳۸۔

۱۶۲۔ ریحانہ کوثر، "محمدی بیگم زوجہ شمس العلما مولوی ممتاز علی: اردو صحافت کی پہلی ایڈیٹر" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (ملتان: شمارہ ۲۰، دسمبر ۲۰۱۱ء)، ص ۱۰۴۔۱۰۵۔

۱۶۳۔ سیمیں ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ (نئی دہلی: ادارہ فکر جدید، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۱۴۔

۱۶۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۱۶۵۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔۱۱۴۔

۱۶۶۔ رازق الخیری، "عصمت کے پچاس سال" مشمولہ عصمت، جلد ۱۰۱ (دہلی: ۱۹۵۸ء)، ص ۴۔۶۔

۱۶۷۔ فاطمہ حسن، ز۔خ۔ش: حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۹۲۔

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۱۶۹۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اسلام آباد: رمنا پریس، س۔ن۔)، ص ۳۔۵۔

۱۷۰۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، جلد چہارم (دہلی: مطبوعہ یونین پریس، س۔ن۔)، ص ۴۵۶۔

۱۷۱۔ رازق الخیری، عصمت کے پچاس سال، ص ۱۹۔

۱۷۲۔ فاطمہ حسن،ز۔خ۔ش: حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۹۹۔

۱۷۳۔ ایضاً،ص۱۰۱۔

۱۷۴۔ ایضاً،ص۱۰۳۔

۱۷۵۔ ایضاً،ص۱۰۵۔

۱۷۶۔ مولانا امداد صابری،تاریخ صحافت اردو،جلد سوم(دہلی:دہلی پریس،۱۹۶۳ء)،ص۳۳۴۔

۱۷۷۔ نسیم آرا،اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ(کراچی:انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۸ء)،ص۷۷۔

۱۷۸۔ عظمیٰ فرمان،اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ(کراچی:کراچی یونیورسٹی پریس،۲۰۰۰ء)،ص۱۳۔۱۵۔

باب دوم

نذر سجاد حیدر اور معاصر خواتین قلم کاروں کے سماجی، معاشرتی اور فکری رویوں کا تجزیاتی مطالعہ

بیسویں صدی کے اوائل میں جب اصلاحی ناول لکھے جارہے تھے، اس وقت عورتوں نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ ان کا مقصد لڑکیوں کو صحیح تعلیم دینا اور امور خانہ داری بتانا تھا ان کی غرض حسن و عشق کی کہانی سنانا نہ تھی اور نہ جنسیات، اقتصادیات و سیاسیات کے مسائل سے بحث ان کا مقصد تھا۔ یہ سب کی سب کتابیں نذیر احمد کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ ان عورتوں میں رشیدۃ النساء، صغرا ہمایوں، محمدی بیگم اور نذر سجاد حیدر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ خواتین میں بیداریٔ و اصلاح کی لہر بیدار کرنے میں نذر سجاد حیدر کا نام سرِ فہرست ہے۔

نذر سجاد حیدر، قرۃ العین حیدر کی والدہ اور نامور رومانوی افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کی زوجہ تھیں۔ نذر سجاد حیدر اردو کی اولین قصہ گو خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں میر نذر الباقر کے ہاں پیدا ہوئیں اور ان کا نام مسرت تنویر رکھا گیا۔ انھوں نے پہلے پہل بنتِ نذر باقر کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ نذر نے اپنے زمانے کے مشہور رسائل تہذیب النسواں، خاتون اور عصمت میں افسانے، مضامین اور ناول لکھ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔

نذر سجاد حیدر مولوی ممتاز علی کے اخبار "پھول" کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں جو پنجاب ٹیکسٹ بک کمپنی کے نصاب میں بھی شامل رہیں۔ نذر سجاد حیدر نے تقریباً دس ناول اور دو سو افسانے لکھے جن میں سے اختر النساء بیگم، آہِ مظلوماں، جاں باز، نجمہ اور حرماں نصیب زیادہ مقبول ہوئے۔ بقول قرۃ العین حیدر "نذر اپنے وقت کی سب سے پونیر لیڈی تھی جن کا مقصد خواتین کو شعور و آگاہی فراہم کرنا تھا۔ نذر سجاد حیدر کو سمجھنے کے لیے ان سے پہلے اور بعد کی خواتین قلم کاروں کے سیاسی و سماجی رویوں کا مطالعہ ضروری ٹھہرتا ہے جنھوں نے اپنی تحریری و عملی دونوں حوالوں سے حقوقِ نسواں کی تحریک کو تقویت بخشنے کی کوشش کی۔ ان میں سب سے اوّلین نام رشیدۃ النساء بیگم کا ہے۔

رشیدۃ النساء:

اردو کے نامور ادیب محقق اور مذہبی اسکالر امداد امام اثر کی ہم شیرہ رشیدۃ النساء اردو کی پہلی باقاعدہ ناول نگار خاتون ہیں۔ جنھوں نے ایک اصلاحی، سماجی اور مقصدی ناول اصلاح النساء تحریر کیا۔ یہ ناول مسلمان عورتوں کی اصلاح کے لیے تحریر کیا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد مسلمان گھرانوں میں در آنے والے لغو رسومات اور توہمات کا انسداد تھا۔ یہ مولوی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ تعلیم کی کمی نے مسلم معاشرے کی جہالت میں اضافہ کر دیا تھا۔ بے شمار ہندورانہ توہمات اور رسومات نے اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ طبقہ اناث بالخصوص اس جہالت کا شکار تھا۔ جدید تعلیم کی بدولت مرد معاشرے کے بدلتے حالات سے براہ راست متاثر ہو رہے تھے مگر گھر کی چار دیواری میں قید عورت کو یہ موقع نہ ملا۔ ایسے حالات میں رشیدۃ النساء نے خواتین کے مسائل اور خامیوں پر مبنی یہ قصہ لکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ انھوں نے یہ قصہ نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس سے متاثر ہو کر لکھا، جس کا اعتراف خود مصنفہ نے کرتے ہوئے لکھا:

> اللہ مولوی نذیر احمد کو عاقبت میں بڑا انعام دے ان کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا۔ اور اب جو ہم جانتے ہیں انشااللہ تعالیٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی، تو مجھے امید ہے کہ انشااللہ سب اصغری ہو جائیں گی۔ شاید سو میں ایک بدقسمتی سے "اکبری" رہ جائے تو رہ جائے۔ میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہو گی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہو گا اور سمجھیں گی کہ اس نے عورت کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی لکھا ہے۔[1]

مصنفہ نے اس ناول میں زور بیان اور قوتِ مشاہدہ سے کام لیتے ہوئے اس زمانے کی بالخصوص نسوانی معاشرت کی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہوئے ایک موقع پر خوشا کی بارات کا منظر اس طرح پیش کیا:

پھر ایک لال کپڑا چالیس گز کا عبا ڈیوڑھی سے مانجھے خانے کے دروازے تک بچھا دیا گیا۔ سب مانجھے خانے کے دروازے کے اندر دلہن کو بٹھا کر بیچ میں ایک لال کپڑے کا پردہ عورتیں لے کر کھڑی ہو گئیں۔ وہاں یہ رسم ہوئی کہ دلہن کے ہاتھ میں لال کپڑے لپٹنے کے بعد ذرا سا تیل اور گڑ رکھ کر پردے سے باہر ہاتھ نکالا۔ مراثن نے دولہا سے کہا میاں اس کو بھیڑ کی طرح منھ سے کھایئے مجبور ہو کر امتیاز الدین نے تل گڑھ منھ سے کھایا۔[۲]

اصلاح النساء اس دور کی رسموں اور اوہام کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اس سے معاشرتی تاریخ با آسانی مرتب کی جاسکتی ہے۔ مصنفہ نے گھریلو زندگی پر گہری نگاہ ڈالی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے نسوانی کردار پیش کیے ہیں جو تعلیم کے فقدان کے باعث توہم پرست ہیں۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے غیر حقیقی طریقوں تعویز گنڈوں، ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیتے ہیں اور وزیرن جیسی عورتوں کے ہتھکنڈے چڑھ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ محض عورتوں کی گھریلو زندگی پر چھائے ہوئے جہالت کے سائے ہیں جس کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار کہتی ہیں:

اکثر عورتیں دن رات وہم کی پتلا بنی رہتی ہیں ہزاروں ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں، گناہ کا گناہ الگ اور روپے کی بربادی الگ اور فائدہ خاک نہیں۔[۳]

رشیدۃ النساء نے اس زمانے کی ناخواندہ عورت کی فرسودہ رسومات اور بدعات پر گہرا طنز کیا ہے اور ان کی بہت سے حرکتوں کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ شادی کے موقع پر جب مامائیں اور اصیلیں چلا چلا کر اللہ میاں کا گیت گاتی ہیں تو مصنفہ اپنے ایک کردار سے اس کی یوں مذمت کراتی ہے "کریم النساء آہستہ سے بولی کہ جب تم کو دین و ایمان کی خبر نہیں تو اللہ میاں کو کوٹھے پر بٹھاؤ جو چاہو بناؤ۔۔۔۔ اور جا کر سو رہیں۔"[۴]

یہاں مصنفہ نے شادی بیاہ کی اُن رسومات کا بھی تذکرہ کیا جو شعوری و غیر شعوری بیوہ کی دل آزاری کا باعث بنتی ہیں۔ مہندی، مایوں ایسی کئی رسومات میں ایسی لڑکیوں کی شرکت کو نحوست گردانتے ہوئے انھیں نزدیک ہی نہیں آنے دیا جاتا۔

جن کا سن بارہ برس، چودہ برس یا پچیس ہی برس کا ہے کہ بیوہ ہو گئیں۔ جب برس چھ مہینے ہو گئے تو بے چاریاں برادری کے خیال سے شادی میں شریک ہوئیں اور وہاں یہ چھوت ہو گئی کہ دلہن کے کپڑوں کو بیوہ نہ چھوئیں تو ضرور ان کے دل میں یہ بات آئے گی کہ ہائے اگر ہم بھی سہاگن رہتے تو سب چیزوں کو اس وقت چھوتے دیکھتے، یہ تو صاف صاف ان کو بُلا کر ان کے دلوں کو دکھ اور صدمہ دینے اور ان کے بھولے بسرے غم کو تازہ کرنا ہوا یا نہیں؟ کیسی مہمان نوازی ہے؟ یا تو لوگ بلائیں نہیں اور جو بلائیں تو اس قسم کے ٹونے ٹوٹکے سے مہمان کا دل نہ دکھائیں۔[۵]

دراصل مصنفہ نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں میں زور پکڑتی سماجی برائیوں مثلاً توہم پرستی، ٹونے ٹوٹکے، بدعتوں اور فضول خرچیوں اور جہالت کو دور کرنے کے لیے اس ناول کی تصنیف کی۔ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ مصنفہ وہابی تحریک سے متاثر تھیں جو اس زمانے میں زور پکڑ چکی تھی۔ صادق پور پٹنہ اس تحریک کا مرکز تھا اور مصنفہ کو صادق پور سے گہرا تعلق تھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب سے انھیں خاص عقیدت تھی۔ اس لیے اصلاح النساء میں اس کا اثر نمایاں ہے۔ مصنفہ جہالت اور توہم پرستی پر طنز کرتے ہوئے اصلاح النساء میں کہتی ہیں کہ ہزاروں روپے بیماریوں میں علاج کی بجائے جھاڑ پھونک، جادو، سحر، تعویز اور فریبی ملاؤں کی نذر ہو جاتے، کیوں کہ یہ معاشرہ انگریزی علاج کو بُرا سمجھتا تھا اس لیے بیماریوں اور حادثات کو بھوت پریت کا سایہ اور بدشگونی کہہ کر عورتیں ٹونے ٹوٹکوں کی طرف مائل ہو جاتیں۔ اصلاح النساء گھریلو عورتوں کے اسی بدعتی ذہن کا عکاس ہے۔

> ۔۔۔۔جب چیچک کسی لڑکے کو دیکھائی دیتی ہے، ماتا میا نام رکھا جاتا ہے، لڑکے کا نام لے کر پکارنا منع ہو جاتا ہے، کیا مجال کہ کوئی نام لے کر پکارے، سب لوگ ماتا میا کہہ کر پکارتے ہیں۔ شام کو راہ ٹھنڈی کی جاتی ہے، کوئی شخص پانی گراتا ہوا دروازے سے باہر تک جاتا ہے، بہت سی ایسی چیزوں کا پرہیز جو کہ ہندوؤں کے ہاں ہوتا ہے، مسلمانوں کے ہاں بھی کیا جاتا ہے، جیسے دال وغیرہ کا نہ بگھارنا، گدھے کو چنے کھلانا، مالنوں کو بلا کر بھجن گوانا، گنگا پوجا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور آخر کو ماتا پوجنے کی نوبت آتی ہے۔[۶]

رشیدۃ النساء ناول کے ذریعے لڑکیوں کو اچھی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ناول میں لاڈلی اور اشرف النسا جیسے کردار تخلیق کرتی ہیں۔ لاڈلی رجعت پسند خیالات کی ترجمان ہے جب کہ اشرف النساء جدید تعلیم کے ثمرات و فوائد گنواتی ہے۔ جس سے شخصیت کی تعمیر ہونے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ مصنفہ نے اصلاح النساء کی تصنیف اور اس کے لکھنے کے سبب پر بھی روشنی ڈالی۔

> بے تعلیم لوگ اپنی زندگی کے دن بڑی مصیبت سے پورے کرتے ہیں اس لیے میرا ارادہ بہت دنوں کا تھا۔ کہ میں ایک کتاب ایسی لکھوں جو ظاہر میں بطور سچے قصے کے ہوں اور در حقیقت اس میں اچھی اچھی نصیحتیں ہوں تاکہ اس کتاب کے پڑھنے سے میری ہم جنسوں کو دینی دنیاوی فائدے پہنچیں۔۔۔[۷]

یہاں مصنفہ ہندوستانی سماج کی اس سوچ کو بھی وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں جہاں بچے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی ذمہ داری بھی صرف ماں پر ڈالی جاتی ہے۔

> ۔۔۔۔۔ اپنی بیٹی بسم اللہ کی نہ تعلیم کا ان کو خیال تھا اور نہ اس کی طرف کچھ توجہ کی۔۔۔ پڑھانے لکھانے کا تو کیا ذکر، کوئی ڈھنگ سکھانے والا بھی نہ تھا۔۔۔ اگرچہ محمد معظم نے بہت چاہا کہ لڑکی پڑھ اور ڈھنگ سیکھے، مگر جب ماں کی توجہ نہ تھی ان کی کوشش کیا کارآمد ہو سکتی تھیں۔[8]

غرض اصلاح النساء مسلمان عورتوں کی اصلاح کے لیے تصنیف کی گئی۔ خواتین ناول نگاروں میں پہلا ناول ہے جس کے ذریعہ تعلیم نسواں کی اہمیت اور بری رسموں کی ممانعت کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی گئی۔ ناول نگار مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ۔۔۔۔۔ اگر آپ ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں عورتوں کی اچھی تعلیم کرتے تو آج کے دن اتنے روپے بے کار کیوں برباد کرتے۔ اب سب واہیات باتیں اس طرح عورتوں کے دل میں جمی ہوئی ہیں کہ ان کا مٹانا بھی مشکل ہے، کسی کے سمجھانے سے کوئی نہیں مانتا ہے۔[9]

رشیدۃ النساء نے مسلم گھرانوں کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور خواتین کے مسائل کو خواتین کرداروں کے ذریعے ہی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بسم اللہ کے کردار کی صورت میں یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ عورت تعلیم کے ذریعے زندگی کے کئی افق کھول سکتی ہے اور تعلیم کی بدولت جہالت کے اندھیروں کو تابناکی میں بدل سکتی ہے۔ مصنفہ کا اندازِ بیاں نہایت دل چسپ اور خوب صورت ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی یہ ناول اردو کے ابتدائی ناولوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

محمدی بیگم:

نامور ادیب و ناشر شمس العلما، مولوی سید ممتاز علی کی بیوی اور مشہور ڈارامہ نگار،، سید امتیاز علی تاج کی والدہ محمدی بیگم خواتین ناول نگاروں میں رشید النساء کے بعد ایک اور اہم نام ہیں۔ محمدی بیگم (۱۸۷۹ء-۱۹۰۸ء) نے تہذیب نسواں کی ادات کے فرائض بھی سر انجام دیے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات بے شمار ہیں۔

شریف بیٹی، صفیہ بیگم اور آج کل ان کے مشہور ناول ہیں۔ محمدی بیگم کی تصانیف امور خانہ داری اور اصلاح رسوم پر مبنی ہیں۔ محمدی بیگم بچپن کی منگنی کے خلاف تھیں اور اس رسوم کو شریعت کے خلاف سمجھتی نہیں۔ انھوں نے اپنے ناول صفیہ بیگم جس کی پہلی مرتبہ اشاعت ۱۹۰۳ء میں ہوئی میں بچپن کی منگنی کا عبرت ناک قصہ بیان کر کے اکیلی صفیہ بیگم کے جذبات کی ہی ترجمانی نہیں کی بل کہ اس دور کی ان بے شمار معصوم

اور بے بس بیٹیوں کی دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی بھی غماری کی ہے۔ جو ناول کی ہیروئن صفیہ بیگم کی طرح اس قبیح رسم کے بھینٹ چڑ جاتی ہیں اور بالا آخر مسلسل ذہنی صدیوں کو سہتی ہوئی دنیا سے چل بستی ہے۔

صفیہ بیگم سماج سے تو نہ لڑ سکی لیکن اپنے وصیت نامے میں کہتی ہے:

> اے بزرگو: مت بیاہو اپنی بیٹوں کو بد چلن لڑکوں سے ورنہ تمھاری وہ بیٹی جس کی آنکھ میں ذرا سے مرض کے آنسو دیکھ کر تم گھبرا جاتے ہو اور دوائیں سر مے لگاتے پھرتے ہوا۔ تمام رات اور تمام دن رنج و غم میں گھلے گی اور لہو کے آنسو روئے گی۔ مت بیاہو اپنی بیٹی کو ایسے شخص کے ساتھ جس کو وہ دل سے پسند نہ کرتی ہو۔ ورنہ اس کی تمام عمر رنج و غم میں کٹے گی وہ خود روتی اور اوروں کو رلاتی رہے۔[10]

> اے بزرگو: میری آخری التجا ہے کہ تم اپنی اولاد کے بیاہ میں جان توڑ کر چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی کی جاتی ہے۔ اسی طرح علم کی صحت جسمانی کی، عادات کی، چال چلن کی مزاج کی کیفیت کی۔ اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضامندی کی کی جائے۔[11]

محمدی بیگم اس قصہ کے ذریعے بچپن کی منگنی جیسے سماجی کوڑھ کو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے کاٹ کر الگ کر دینا چاہتی تھیں۔شریف بیٹی(۱۹۰۸ء) میں مصنفہ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا۔ اس قصہ کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے مولوی سید ممتاز علی لکھتے ہیں:

> آج کل کے مصنف لڑکیوں کے لیے جتنی بھی کتابیں لکھ رہے ہیں وہ عموماً سب امیرانہ شان دار زندگی کے قصے ہوتے ہیں۔ لیکن غریب ہندوستان کے لیے ان قصوں کی اتنی ضرورت نہیں امیر گھرانوں کے قصے پڑھ پڑھ کر غریب لڑکیوں کو اپنی زندگی بری معلوم ہوتی ہے۔[12]

شریف بیٹی غربت میں آنکھ کھولنے والی ایک باہمت لڑکی کی داستان ہے جو اپنی محنت و ہمت کی بناء پر حالات کا دھارا موڑنے پر قادر ہو جاتی ہے۔ شریف النساء کمسن ہی تھی کہ اس کا باپ عبد الغنی جو بیس روپے ماہوار کا ملازم تھا۔ خدا کو پیارا ہو گیا اللہ نے شریف النساء کو ذہن رسا عطا کیا تھا۔ اس نے سلائی کشیدہ کاری کی بدولت گھر کی بد حالی کو آسودہ حالی میں تبدیل کیا۔ بل کہ اپنی بیمار ماں کے علاج کرایا اور اپنے دونوں بھائیوں کو تعلیمی سہولیتں بہم پہنچائیں ایک بھائی بیرسٹر بنا اور دوسرا سول سرجن۔

شریف بیٹی میں مصنف نے عورتوں کو علم و ہنر کی فیوض و برکات سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے بہ وقت ضرورت طبقہ اناث نہ صرف معاشی دشواریوں سے عہدہ بر آ ہو سکتا ہے بل کہ خاندان کی معاونت بھی کر سکتا۔ آج کل محمدی بیگم کا آخری اور اپنے زمانے کا مقبول ترین ناول ہے۔ یہ چوں کہ صفحات پر مشتمل فہمیدہ کی

کہانی ہے جو بہت سی خوبیوں کی مالک ہونے کے باوجود اپنی ایک بری عادت آج کا کام کل پر ڈالنا کی وجہ سے بدترین انجام کی سزا اور ٹھہرائی جاتی ہے۔ اس کا ہر کام جائیداد اجڑ جاتی ہے۔ اکلوتا بیٹا یوسف کوٹھے سے گر کر مر جاتا ہے۔ انجام کار جب شوہر اس کے ناز نخروں کے الجھاؤ سے باہر آتا ہے تو سب نتائج کا ذمہ دار فہمیدہ کو ٹھہرا کر طلاق دے کر گھر بھیج دیتا ہے۔

محمدی بیگم نے بہت کم عمر پائی اور اس میں بھی ادبی سطح پر بھی وہ کارہائے نمایاں سر انجام دیئے کہ اہل قلم عورتیں بھی فکشن کی طرف مائل ہوئیں۔ اسی عہد میں فن قصہ گوئی کے میدان میں اکبری بیگم کا نام سامنے آتا ہے۔ چوں کہ اس دور میں مسلمان گھرانوں کی عورتوں کا اپنا نام ظاہر کرنا عیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ادبی دنیا میں والدہ افضل علی کے نام سے مقبول ہوئیں۔

اس صدی میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا وہ اردو ادب کے ورثے میں ایک اہم اور باوقار اضافہ ہے۔ خواتین نے تخلیقی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کر دیا۔ لاہور سے محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) رسالہ ''تہذیب نسواں'' نکال رہی تھی۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ ہندوستان کا تیسرا بڑا اخبار تھا۔ جو خاص طور پر خواتین کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس کی ایڈیٹر محمدی بیگم تھی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی۔

تہذیب نسواں محترمہ محمدی بیگم نے لڑکیوں کے فائدے کے لیے ۱۸۹۸ء میں جاری کیا۔ [۱۳]

یہ لاہور سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ اس کی قیمت سالانہ تین روپے چار آنے تھی۔ اس کے مقاصد یہ تھے۔ مستورات کے لیے اخلاق و خانہ داری اور تربیت اولاد کے متعلق مضامین چھاپنا۔ اس کے صفحات شروع میں آٹھ پھر بارہ اس کے بعد سولہ اور آخر میں چوبیس ہو گئے۔ سید ممتاز علی نے ''تہذیب نسواں'' کے اجرا میں پیش آنے والی مشکلات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ:

---جب میری پہلی بیوی کے انتقال کے بعد عقد ثانی ہوا اور بیوی پڑھی لکھی اور ذہین ملی تو شوق کی آگ میرے دل میں مدت سے دبی ہوئی سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی اور میں نے عقد کے چند گھنٹوں بعد یہ فیصلہ کیا کہ مستورات میں بے داری پیدا کرنے کے لیے اخبار جاری کروں گا۔ اور اپنی اہلیہ کو اس کا ایڈیٹر بناؤں گا۔ میں نے انھیں اس کام کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔۔۔ ہم مجوزہ اخبار کا نام تجویز کرنے لگے دس بارہ نام ہم دونوں نے تجویز کیے اور اتنے ہی دوستوں نے، تجویز یہ ہوئی کہ سب نام سرسید کو بھیج دیے جائیں اور وہ جو نام پسند کریں وہی نام رکھ دیا جائے۔ [۱۴]

رسالہ ''تہذیب نسواں'' کے ہر حصے پر دو کالم ہوتے تھے اس رسالے کے مختصر مضامین خواتین کی دل چسپی کے لیے شائع ہوتے تھے۔ ایک کالم ''خبریں اور نوٹ'' کے عنوان سے تھا۔ دنیا بھر کی دل چسپ معلوماتی خبریں اس میں چھپتی تھی اور شائع ہوتی تھی۔ آیندہ آنے والے شمارے کے مضامین کا اعلان پہلے شمارے میں کر دیا جاتا تھا۔ نا قابل اشاعت مضامین کی فہرست بھی دے جاتی۔ عورتوں کے نجی مسائل اور شکایات کا جواب دینے کے لیے ایک کالم ''محفل تہذیب'' کے عنوان سے تھا۔ یہ نہایت مفید اور کارآمد سلسلہ تھا۔ خواتین کے مسائل اور ان کے حل کے طریقوں پر آزادانہ بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۵ جون ۱۹۲۶ء کے شمارے میں نذر سجاد کا مضمون اس مسئلے پر شائع کیا گیا کہ شادی کے وقت لڑکیوں سے ان کی مرضی معلوم کی جانی چاہیے یا نہیں لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر سے ملاقات کا موقع دینا چاہیے۔ یہ ساری تجویز قارئین سے پوچھی گئی۔ اس زمانے کے قدامت پسندانہ ماحول میں ایسے مضامین کا شائع ہونا جرات مندانہ قدم تھا۔ ''تہذیب نسواں'' میں اولاد کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ایسے مضامین بھی شائع ہوتے جو عورتوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے۔

> تہذیب نسواں طویل عرصے تک جاری رہنے کے بعد آخر کار ۱۹۴۹ء میں بند ہو گیا۔ اس اخبار نے برصغیر کی خواتین کی فطری۔ تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے تربیت کا جو فریضہ انجام دیا۔ وہ کسی دوسری اخبار کے حصے میں نہیں آیا۔[۱۵]

"تہذیب نسواں" پر لوگوں نے گندھی گالیوں کا تانتا باندھ دیا۔ اخبار نمونے کے طور پر بھیجے جاتے لوگ انھیں گالیاں لکھ کر واپس بھیج دیتے۔ خطوط اتنے ذلت آمیز ہوتے کہ خط کھولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ''محمدی بیگم'' کے بارے میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ جو مضامین لکھتی ہیں۔ یہ اصل میں ممتاز علی کے تحریر کردہ ہوتے ہیں۔ چناں چہ لوگوں نے اس کی تصدیق کے لیے ایک یورپین لیڈی کو محمدی بیگم کا امتحان لینے کے لیے بھیجا۔ محمدی بیگم اس پر پورا اتریں۔ لیکن لوگوں کا شک پھر بھی باقی رہا۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں۔

> تہذیب نسواں کی مخالفت میں قدامت پسند حضرات انتہائی پست سطح پر اتر آئے، انھوں نے اس اخبار کے مقابلے میں طوائف اللہ دی نزاکت سے ایک اخبار جاری کرا دیا۔[۱۶]

''تہذیب نسواں'' کو ابتدا میں جس قدر مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا اس کا مستقبل اتنا ہی تابناک تھا۔ محمدی بیگم کی محنت سے اخبار نے دن دگنی و رات چوگنی ترقی کی۔ تہذیب نسواں کے علاوہ محمدی بیگم نے ایک اور رسالہ ''مشیر مادر'' جاری کیا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ محمدی بیگم ۳۰ سال کی عمر میں ۱۹۰۸ء میں شملہ میں انتقال کر گئیں۔ ''تاج پھول''، ''ریاض پھول''، ''امتیاز پچیسی''، ''چوہے بلی نامہ''، ''دل چسپ کہانیاں''، ''تین بہنوں کی کہانیاں''،

''آداب ملاقات'' اور ''خانہ داری'' وغیرہ محمدی بیگم کی یادگار تصانیف ہیں جو تربیت اولاد اور اصلاح نسواں سے متعلق ہیں۔[۱۷]

ایک اور توجہ طلب رسالہ ''گل دستہ ناز'' تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا جو بمبئی محلہ دوٹانکی ایلسک روڈ سے پندرہ جون ۱۸۸۴ء کو جاری ہوا اس کی مالک بلقیس جہاں بیگم ناز تھی، اور ایڈیٹر فاطمہ بیگم تھی محتمم منشی ریاض علی عاشق تھے۔ بلقیس جہاں بیگم ناز خود شاعرہ تھی اور ان کا کلام بھی گل دستہ ناز کے پرچوں میں شائع ہوتا تھا۔[۱۸]

اکبری بیگم:

اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر کی سگی پھوپھی تھیں۔ انھوں نے پہلا ناول گل دستہ محبت کے نام سے لکھا جو عباس مرتضٰی کے فرضی نام سے پبلک پریس مراد آباد سے شائع ہوا۔ اکبری بیگم کا دوسرا ناول گورڈ کا لال تھا۔ جو (۱۹۰۷ء) میں پہلی بار طباعت کے مراحل سے گزرا۔ اور نسبت جلد اس ناول نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ مقبول قرۃ العین حیدر:

> ۔۔۔بہت جلد اس نے مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائیل کی حیثیت اختیار کی لی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔[۱۹]

اکبری بیگم کا سماج مردانہ سماج تھا جہاں لڑکیوں کی تعلیم غیر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ انھیں آزادانہ زندگی جینے کا بھی حق حاصل نہ تھا۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں جو عورت سامنے آئی اس کی شخصیت دبی اور کچلی ہوئی تھی۔ ایسے میں تعلیم کے فقدان کے باعث ان کی گھریلو زندگی بھی متاثر ہوئی۔ اکبری بیگم ترقی پسند خیالات کی حامل تھیں۔ انھوں نے نام نہاد پدر سری سماج کے ہاتھوں حقوق نسواں کی تذلیل کے خلاف آواز بلند کی اور عورتوں کی ابتر حالت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ گورڈ کا لال جو اپنی اشاعت سے ہی اس دور کی خواتین میں خصوصی حیثیت اختیار کر گیا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے تین الگ گھروں کی کہانی ان کی طرز زندگی اور کرداروں کے عمل کو تفصیلاً پیش کیا ہے۔ ثریا جبیں کے متوسط گھرانے کے تعارف سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ گھرانہ ثریا جبیں، حسن رضا، مقبول بیگم، اور حیدر علی پر مشتمل ہے۔ ثریا جبیں دراصل اکبری بیگم کے ترقی پسند خیالات کی عکاس قصہ کی ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ باحوصلہ اور خود اعتماد ہیروئن ہے جو بے پردو کالج جاتی ہے اور مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہے۔ یہ کردار ناول میں مصنفہ کی نسائی حسیّت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس کردار کی پیش کش ناول نگار کی اس نفرت کا اظہار ہے جو اسے سماج کے روایتی اصولوں سے تھی۔ وہ عورت کی اصلاح ضروری سمجھتی تھیں جس کے لیے تعلیم ناگریز تھی جس میں پردہ کی

بے جا پابندی ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ اس قدغن کے خاتمے کے لیے وہ اپنی ہیروئن کو بے پردہ مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم کے حصول کے لیے بھیجتی ہیں۔ لیکن اس کا حلیہ اس طرح بناتی ہیں کہ کوئی اس جانب توجہ نہ کرے۔ کیوں کہ انھیں سماجی بندشوں کا بھی بخوبی احساس تھا۔ جس میں عورت کو اپنی مرضی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں چوں کہ وہ بے پردو مخلوط تعلیم حاصل کرے۔ انھوں نے ثریا جبین کا کردار اس طرح پیش کیا جس طرح وہ معاشرہ میں عورت کو دیکھنا چاہتی تھیں نہ کہ جس طرح اس دور کا سماج۔ اکبری بیگم کی حسیّت کا اندازہ ثریا جبین کے بھائی حسن رضا کے ان مکالموں سے بھی با آسانی لگایا جاسکتا ہے جو وہ ایک موقع پر مردانہ ظلم و ستم کے خلاف کہتا ہے۔

> بھائی ہمارے ملک کے مردوں کا مذاق بہت بگڑ گیا ہے۔ عورتوں کی قدر ان لوگوں کو بالکل نہیں ہے۔ اپنا دست نگر سمجھ کر جس طرح چاہتے ہیں سلوک کرتے ہیں ان کو جائز حقوق اور شرعی آزادی سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ علم جیسی نعمت سے محروم رکھتے ہیں۔ نہ کسی قسم کا ہنر ہی سکھاتے ہیں اور پھر ہر طرح سے مورد الزام بتاتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر خدا کی مدد بھی شامل حال ہوئی تو میں اسے بالکل کسی قسم سے مردوں کا دست نگر نہ رکھوں۔ اگر خدانخوستہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہو جیسا ہمارے مرد بے زباں، قابل رحم مستورات کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ اپنی مدد آپ کر سکنے کے قابل ہو۔ [۲۰]

مرد کی زبان سے عورت کے ساتھ جاری ناروا سلوک کا احساس دراصل اس بات کا غماز ہے کہ مردوں کو بھی اس بات کا احساس ہو کہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اکبری بیگم جہاں ایک طرف عورت کی بدحالی کی وجہ

علم سے محرومی کو قرار دیتے ہوئے ثریا جبین کی زبانی کہلاتی ہیں:

> اگر معاشرے میں عورتیں پیچھے ہیں تو اس لیے کہ علم کا دروازہ ہم پر بند کر دیا گیا ہے ۔۔۔ ہنر کو ہمارے لیے معیوب سمجھا گیا۔ صرف آپ لوگوں کی عنایت و مہربانی ہماری زندگی کا ذریعہ ہے۔ [۲۱]

تو دوسری طرف یہ باور کرانا بھی نہیں بھولتیں کہ عورتیں تعلیم کا غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ اسی لیے جب ثریا جبین شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو اپنے ایک اور ترقی پسند خیال کے حامل کردار محبوب بیگم کی زبانی ثریا کو نصیحت کرتی ہیں۔

> آپ کو یہ نظیر نہیں قائم کرنا چاہیے دنیا کہے کہ فلاں خاتون کے زیادہ تعلیم پانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنے قابل ہی کوئی نظر نہیں آتا اور وہ تمام عمر اپنی تعلیم کے غرور میں بن بیاہی رہی۔ آپ یہ نظیر قائم کریں کہ لوگوں کو اپنی مستورات کو تعلیم دلوانے کا شوق پیدا ہو اور کہیں کہ ان کے زیادہ تعلیم پانے کا کیا اچھا نتیجہ نکلا اور کس خوبی سے ان کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ [۲۲]

اکبری بیگم زمانہ شناس عورت تھیں وہ جانتی تھیں ایک پڑھی لکھی عورت کا غیر معتدل رویہ کیسے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کے پروپگنڈے کو دھچکا لگا سکتا ہے اور دوسری لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے میں بے پناہ مسائل کا اضافہ کر سکتا ہے۔

دوسرا گھر یوسف رضا اور خیر النسا کا ہے یہاں مصنفہ نے یوسف رضا اور مقبول بیگم (ہم شیرہ حسن رضا و ثریا جبین) کی ازواجی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ مقبول بیگم تعلیم سے محروم انتہا درجے کی نااہل اور زندگی جینے کے سلیقے سے ناواقف شر کا نمائندہ کردار ہے اپنی قابل نفریں خصلتوں اور عجیب و غریب فطرت کے باعث شوہر کو پریشان اور ازواجی زندگی کو اجیرن بنا لیتی ہے۔ اس کردار کی تخلیق کا مقصد معاشرے کو اس امر کا احساس دلانا کہ تعلیم و تربیت سے محرومی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے اور پھر مقبول بیگم جیسے کردار سامنے آتے ہیں۔ جو اپنی نا اہلی اور نا سمجھی کے باعث اپنی زندگی کو برباد کر لیتے ہیں۔

مصنفہ نے یوسف رضا اور مقبول بیگم کر کرداروں کے ذریعے بناء مرضی کی شادی کے سنگین نتائج کو سامنے لا کر معاشرے کے ایک اور اہم مسئلہ کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مقبول بیگم کے مد مقابل محبوب بیگم کا کردار شریف اور سلیقہ مند لڑکی کا ہے جو یوسف رضا کے گھر کو سنبھالتی ہے۔ اس کی بیٹی پھول کی نہایت توجہ، سلیقہ مندی اور خلوص سے پرورش کرتی ہے۔ اکبری بیگم کا یہ کردار اعلیٰ ظرف، معاملہ فہم، سمجھ دار اور صبر و تحمل کا پیکر ہے جو مقبول بیگم کی ہر شیطانی پر درگزر کا معاملہ کرتا ہے جو اس کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہ کردار خیر کا نمائندہ اور مصنفہ کے ان خیالات کا عکاس ہے اگر لڑکیوں کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم و تربیت کی جائے تو وہ اپنی زندگی کو کامیاب کر سکتی ہیں۔

آگے چل کر مصنفہ نے ایک اور سماجی مسئلہ بے جوڑ شادی کو اس ناول کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں خیر علی اپنے بیٹے حمید کی شادی پھول سے کرنے کے خواہش مند ہیں مگر دونوں کی طبیعتوں میں تضاد دیکھتے ہوئے سب انکار کر دیتے ہیں۔ مسٹر افضال اور ان کی بہن شکیلہ بیگم جیسے پڑھے لکھے ترقی یافتہ کرداروں کی تشکیل بھی اکبری بیگم کی نسائی حسیّت کا اظہار ہے۔

الغرض گورڈ کا لال ایک ایسا ناول ہے جو اپنے مکالموں، تقاریر، پیش کش ہر لحاظ سے مصنفہ کی نسائی حسیت کا عکاس ہے۔

صغرا ہمایوں:

۱۸۸۴ء میں صفدر علی مرزا کے گھر جنم لینے والی صغرا ہمایوں کا شمار بھی اردو کی اولین خاتون ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ صغرا نے جس سماج میں آنکھ کھولی وہاں عورت گھر کی چار دیواری میں قید کی زندگی گزار رہی تھی۔ پردے کے بے جا پابندی کے باعث اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا اور شرفاء اپنی لڑکیوں کا مدرسوں میں بھیجنے کے روادار بھی نہ تھے۔ صغرا علم و ادب کی شوقین تھی اگرچہ ان کی تمام تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہو رہی تھی پر علم کی لگن نے ان کے مختلف معلومات میں اضافہ کیا۔ صغرا نے اپنے بچپن سے عورت کو مسائل میں گھرا دیکھ رہی تھیں۔ چناں چہ مختلف انجمنوں سے جڑ کر خواتین کے رسائل کی ادارت کر کے اس سماجی حصار سے باہر نکالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ جس نے اسے پرانے ریت و رواجوں کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ جہاں اسے تعلیم حاصل کرنے مرضی کی شادی کرنے بے جا پردہ کی قیود کو توڑنے، وراثت کے حقوق مانگنے، کسی علمی و ادبی سرگرمی میں حصہ لینا تو کجا اپنا نام تک ظاہر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے میں صغری ہمایوں آگے بڑھیں عورتوں کی اصلاح، ترقی و آزادی کے لیے باقاعدہ کام کرنے لگیں۔ بقول طیبہ خسرو:

> صغرا بیگم کی اوالعزمی اور عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور لگاؤ نے لاکھوں پردہ نشین خواتین کے
>
> اندھیرے راستے میں اجالے پیدا کر دیئے۔ ان میں عام بے داری پیدا کر دی کہ وہ خود اپنی منزل پہچان سکیں۔ [۲۳]

صغرا ہمایوں نے اپنی شاعری، سفر ناموں، ناولوں اور موسیقی پر عمدہ کتابوں کی صورت میں اردو ادب کو گراں قدر سرمایے سے نوازا۔ انھوں نے جہاں گلشنِ ترنم، نصیحت کے موتی ، بی بی طوریٰ کا خواب، مشیرِ نسواں، موہنی اور سرگز شت، جیسی کتابیں لکھیں وہی سفر نامہ عراق ، سفر نامہ پونا اور والیٹر ، سفر نامہ یورپ ، سفر نامہ بہار و بنگال ، سیاحت جنوبی ہند اور رہبرِ کشمیر جسے سفر نامے بھی لکھے۔

صغرا ہمایوں نے تقریباً چودہ ناول لکھے۔ جن میں تحریر النساء، موہنی مشیر نسواں، "زہرہ" اور سرگزشت ہاجرہ، بہت مقبول ہوئے۔ موہنی میں مافوق الفطرت عناصر ملتے ہیں اور داستانوی، رنگ نمایاں ہے۔ اس میں ایران کی تہذیب و تمدن کی تفصیلی مرقع کشی کی گئی ہے۔ صغرا کی تمام تحریریں اصلاحی مقاصد کی حامل ہونے کے ساتھ تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کرتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناول سرگزشت ہاجرہ (۱۹۳۶ء) ہی کی ہیروئن کو لیجیئے۔ وہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کی شادی حیدر آباد دکن کے ایک ایسے امیر خاندان میں ہوتی ہے جو شراب اور عیش و عشرت کا دل دارہ ہے مگر ہاجرہ اس ماحول میں بھی اپنی قابل تعریف تربیت کی وجہ سے نہ صرف اپنا مقام پیدا کرتی

ہے۔ بل کہ اس ناخوشگوار فضاہی کو بدل ڈالتی ہے۔ وہ وینادار لوگوں کو دین کی طرف مائل کرتی ہے۔ مزید بر آں اس کی تین سہیلیاں جو اسی قسم کی مشکلات سے دوچار تھیں۔ اس کے مشوروں سے اپنے اپنے گھروں کے حالات سنوارتی ہیں۔

مصنفہ نے ہیروئن کے شب و روز کا یک ٹائم ٹیبل درج کیا ہے۔

> صبح کے چھ بجے اٹھتی۔ نماز سے فارغ ہو کر سورۃ یٰسین ضرور پڑھتی۔ باورچی کے پاس سودے کے پیسے بھجوا دیتی ماما و مغلانی مل کر اناج نکالیں۔ میں سامنے کھڑی رہتی ۔ نو بجے ہمارے میاں بے دار ہوئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اور ہم مل کر باغ میں ٹہلے۔ مالی کو بتلائے یہ درخت یہاں لگاؤ۔ وہ گملا وہاں رکھو۔ اس کے بعد میز پر کھانا کھا کر وہ کچہری جاتے۔ تھوڑی دیر کے لیے میں اپنی والدہ کے پاس چلی جاتی۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن سے دل بہلاتی ۔ پانچ بجے اپنے گھر واپس آتی وہ بھی آجاتے۔ چائے پینے کے بعد وہ باہر چلے جاتے۔ میں اندر اخبار یا کتاب پڑھتی۔ جب شام ہوتی وہ یہ کہہ کر چلے جاتے کہ فلاں دوست کے ہاں دعوت ہے۔ میں نماز پڑھ کر کتاب پڑھتی یا کبھی سو جاتی۔ ورنہ ان کے آنے تک جاگتی۔ [۲۴]

اس سے ہاجرہ کی تربیت اور دستور العمل کی پابندی کا پتہ چلتا ہے۔ مصنفہ نے قصہ خواتین کو سمجھانے کے انداز میں لکھا ہے۔ اس لیے مقصدیت کے بوجھ تلے دبا نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنی دل چسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ شاید اس لیے کہ ناول نگار نے خواتین کی تربیت اور کامیاب ازواجی زندگی کے اصولوں کو بڑی سادگی اور روانی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

یہ قصہ آپ بیتی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ہاجرہ، سارا اور مسز عون کو اپنی آپ بیتی سنائی ہے پھر مسز عون، سارا بھی اپنے اپنے تجربات بیان کرتی ہیں۔ دوران گفتگو یہ ان مسائل پر اظہار خیال کرتیں ہیں۔ جن کا سامنا اس وقت کے ہندوستانی مرد اساس معاشرے میں عورت کو تھا۔ مردوں کے ناروا سلوک پر ہاجرہ کہتی ہے۔

> میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد ہم کو حقیر جانتے ہیں حالاں کہ ہمارے سبب سے ان کی عزت ہے۔
> ہمارے سبب سے ان کی آبرو ہے۔ ہمارے سبب سے ان کا وجود ہے۔ [۲۵]

عورت کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ ”بے باپ کا بچہ پیدا ہوا ہے لیکن بے ماں کے بچہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔“ [۲۶]

صغرا نے اپنے ناول کے توسط سے فکر انگیز خیالات بھی پیش کر دیے ہیں۔ جب ہاجرہ کہتی ہے کہ نکاح کے وقت وہ اپنے شوہر سے بالکل انجان تھی لیکن ماں باپ کے بھروسہ پر نکاح کر لیا تو اس سے احساس ہوتا ہے۔ اس وقت بھی لڑکی اپنے اوپر ہونے والی زبردستی اور حاکمیت کا دکھ محسوس کرتی تھی۔ ہاجرہ کہتی ہے۔

> چاہے لڑکا فرنگی حبشی ہو یا خوب صورت جوان ہو یا اسی برس کا بوڑھا۔ عالم ہو یا جاہل ہر حال میں ہاں کہنا ہی شریف لڑکیوں کا کام ہے۔ میرے والدین روشن خیال تعلیم یافتہ تھے۔ مگر انھوں نے بھی شادی سے قبل مجھ سے نہ پوچھا کہ تم کو یہ انتخاب پسند ہے یا نہیں۔[۲۷]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے اس عہد کا پڑھا لکھا طبقہ بھی بعض اوقات رسم ورواج کی جکڑ، بندیوں میں اس قدر اسیر تھا کہ اپنی لڑکی کا شرعی حق لینے پر بھی فخر محسوس کرتا ہے لیکن لڑکی اس ناانصافی کا احساس رکھتی تھی اور موقع بہ موقع اس روایت کو بدلنے کی بات کرتی تھی۔ ناول میں سارا کہتی ہے:

> واقعی ہند میں بہت بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے دفعیہ کی تدابیر صاحب ہم لوگوں کو کرنا چاہیے۔ اب تو یہ رواج ہے کہ لڑکی اپنی نسبت کی خبر تک نہیں سن سکتی۔ جہاں نسبت کا ذکر نکلا۔ لڑکی وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ جھوٹی شرم ہے اور والدین کا ظلم ہے۔[۲۸]

صغرا عورت پر زبردستی کی قائل نہیں۔ ان کے خیال میں عورت اپنی مرضی سے جینے کی اتنی ہی حق دار ہے ۔ جتنی کہ مرد عورت کو کم تری کی حالت سے باہر نکالنے کے لیے صغرا کہتی ہیں:

> ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے ۔ والدین اپنی لڑکی ہرگز ایسے شخص کو نہ دیں جس کے پاس پہلی بی بی موجود ہو۔ خواہ اس کو اولاد ہو یا نہ ہو۔ اگر بی بی مر چکی ہو تو لڑکی دی جائے لیکن ایک بی بی کو ہوتے دوسرا عقد نہ کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ عقد ثانی کرنے کا رواج ڈالا جائے بیوہ کو ترغیب دی جائے جو عورت جوان بیوہ ہو اس کو عقد ثانی کرنا واجب کر دیا جائے۔[۲۹]

یہاں انھوں نے اپنے تخلیق کردہ کردار ہاجرہ کے ذریعے عورتوں کو مسائل سے باہر آنے کا طریقہ بتایا ہے اور بیوہ کو ہر وہ خوشی مہیا کرنے پر اصرار کیا جس سے معاشرہ اسے محروم کر رہا ہے۔ ہاجرہ کہتی ہے:

> بیوہ عورتیں عقد ثانی کرنا چاہتی ہیں ان کے والدین سر راہ ہوتے ہیں اور رواج مانع ہے۔ اس لیے اگر کوشش کی جائے تو اکثر بیوہ عورتیں عقد ثانی کر لیں گی۔[۳۰]

ہاجرہ کا تعلیم و تربیت کی بنا پر اپنی زندگی کو کامیاب بنالینا دراصل ہندوستانی عورت کی حالت میں سدھار لانا ہے۔ ہاجرہ کا یہ کہنا کہ مجھے تین کاموں کی بڑی فکر ہے۔ ایک زنانہ تربیت گاہ کا قیام دوسرے کم سن بیوہ کا عقد ثانی۔

تیسرے ایسے شخص کو والدین لڑکی نہ دیں جس کی پہلی بیوی زندہ ہو۔ دراصل صغرا ہمایوں سماج کے تین اہم مسئلوں کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں۔ ناول نگار کی یہ سوچ اس کی نسائی حسیّت کا پتہ دیتی ہے۔

اس صدی کا ایک اور سب سے اہم نام بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کا بھی ہے۔ سلطان جہاں بیگم ۱۸۵۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تین مدرسے قائم کیے۔ ''مدرسہ وکٹوریہ''، ''مدرسہ سلطانیہ''، ''مدرسہ بلقیسیہ'' اس کے علاوہ ایک ''کتب خانہ حمیدیہ'' بھی قائم کیا۔ ہندو لڑکیوں کے لیے ایک مدرسہ ۱۹۰۷ء میں قائم کیا۔ ''مدرسہ آصفیہ'' کا قیام بھی انھی کی مرہون منت ہے۔ اس میں ڈاکٹری اور طب یونانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھوں نے ''باغ عجیب''، ''اسلام میں عورت کا مقام''، ''سیرت مصطفی'' وغیرہ کے عنوان سے بھی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصانیف کی کل تعداد ۲۳ تھی۔ عطیہ بیگم فیضی پہلی مسلم خاتون میں جو تعلیم کے غرض سے لندن گئی اور معلمی کی تعلیم حاصل کی۔ ''زمانۂ تحصیل'' کے نام سے سفر نامہ لندن کے قیام کے دوران ہی لکھا۔ ان کی بہن زہرا بیگم بھی یورپ گئیں۔ اور ''سیر یورپ'' کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں قائم ہونے والی مسلم لیڈیز کانفرس کی سیکرٹری نفیس دلہن کا نام بھی اس سلسلے میں بے حد اہم ہے۔ نفیس دلہن عبدالرحمان شیروانی کی بہن تھی۔ ''نفش وفا'' کی مصنفہ بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ بیگم ممتاز علی، اکبر و بیگم، سلطانہ بیگم، مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نواب مزمل اللہ خان کی بیٹی زاہدہ خاتون شروانیہ (ز۔خ۔ش) بنت نذر الباقر۔ گیتی آراء، سروجنی نائیڈو، خجستہ بیگم، بیگم عباس طیب جی۔ بیگم یعقوب، وغیرہ ایسی خواتین ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو عورت کی تعلیم اصلاح اور آزادی پر صرف کیا۔ اس کے نتیجے میں ایسے رسائل کا آغاز ہوا جو خواتین کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں خواتین کی اصلاح کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف خواتین کو تخلیقی میدان میں آگے آنے کے مواقع بھی دیے جاتے تھے۔[۳۱]

نذر سجاد حیدر کا دور اپنے فکری و سماجی رویوں کے تغیر کا دور کہلاتا ہے جس میں پرانی اور فرسودہ روایات کو ترک کر کے نو آبادیاتی اثرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی ذہنی تبدیلیوں اور جدتوں کو خوش آمدید کہا جارہا تھا۔ ایسے میں نذر سجاد حیدر اپنے معاصرین میں زیادہ فنی پختگی اور ذہنی شعور کے ساتھ اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کے ناول اور ان کے مضامین اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اپنے دور کی تانیثی فکر کی نہ صرف حامی ہیں بلکہ اس کی داعی بھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رشیدۃ النساء، دیباچہ اصلاح النساء (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۸ء)۔

۲۔ شعیب معظم، "اردو کی پہلی ناول نگار خاتون" مشمولہ نقوش، (لاہور: شمارہ ۱۵، س۔ن)، ص ۱۶۰۔

۳۔ زاہدہ حنا، "رشندری، رشیدہ اور رقیہ کا خواب" مشمولہ اصلاح النساء (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری)، ص ۶۷۔

۴۔ شعیب معظم،اردو کی پہلی ناول نگار خاتون،ص۱۶۲۔

۵۔ رشیدۃالنساء،اصلاح النساء،ص۶۶۔

۶۔ ایضاً،ص۳۴۔۳۵۔

۷۔ سیمیں ثمر فضل،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردوناولوں کا حصہ،ص۲۸۹۔

۸۔ رشیدۃالنساء،اصلاح النساء،ص۲۰۔

۹۔ ایضاً،ص۵۷۔

۱۰۔ محمدی بیگم،صفیہ بیگم(لاہور:دارالاشاعت،۱۹۱۸ء)،ص۹۴۔۹۹۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ممتاز علی گوہر،منتخابات تہذیب نسواں(لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۸ء)،ص۷۔

۱۴۔ طاہر مسعود،اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ(لاہور:مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۶ء)،ص۱۵۹۔

۱۵۔ ممتاز علی گوہر،منتخابات تہذیب نسواں،ص۱۴۔

۱۶۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی،تاج صاحب کے والدین،صحیفہ،تاج نمبر(لاہور)۔

۱۷۔ طاہر مسعود،اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ،ص۱۶۴۔

۱۸۔ مولانا امداد صابری،تاریخ صحافتِ اُردو،جلد سوم،(دہلی:دہلی پریس،۱۹۶۳ء)،ص۳۳۴۔

۱۹۔ محمدی بیگم،صفیہ بیگم،ص۹۴۔۹۹۔

۲۰۔ اکبری بیگم،گودڑ کا لال(لکھنؤ:نسیم بک ڈپو)،ص۱۵۰۔

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً،ص۵۶۲۔

۲۳۔ حمیرہ سعید،اردو ناولوں میں نسائی حسیت(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۹ء)، ص۵۷۔

۲۴۔ سید جاوید اختر،اردو کی ناول نگار خواتین(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص۳۰۔

۲۵۔ صغر اہمایوں مرزا،سرگزشتِ ہاجرہ(حیدرآباد،۱۹۲۶ء)،ص۲۰۔

۲۶۔ ایضاً،ص۲۰۔

۲۷۔ ایضاً،ص۱۳۔

۲۸۔ ایضاً،ص۱۳۔۱۴۔

۲۹۔ ایضاً،ص۴۷۔

۳۰۔ ایضاً،ص۷۵۔

۳۱۔ عظمیٰ فرمان،اُردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ(کراچی:کراچی یونی ورسٹی پریس،۲۰۰۰ء)،ص۱۷۔۱۸۔

باب سوم:

نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے موضوعات کا تانیثی مطالعہ

دین اسلام میں مرد و عورت کی زندگی کی صدارت اگرچہ مرد کو عطا فرمائی۔ اور مردوں کو حاکم کا درجہ دیا ہے۔ تاکہ اگر زندگی میں کوئی بڑی مشکل آن پڑے تو مرد اپنی صلاحیت و قابلیت سے اس مشکل کو حل کرے لیکن

اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورتوں کے مقام کو بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اور کچھ حقوق واجب کر دیے ہیں جو کہ مردوں کو پورا کرنا لازم ٹھہرا دیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی کو بہتر طریقے سے گزار سکیں اور لڑائی جھگڑوں کے جہنم سے آزاد رہے۔

اسلام نے عورت کے حقوق میں ہر قسم کی زیارتی اور کوتاہی سے سختی سے منع کیا ہے اور اپنے دیگر احکام کی طرح اس کے حکم میں بھی اعتدال کو اپنایا ہے نہ ہی بالکل قیدی رکھا ہے نہ ہی بالکل آزاد کر دیا ہے۔ بل کہ یہ بتایا ہے کہ نظام کائنات کے لیے مرد و عورت لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام نے عورت کو عزت دی ہے اور اس کی عظمت کو بلند کیا ہے۔ اس کو مالکانہ حقوق دیے ہیں۔ وہ اپنے مہر کی رقموں، تجارتوں اور جائیدادوں کی مالکہ بنادی گئی ہیں اور اپنے باپ بھائی اور شوہروں کی میراثوں کی وارث قرار دی گئی ہیں۔ غرض کے انتہائی ذلیل و خوار اور مجبور و لاچار عورت کو اسلام نے مردوں کے دلوں کا سکون اور گھروں کی مالکہ کا درجہ دے دیا۔ چناں چہ قرآن پاک میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں۔

> تمھارے لیے تمھاری جنس سے بیویاں پیدا کر دیں تاکہ تمھیں ان سے تسکین حاصل ہو اور اس سے تمھارے درمیان محبت و شفقت پیدا کر دی۔[1]

عورت کے وجود نے نیکی، شرافت تعلیم و تربیت پاکیزہ ماحول اور دین کی اشاعت و تبلیغ میں ہر دور میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مگر مرد نے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے عورت کے وجود کے اس نمایاں کردار کو مسائل کے پردے سے ڈھانپ دیا۔ اور یہ بھول گیا کہ ایک حصے کے نظر انداز کر کے جو بھی پروگرام بنے گا۔ وہ بنی نوع انسان کے لیے ناقص اور ادھورا ہو گا۔

انیسویں صدی مرد کی اسی اجارہ دار ذہنیت کی عکاس ہے۔ معاشرے میں عورت پر ہونے والی ظلم و زیارتی نے جہاں مرد کی بالادستی قائم کی وہی اس معاشرے کا کھوکھلا اور ادھورا پن بھی سامنے آیا۔ بنیادی حقوق چھن جانے کے احساس نے اس کے اندر احساس محرومی کو جنم دیا۔ ہندوستانی عورت کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اس پر جدید تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مرضی کی شادی کا حق چھین لیا گیا۔ بیوگی طعنہ بن گئی۔ جدید تعلیم کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے عورتوں میں مختلف جاہلانہ رواج پروان چڑھنے لگے۔ توہمات پرستی عام ہو گئی۔ جس کی بدولت ان کی اخلاقی حالت میں مزید بگاڑ پیدا ہو گیا۔

ہندو عورت نسبتاً زیادہ مسائل کا شکار تھی انتہائی بچپن کی شادی سستی کا رواج کسی صورت بیوہ کی دوسری شادی کی اجازت نہ دینا۔ لڑکیوں کا پیدا ہوتے ہی قتل کر دینا یہ تمام برائیاں کافی حد تک مسلمانوں میں بھی پھیلتی جا رہی تھیں۔ اگرچہ اسلام نے عورت کو بہت حقوق دیئے تھے لیکن اُن حقوق کا اطلاق عورتوں کی زندگی پر کم ہی نظر

آتا ہے۔ مجموعی طور پر عورت خواہ ہندو تھی یا مسلمان متوسط طبقے کی تھی یا اعلیٰ بے بسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مرد ہی اس کا کرتا دھرتا تھا۔

ہندوستان میں عورت کا عورت ہونا اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھی وہ پردے کے نام پر چار دیواری میں قید تھی۔ بچپن میں شادی کر دی جاتی تھی۔ بیوہ ہو جانے پر سخت صعوبتیں برداشت کرتی۔ ہندوستان کی عورت کو یہ یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ زندہ رہے تو مرد کے لیے مرے تو مرد کے لیے۔ تعلیم کے دروازے اس پر بند تھے۔ وہ ناقص العقل ٹھہرائی گی۔ مرد کو زیادہ سے زیادہ شادی کی اجازت تھی جب کہ عورت کے لیے دوسری شادی کا تصور تک نہ تھا۔ وہ کسی کی بیٹی تھی، بیوی تھی، بہو تھی، ماں تھی لیکن وہ خود کہیں نہ تھی۔ وہ بھانجھ ہو جانے کی وجہ سے گھر سے نکال دی جاتی تھی۔ عورت کو ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد صرف شوہر کی تابعداری ہے۔ اس قسم کی روایات مشہور تھیں کہ ایک عورت شوہر نے بیوی سے پانی مانگا جب تک وہ پانی لاتی شوہر سو گیا۔ وہ تمام رات پانی لیے شوہر کے سرہانے کھڑی رہی۔ صبح فرشتے نے آکر جنت کی بشارت دی۔

ہندوستان کی عورتیں توہم پرستی اور فضول رسم و رواج میں جکڑی ہوئی تھیں۔ رنج و غم کے سلسلے میں رسومات کی ادائیگی کو اہم فریضہ خیال کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اِن رسوم میں ذرا سی بھی تبدیلی کی گئی تو اس سے کئی قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ امراض کے سلسلے میں بھی ان کے عقائد عجیب و غریب قسم کے تھے۔ وہ امراض کو بھوت و آسیب کا اثر سمجھتی تھیں۔ ڈاکٹر کے علاج کے بجائے جھاڑ پھونک نذر و نیاز کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ ولادت کے موقع پر انتہائی فضول روایات رائج تھیں۔ بچے کی پیدائش پر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ پہلا بچہ باپ ہی کے گھر پیدا ہونا چاہیے۔ گود بھرائی کی رسم کی جاتی یعنی سات قسم کے میوے ایک پوٹلی میں باندھ کر عورت کی گود میں رکھے جاتے۔ حاملہ کو سات سہاگنوں کے تھال سے کھلایا جاتا تھا۔ سب عورتیں جمع ہوتیں کھانا وہی کھاتی محلے میں بھی کھانا تقسیم ہوتا۔ بچے کو چھاج میں بٹھا کر زندگی کے لیے کسی ٹوکری میں گھسیٹا جاتا۔ بعض حالتوں میں عورت کو بالکل نجس اور چھوت سمجھا جاتا۔ اس سے الگ بیٹھا جاتا۔ اس کا جھوٹا کھالینا تو دور وہ جس برتن کو چھولے تو اس کو بے دھوے مانجھے پانی تک نہ پیا جاتا تھا۔

بسم اللہ کی رسم بڑے اہتمام اور پابندی کے ساتھ کی جاتی۔ اس رسم کے لیے چار برس چار مہینے چار دن کا ہونا اپنی طرف سے مقرر کر لیا جاتا اور اس روز مٹھائیاں بانٹی جاتی۔ اس روز مٹھائیاں بانٹنے کو بے حد ضروری سمجھا جاتا۔ بچے کو خلاف شرع لباس پہناتے ریشمی یا زری یا زعفران میں رنگا ہوا۔ چاندی کے قلم دوات سے چاندی کی تختی پر لکھ کر بچے کو اس سے پڑھواتے۔

منگنی میں بھی طوفان بدتمیزی کی طرح بہت سی رسمیں کی جاتی تھیں۔ جب منگنی ہوتی تو نائی خط لے کر آنا۔ لڑکی والے کی طرف سے شکرانہ بنا کر اس کے آگے رکھا جاتا۔ نائی واپس آکر لڑکی کے دیئے ہوئے خوان میں سو روپہ ڈال دیتا۔ سب عورتیں جمع ہوتیں گانے گاتیں۔ پھر لڑکی والے ایک جوڑا معہ کچھ نقد روپے بھیجتے۔ وہ جوڑا لڑکے کی تمام برادری میں رکھایا جاتا۔ کچھ عرصے بعد لڑکی کی طرف سے کچھ مٹھائی انگوٹھی اور رومال اور کسی قدر روپے جن کو نشانی کہتے بطور نیوتا بھیجتے اور مٹھائی کو بڑی بوڑھی عورتیں گھر گھر تقسیم کرتیں۔ بعد اس کے سسرال والے چند لوگ آتے لڑکی کی گود بھری جای۔ دلہن کی گود میں میوہ، پیڑے، بتاشے رکھے جاتے اس کے بعد لڑکی والے اس کا بدلہ یا جتنی توفیق ہوتی اتنے ہی روپ دیتے۔

شادی کی تقریب میں بھی خوب دل کھول کر حوصلے نکالے جاتے اور بے انتہار سمیں ادا کی جاتی۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے خط لکھتے اور اسے نائی کو دے کر رخصت کرتے اور اس میں یہ بات بھی ضروری سمجھی جاتی کہ سرخ ہی خط ہو اس پر گوٹا بھی لپٹا ہو۔ گھر میں برادری کنبے کی عورتیں لڑکی کو ایک کونے میں قید کر دیتی۔ جس کو مانجھے بٹھلانا کہتے تھے۔ اس کے آداب یہ ہیں کہ اس کو چوکی پر بٹھا کر اس کے دائیں ہاتھ پر کچھ بٹنار کھتی اور گود میں کچھ کھیل بتاشے رکھتی اور کچھ کھیل بتاشے حاضرین میں تقسیم ہوتے۔ مانجھے بٹھلانے کی پہلی وجہ تو یہ بتائی جاتی کہ سسرال جا کر۔۔۔۔ لڑکی کو سر جھکائے ایک ہی جگہ بیٹھنا ہو گا۔ اس لیے عادت ڈالنی ضروری ہے کہ وہاں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ بتائی کہ لڑکی کے ادھر ادھر نکلنے سے کچھ آسیب اور بھوت پریت کا سایہ نہ ہو جائے۔

> نئی نویلی دلہن کو قبلہ رخ بٹھایا جاتا اور سات سہاگنیں مل کر تھوڑی تھوڑی کھیر دلہن کے دائیں ہاتھ پر رکھتیں پھر اس کھیر کو ایک سہاگن چاٹ لیتی۔ عصر اور مغرب کے دوران دلہن کا سر کھولا جاتا اور عورتیں مل کر گانے گاتیں۔ اس رسم کو مانگ بھرائی یا سر کھلائی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شادی کے ضمن میں بعض تاریخوں، مہینوں اور دنوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ [۲]

یہ جاہلانہ رسم و رواج دیکھ کر ادیبوں کے دل میں بھی خواتین کی جہالت اور بے علمی کا احساس پیدا ہوا۔ چناں چہ اس ضمن میں مولوی نذید احمد، راشد الخیری، مولوی ممتاز علی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ نے حتی الواسع عورتوں میں تعلیم پھیلانے اور ان کے حقوق دلانے کی سعی کی۔ نذید احمد نے عورتوں کے لیے خاص کتابیں لکھیں۔ راشد الخیری نے بھی ان فرسودہ روایات کے خلاف قلمی جہاد کیا کیوں کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ممکنہ کوشش کر کے ادب کے بنیادی موضوعات تعلیم، پردہ اخلاق جاہلانہ رسوم وراثت، طلاق، تعدد ازواج کی خامیاں وغیرہ کو موضوع بنایا۔ انھوں نے سماج اور تہذیب کو مد نظر رکھتے ہوئے عورت کی تعلیم کا پرچار کیا۔ نذیر احمد یہ سمجھتے کہ عورتوں کی حالت مردوں سے کئی زیادہ اصلاح طلب ہے۔ اس لیے انھوں نے طبقہ نسوں کی پستی

کے اسباب اور اس کے مسائل کو خصوصاً اپنے ناولوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناولوں میں جاگیری نظام کی ماری ہوئی عورت کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ اس عورت کو مرد اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ یہاں ان کے تمام پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان کی اخلاقی پستی رسم ورواج کی پابندی، ضیف الاعتقادی آپس کی رنجش مذہب اور ارکان مذہب سے بے گانگی اور اسی قسم کی دوسری تمام برائیاں جس کی وجہ سے وہ اچھی مائیں اور سلیقہ شعار بیویاں نہیں بن سکتی تھی بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔

نذیر احمد کے ناول بنات النعش کے کردار حسن آراء کی تخلیق انھی خرابیوں کو اجاگر کرنے کے لیے کی ہے جو مردوں کی لاپرواہی کی وجہ سے عورتوں میں در آتی ہیں۔ نذیر احمد کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ عورت کو اس سطح پر پہنچانے کی ذمہ داری مرد پر ہی عائد ہوتی ہے۔ مرد نے عورت کو اس کی انفرادیت اور بنیادی حقوق سے محروم کرکے اپنے تابع فرماں بنادیا جس کے نتیجے میں عورتوں میں تعلیم مفقود ہوگئی اور تعلیم کے فقدان کا یہ نتیجہ ہوا کہ عورتیں توہم پرستی ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوگئیں۔ "مراۃ العروس" کی اکبری عرف مزاج دار بہو اس عہد کی عورتوں کی حقیقی ترجمان ہے۔ اس کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے عورتوں کی توہم پرست ذہنیت کی عکاسی کی ہے۔ تعویذ دھاگوں کے چکر میں پڑکر عورتیں کس قدر نقصان اٹھاتی ہیں۔ جہالت کے باعث ہی یہ عورتیں رسم و رواج کی پابند تھیں اور صدیوں پرانی روایات سینے سے لگائے بیٹھی تھی اور امور خانہ داری کا سلیقہ جو ان کے اولین فرض میں شامل تھا ان میں سرے سے مقصود تھا۔

شرر نے بھی اپنی تحریروں میں عورتوں میں پائے جانے والے جاہلانہ رسم ورواج کی مذمت کی ہے اپنے ناول "خوفناک محبت" میں یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ جاہل و ناتربیت یافتہ عورتیں گھریلو نظام اور معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہیں۔ شرر نے یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان کی عورتوں میں بنیادی طور پر وہ تمام صفات موجود ہیں جن سے اعلیٰ کردار تخلیق پاتا ہے لیکن جہالت ان کو ابھرنے اور جلا پانے کا موقع نہیں دیتی اور "خوف ناک محبت" کے کردار زینب کے بارے میں شرر کہتے ہیں۔

> خرابی یہ تھی کہ زینب کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دلائی گئی تھی اور صحبت بھی سوا قصبے کی جاہل اور ضعیف الاعتقاد عورتوں کے کسی شائستہ اور ذی عقل خاتون کی نہیں نصیب ہوئی تھی۔ [۳]

جہالت کی سب سے بڑی دین ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ہے۔ اس موضوع پر راشدہ الخیری نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے عورتوں کی اس کمزوری پر کڑی تنقید کی ہے۔ اپنے ناولوں میں ایسی عورتوں کے کردار پیش کیے ہیں جو وہم میں مبتلا ہو کر ایسی حرکتوں کی مرتکب ہوئی ہیں۔ جو عقل و شرح دونوں کی رو سے معیوب ہیں۔ یہ عورتیں مکار فقیروں کے فریب میں مبتلا ہو کر آئے دن تباہ ہوتی رہتی ہیں اور ان خواتین نے رسوم کی پابندی کی جزو

ایمان بنالیا تھا۔ جہالت کے باعث وہ فضول رسوم سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتیں ان کی تکمیل پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ افلاس و تباہی کے کچھ نہیں۔ اپنے ناول "طوفان حیات" میں انعام کی بیوی کی وساطت سے ان عورتوں کی عکاسی کی ہے۔ جو رسوم کی تقلید کے سلسلے میں اپنے شوہر کی اقتصادی حالت کو نظر انداز کر دیتی ہیں اور تقاریب کی خاطر اپنے زیورات تک فروخت کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔

الغرض نذیر احمد کی بنات النعش ہو یا مراۃ العروس، شرر کی طوفان محبت، راشد کی طوفان حیات تمام قصوں میں مسلمان خاندانوں میں رائج غیر اسلامی رسم و رواج کی نفی کی گئی ہے۔ ان قصوں میں تخلیق کیے جانے والے کردار ہندوستان کے جاہلانہ رسم و رواج کی زد میں آئے ہوئے سماج کی ہلتی ہوئی بنیادوں کو پھر سے جمانے کے لیے تخلیق کیے جانے والے کردار ہیں۔

خواتین ناول نگاروں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے اصلاحی رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی۔ رشیدۃ النساء کا ناول اصلاح النساء کا موضوع اور مقصد اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس کے دیباچے میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

> ۔۔۔چند عورتوں نے مسلم گھرانوں میں عورتوں کی جہالت اور بے ہودہ رسوم کا ذکر ان سے کیا اور جب انھوں نے ان باتوں کا تجزیہ منطقی انداز میں کیا تو لوگوں نے بہت تعریف کی اور ان سے فرمائش کی کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھ ڈالیں۔ [۴]

اس کے علاوہ محمدی بیگم، اکبری بیگم، ض بیگم، عباسی بیگم، ضیا بانو اور نذر سجاد حیدر نے متعدد ایسی تحریریں لکھیں جس میں نئی تعلیم کی اہمیت، غلط رسم و رواج اور توہمات کے نقصانات اور تعدد ازواج جیسی سماجی، برائیاں سامنے لائیں۔

نذر سجاد کا نام ان خواتین مصنفین میں سر فہرست ہے جنھوں نے معاشرے کی بھلائی بالخصوص خواتین کی اصلاح کے لیے قلمی محاذ پر کام کیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اہل ہند کی زندگی کے وہ گوشے ہمارے سامنے بے نقاب کیے دو اپنی کہنگی، فرسودگی اور لغویت کی بنا پر خانگی زندگی متاثر کر رہے تھے۔ نذر نے اپنے ناولوں میں جا بجا ان رسوم کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ جنھیں برتنا وہ معاشرہ دنیاوی عزت و جاہ اور نام کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ ناول اختر النساء میں ہیروئن کی منگنی کا منظر ملاحظہ ہو۔

> ۔۔۔ ۱۲ بجے دن کی ٹرین میں بڑے ساز و سامان کے ساتھ سمدھنیں پہنچی۔ کچھ ڈومنیاں پہلے ہی یہاں گا بجا رہی تھیں کچھ ان کے ساتھ ناچتی گاتی اتریں، جوں ہی وہ سب گاڑی سے اتر کر دروازے پر پہنچی۔ بیگم صاحبہ کی کئی چھوکریاں کھڑی ہو گئیں ایک تو دودھ کا شربت سمدھنوں کے آگے آگے

لوٹوں کی دھار کے ساتھ گراتی چلیں اور دوسری لڑکیاں اور بی امانی وغیرہ پھولوں کی چھیڑیاں انھیں مارنے لگیں۔۔۔ دونوں نے پانچ پانچ روپے شربت کے کٹورے میں ڈالے پھر پان کی گلوریاں تقسیم ہوئیں اور گوٹے اور پھولوں کے گوندھے ہوئے ہار سب کو پہنائے گئے۔ [۵]

چھٹی کی رسم کا ذکر نذر سجاد نے اس طرح کیا۔

۔۔۔۔ سو بیبیوں کا مجمع ہو گیا۔۔۔ چھٹی کی رسم کے لیے سات قسم کا کھانا تیار کیا گیا۔۔۔ دو عورتوں نے بیگم صاحبہ کو جو اس وقت فاخرہ جوڑا اور ناک میں نتھ پہنے ہوئے تھیں پلنگ سے فرش سے اترنے میں گود میں بچی بھی رکھی گئی تھی اس خیال سے کہ پہلی دفعہ زمیں پر قدم رکھتے وقت گود خالی نہ ہو اور بد شگونی نہ ہو۔۔۔۔ اب کھانا اس طرح ہوا کہ سب سے پہلے سات سہاگنوں نے ہاتھ ڈالا۔۔۔ پہلے بخوبی اطمینان کر لیا تھا کہ ہر ایک کی گود میں بچہ ہے۔ [۶]

ان عورتوں کی نفسیات پر توہم پرستی کا غلبہ تھا۔ ان کی روزمرہ زندگی توہمات میں گھری ہوئی تھی۔ یہ عورتیں کالے کپڑے سے وہم کھاتی تھیں۔ بعض دنوں، مہینوں اور برسوں کو تقدیر کے فیصلوں میں مانع گردانتی تھیں۔ ان کی وہمی نفسیات کی جھلک نذر نے ساطرح پیش کی۔

۔۔۔۔ بیگم صاحبہ نے ہر چیز تھوڑی تھوڑی چکی۔۔۔ ایک بڑی بوڑھی کی نکتہ چین نظر چوتھے کے طباق پر پڑی تو کہا "اے ہے یہ کیا غضب چوتھے کے طباق میں پالک کے ساگ کی بھجیا تو رکھی نہیں گئی" یہ سنتے ہی بیگم صاحبہ کا کلیجہ مٹھی میں آ گیا کہ پہلی رسم میں ہی بد شگونی ہوئی آگے دیکھیے کیا ہو۔ [۷]

عورتوں نے اپنی لغو رسوم میں مردوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اختر النساء کا ایک کردار مسٹر رفیق جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص تھا جاہل بیوی کی خوش نودی کے لیے خوشی سے ان لغویات کا حصہ بن گیا۔

مسز وقار نے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف اور تلوار دے کر وکیل صاحب کو بیگم صاحبہ کے پیچھے اس طرح کھڑا کیا کہ ان کا سایہ ان پر پڑتا رہے۔۔۔۔ باہر لا کر چاروں طرف کے سات سات تارے زچہ سے گنوائے پھر چاروں کونوں کو سلام کروایا اور چار کونوں میں ایک ایک مٹھی کیلیں پھینکیں۔ [۸]

یہ تمام رسوم ان معاشرے میں ایک اہم فریضہ سمجھ کر ادا کی جاتی تھیں اور ان کو برتنا وضع داری اور نام و نمود کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ جس کا عکس ہمیں نذر کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔

۔۔۔۔ باراتی کھانا کھا کر آئے تھے اب پان حُقّہ کا زور و شور تھا اور ناچ بھی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ جو سن سن کر سمدھی صاحبان کھلے جاتے تھے اور لغو فقروں پر چار چار روپے ان کی طرف پھینک رہے تھے۔ [۹]

نذر نے اپنے ناولوں میں ہر طرح کی رسموں کا حال عموماً اور شادی بیاہ کی رسموں کی حال خصوصاً بیان کیا ہے۔ اور وہ ان رسوم کو ترک کرنے کی خواہاں نظر آتی ہیں وہ لکھتی ہیں کہ:

> ۔۔۔۔۔یہ رسومات بربادی بخش و تباہ کن ہیں اور انھی جوٹی شخیوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا۔۔۔۔۔بڑے بڑے امیروں اور نوابوں کے خزانے لٹ گئے جائیدادیں قرضے میں لگ گئیں۔ جن کے دروازوں پر باتھی جھولتے تھے وہ انھی رسومات قبیحہ کی پابندیوں سے ٹکڑوں کے محتاج ہو گئے۔ [۱۰]

اس سماج میں پھیلی تمام برائیاں تعلیم نسواں کے فقدان کی دین تھی، اس لیے وہ معاشرہ چاروں طرف سے توہمات میں گھرا ہوا تھا۔ عورتیں اپنے توہمات، جہالت کی وجہ سے ہمیشہ رنج و مصیبت میں مبتلا رہتی تھیں۔ نذیر احمد نے پہلی بار عورت کو اس منفی انداز اور رویے سے بچانے کے لیے اور معاشرے کی نظروں میں کار آمد انسان بنانے کے لیے اس کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی کتب تحریر کیں۔ مراۃ العروس ان کی پہلی کتاب ہے جو نذیر احمد نے عورتوں کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرنے کے لیے دل چسپ پیرائے میں لکھی۔ قصے کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> غرض یہ کہ کل خانہ داری کی درستی عقل پر ہے اور عقل کی درستی علم پر موقوف ہے۔ [۱۱]

اس تمہید کے ساتھ انھوں نے مراۃ العروس کا قصہ لکھا اور اس حقیقت پسندانہ اور دل چسپ انداز میں لکھا کہ وہ عورتوں کے حلقے میں بے حد پسند کیا گیا۔ یہ دہلی کے متوسط گھرانے کے پس منظر میں بیان کی گئی کہانی ہے جس کے مرکزی کردار اکبری اور اصغری ہیں۔ اصغری تربیت یافتہ پڑھی لکھی سمجھ دار ہے جو میکے اور سسرال دونوں کو اپنے سلیقے سے جنت بنا دیتی ہے۔ اکبری کے کردار میں نذیر نے بے تربیت غیر تعلیم یافتہ عورت کی تصویر پیش کی ہے۔ اور اس کردار کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے عورتوں میں کس قسم کی توہم پرستی اور بے عقیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اکبری مسائل کے حل ٹونے ٹوٹکوں سے نکالنا چاہتی ہے۔ تعویذ گنڈے کرواتی ہے جس کا نتیجہ تباہی بربادی نکلتا ہے۔ اس کے میاں کا کردار انھوں نے اچھار کھا کر یہ ثابت کیا ہے۔ جس طرح برے شوہروں سے عورتیں نباہ کرتی ہیں۔ مردوں کو بھی بُری بیوی سے نباہ کرنا چاہیے۔ اصغری پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اپنے خاندان کو کئی مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ مثلاً چالاک ماماں کسی اشتہار کو لا کر گھر پر لگا رہتی ہے اور کہتی ہے بنیا جس کا خاندان مقروض ہے اس نے نالش کر دی ہے۔ اصغری اس اشتہار کو پڑھ کر اس کا سارا بھانڈا پھوڑ دیتی ہے۔ اپنے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے وہ گھر کے مردوں کے بغیر مسائل کو سلجھا لیتی ہے۔ میاں کو نئے زمانے کے علم سیکھنے پر اکساتی ہے۔ تعلیم کی طرف راغب کرتی ہے۔ اور گھر میں مکتب کھولتی ہے اور محلے کی لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ نذیر احمد نے گھریلو

مکتبوں کے طریقہ تعلیم اور استانیوں پر بھی تنقید کی ہے کہ وہ تعلیم پر کم توجہ دیتی ہیں اور لڑکیوں سے کام زیادہ لیتی ہیں۔

مکتبوں میں قید دن بھر کی استانیوں کی سختی پڑھنا کم مار کھانا اور کام کرنا دن بھر میں پڑھے تو صرف دو حرف۔۔۔۔۔[۱۲]

نذیر احمد عورتوں کی تعلیم میں جدتیں پیدا کرنے کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ قرآن پاک، معمولی پڑھنے لکھنے کھانا داری کے ساتھ وہ اصغری کے مکتب میں عورتوں کو حساب کتاب، تاریخ، جغرافیہ اور حالات حاضرہ کی بھی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کو اس لیے بھی ضروری قرار دیا کہ تعلیم یافتہ مائیں ہی اولاد کی اچھی تربیت کر سکتی ہیں۔بنات النعش میں بھی نذیر نے مثالی مدرسے کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ایک ایسا مدرسہ جس میں عورتوں کی تعلیم کو صرف قرآن اور مذہبی مسئلے مسائل تک محدود نہ رکھا بل کہ ہسٹری اور علوم کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ جیسے علم جر ثقبل، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، کشش استحصال اور مقناطیس وغیرہ۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کی بھی اچھی باتوں کی وکالت کی اور عورتوں کے پرانے نظام کو بدل کر نئے نظام تعلیم کی ضرورت پر زور دیا لیکن وہ اس چیز کو ایک مسئلہ بنا کر سماج کے سامنے پیش کرنے کے قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ فضا اس کے مخالف تھی۔ خود انگریزی حکومت بھی اس مسئلے کو چھیڑنے سے ڈرتی تھی۔ کہ انیسویں صدی کا ہندوستانی سماج لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے اس قدر رجعت پسندانہ خیالات کا مالک تھا کہ اگر لڑکیاں لکھنا سیکھیں گی تو عشق نامے لکھیں گی، اماں باوا کی ناک کٹائیں گی، آسمان میں تھگلی لگائیں گی۔ اس لیے نذیر احمد نے زمانے کو دیکھ کر اس مسئلے کو قصے اور کہانی کے طور پر بیان کیا۔ زندگی کے روزمرہ کے واقعات میں تعلیم نسواں کی ضرورت کو سمجھانے کی کوشش کی جو بلاشبہ موثر بھی ثابت ہوئی۔

ان کے دوسرے ناول توبتہ النصوح میں بھی تعلیم نسواں کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔توبتہ النصوح کا ہیرو نصوح اپنی بیوی کو خود پڑھاتا ہے۔ "ریاضی" میں انھوں نے "میری" کے کردار میں عورت کی اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں شادی کی اہمیت کو کم کر کے دکھایا ہے اور اس کردار کو ایک مثبت کردار بنا کر پیش کیا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے مجالس النساء لکھ کر تعلیم نسواں کے مسئلے کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اس ناول کی ہیروئن کی زبانی یہ کہلوایا کہ ہندوستان خاص طور پر مسلمانوں نے لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم میں کوئی دل چسپی نہیں دکھائی۔ لڑکوں کو تعلیم اس لیے دلوائی گئی کہ ان کو کما کر کھلائیں گے۔ اسی طرح سرشار کے فسانہ آزاد کی ہیروئن حسن آرا روشن خیال تعلیم یافتہ تعلیم نسواں کی شدید حامی اور اس

کے فروغ میں کوشاں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتی ہے کہ "میاں بیوی دونوں تعلیم یافتہ ہوں گے تو مزے سے کٹے گی۔"[۱۳]

سرشار نہ صرف مدرسہ نسواں قائم کرنے میں بل کہ مس کلپر سا اور مس سٹیڈا کے ذریعے اصلاح نسواں کے کاموں کے ساتھ زنانہ کالج قائم کرنے کی تجویز بھی رکھتے ہیں جس میں ہر طبقے کی عورتوں کو جدید تعلیمی سہولیات مہیا کی گئی ہیں۔

شرر کے یہاں تعلیم نسواں کا تصور خاصا ترقی پسند ہے۔ وہ عورت کی صرف گھریلو تعلیم کی وکالت نہیں کرتے بل کہ اس کی جدید تعلیم کے حامی ہیں۔ ان کے ناول حسن کے ڈاکو کی ہیروئن ماہ لقا کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ:

> مکتب سے اٹھتے ہی ایک ہوشیار قابل لیڈی ڈاکٹر کے سپرد کر دی گئی۔ مس فٹن نے اسے اتنی انگریزی سکھادی کہ خوب اچھی طرح پڑھ لیتی ہے اور بولتی ہے تو اس روانی اور خوبی کے ساتھ کہ کالج کا کوئی لڑکا اس کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔[۱۴]

طاہرہ بیگم بھی عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی پڑھی ہوئی تھیں کیوں کہ انگریزی تعلیم کی معاشرے میں سخت مخالفت تھی اس لیے طاہرہ کا منگیتر جو کہ بہت مذہبی ہے اس سے شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ علماء بھی اس حق میں تھے کہ انگریزی پڑھی ہوئی لڑکی سے شادی کرنا جائز نہیں۔ جب طاہرہ کا منگیتر مصر و عرب جاتا ہے، وہاں کے علماء سے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی پڑھی لکھی مسلمان لڑکی سے ہی نہیں بل کہ اہل کتاب سے بھی مسلمانوں کی شادی جائز ہے۔ شرر عورتوں کے لیے جدید تعلیم اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو مذہب سوسائٹی کے طور پر طریقے پتا چلیں۔ وہ معاشرے میں پھیلے اس تعصب کو دور کرنا چاہتے تھے کہ انگریزی پڑھنے سے انسان بے دین ہو جاتا ہے۔ کسی کی زبان بولنے سے انسان اپنے دین سے نہیں جاتا۔ شرر کے بعد جتنے بھی ناول نگار آئے ان سب نے عورتوں کی تعلیم کو موضوع بنایا۔ ان میں خواتین کی بھی بڑی تعداد ہے۔ ایسی ہی ایک خاتون رشیدۃ النساء بھی ہیں۔ جنھوں نے مولوی نذیر احمد سے متاثر ہو کر اپنا ناول اصلاح النساء لکھا۔ اس ناول میں دو کردار دکھائے گئے ہیں ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا پھوڑ وہ صاف صاف اپنے کردار کے منھ سے یہ کہلواتی ہیں کہ عورتوں کے ناقص العقل ہونے کا تصور تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ وہ اس بات کی توجیح بھی اس ناول میں پیش کرتی ہیں کہ اگر عورتوں کی صلاحیتیں مردوں کے مقابلے میں کم نظر آتی ہیں تو وہ اس لیے کہ عورتوں کو تعلیم نہیں ملتی۔ تعلیم سے مردوں کے جوہر کھلتے ہیں اور بغیر تعلیم کے عورتوں کے جوہر دب جاتے ہیں اور عورتوں میں توہم پرستی، رسم پرستی، جلن، حسد، بزدلی یہ سب تعلیم کی کمی کے باعث ہیں۔ اس لیے ان کو اس سے بچانے کا واحد طریقہ تعلیم ہے۔ شاد عظیم

آبادی کی صورت خیال کا موضوع بھی عورت کی تعلیم ہی ہے۔ اس میں انھوں نے ایک تعلیم یافتہ ولایتی عورت کا کردار پیش کیا اور بتایا کہ تعلیم کی بدولت ہی اس نے مصیبتوں کا سامنا کیا اور اپنی سمجھ بوجھ سے شوہر کر سدھارا۔

سید احمد دہلوی کے دولوں ناولوں راحت زمانی کی مزے دار کہانی اور قصہ مہر افروز کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ ان دونوں قصوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم یافتہ ماں ہی بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح انداز میں کر سکتی ہے اور قوم کی اصلاح کے لیے تعلیم نسواں کو عام کرنا بے حد ضروری ہے۔

سید علی سجاد کا ناول نئی نویلی کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ لکھنو کے زوال آمادہ معاشرے میں عورتوں کی پستہ حالت کو دکھایا گیا ہے۔ ناول نگار کا خیال ہے عورتوں کو تعلیم نہ دینا اور انھیں علم کی نعمتوں سے محروم رکھنا بڑی خود غرضی اور ناانصافی ہے۔ عورتوں کی تعلیم نہ صرف عورتوں بل کہ مردوں کے لیے بھی مفید ہے۔

صغیر بلگرامی کا ناول جوہر مقالات کی ہیروئن اشرف النساء اپنی تعلیم کی وجہ سے گھر کی حالت کو بہتر بناتی ہے اور تعلیم کی وجہ سے بچوں کی اچھی تربیت کرتی ہے۔ اور باہر کے معاملات بھی سوجھ بوجھ سے سلجھاتی ہے۔

گورڈ کالال اکبری بیگم کا ناول ہے اس میں عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنفہ نے ثریا جبیں جو کہ ناول کا کردار ہے صاف صاف کہلوایا ہے کہ اگر معاشرے میں عورتیں پیچھے ہیں تو صرف اس لیے کہ علم کا دروازہ ان پر بند ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے بھی تعلیم نسواں کے موضوع پر مضمون لکھے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ فرد پڑھ لکھ کر روشن خیال ہو رہے ہیں اس لیے ایسی بیویوں کی ضروت ہے جو کہ پڑھی لکھی سلیقہ مند اور روشن خیال ہوں عباسی بیگم کی زہرا بیگم کا موضوع بھی یہی ہے۔ زہرا بیگم تعلیم یافتہ عورت ہے لیکن اس کی ماں زہرا کی شادی ایک جاہل نواب سے کرا دیتی ہے۔ پہلے وہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ مر جاتی ہے۔ ناول المیہ پر ختہ ہوتا ہے۔ مگر اس میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت ہے۔ یہاں تک کہ عورت کو تعلیم کے لیے انگلستان بھی جانا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ماہ درخشاں بیگم مرزا علی کا ناول ہے۔ اس کا پس منظر مصر ہے۔ اس کی ہیروئن پڑھی لکھی ہے۔ تبلیغ اسلام کرتی ہے۔ باپ کے ساتھ ان کے دفتری کام بھی کرتی ہے۔

طیبہ بیگم کے دو ناول حشمت النساء اور انوری بیگم میں طیبہ لڑکے اور لڑکیوں کو مساوی تعلیم دلانے کی حمایت کرتی ہیں۔

امینہ بیگم کا ضخیم ناول شوکت آرا کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ اس کی ہیروئن کلثوم سکول میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ باپ کے ساتھ طرابلیس کی جنگ میں بھی شراکت کرتی ہے۔ تبلیغ اسلام بھی کرتی ہے۔ صغرا ہمایوں کا مشیر نسواں جس میں نہ صرف ناول کی ہیروئن ''زہرا بیگم'' تعلیم نسواں پہ لیکچر دیتی ہے۔ بل کہ اس کی اشاعت میں بھی حصہ لیتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ عورتیں پردے کے اندر رہ کر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ پردہ کسی بھی طرح ان کی تعلیم کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔

نذر سجاد صاحبہ بھی ان ناول نگاروں میں سے ایک تھیں جنھوں نے نو آبادیاتی ہندوستان میں جنم لینے والے عورت کے تمام مسائل کو نہ صرف سامنے لایا بل کہ اپنی تحریروں کے ذریعے اسے حصول علم کی طرف راغب بھی کیا۔ نذر سجاد کا بنیادی موضوع عورت کی تعلیم ہی ہے۔ انھوں نے اسی ایک موضوع کو اپنے ناولوں میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ''اختر النساء'' کا موضوع بھی یہی ہے۔ اختر جیسا باحیا، حوصلہ مند اور دور اندیش کردار تعلیم کی اہمیت و افادیت کو واضح کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ ناول کا یہ کردار تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود زندگی کی بہت سی تلخیوں سے بڑی حوصلہ مندی سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اختر نہ صرف اپنے نالائق شوہر کے ساتھ اچھے سے زندگی بسر کرتی ہے۔ بل کہ روایتی ہندوستانی عورت کی طرح غریب ساس سسر کی خدمت بھی کرتی ہے۔ صرف اس بنا پر کہ:

> ۔۔۔۔ تعلیم نسواں کے مخالف نہ کہیں کہ دیکھو تعلیم کا اثر وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا۔۔۔۔ کہ علامہ نوکری کرنے نکلی۔ [۱۵]

اختر نے حوصلہ مندی سے ان تمام مشکلات کا سامنا کیا جو تعلیم نسواں کے حصول میں رکاوٹ تھے۔ اگرچہ وہ ایک محب وطن و قوم پرست لڑکی تھی لیکن حصول علم کے لیے اسے اپنا نام، قومیت و لباس تک بدلنا پڑا کہ ہندوستانی سماج میں جہاں عورت کو عورت سے پردہ کرایا جاتا تھا۔ اکثر صورتوں میں تو اسے گھر کے آنگنوں اور دالانوں تک آنے کی اجازت نہ تھی، وہاں اختر کا آزادانہ تعلیم حاصل کرنا نو آبادیاتی ہندوستان کے سماج کے لیے نہایت ذلت آمیز بات تھی۔ معاشرے کے اس رویے کا اظہار اپنے والد کے نام خط میں ان الفاظ میں کیا۔

> ابا جان زمانہ بہت برا ہے اور خصوصاً اطراف پر تو جہال کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفین تعلیم نسواں میری بابت آپ کو بہت برا بھلا کہیں گئے۔ [۱۶]

نذر سجاد نے عورتوں کی سماجی زندگی بہتر بنانے کے لیے تعلیم کو نہایت ضروری قرار دیا۔ قراۃ العین اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

۔۔۔۔۔ ایک نہایت ترقی پسند ناول لکھا گیا جس کی ہیروئن اختر بیگم تھی۔ اس نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقل مندی سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔[۱۷]

اختر سکول کی تعلیم سوتیلی ماں کے سلوک کی وجہ سے حاصل نہ کر پائی اور پھر بیوہ ہو کر نہایت کوشش و محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک معزز سرکاری عہدے پر فائز ہوئی اور حقیقی معنوں میں نسواں ہند ثابت ہوئی۔ اختر النساء اور مسز وقار جیسے کردار تعلیم و تربیت کی بدولت ہی اپنی زندگی کی صحیح راہ متعین کر پاتے ہیں۔ مصنفہ ناول کے اس نوٹ کو ختم کرتی ہے۔

ناظرین یہ ہے تعلیم نسواں کا نتیجہ۔ اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں، مشقیں اٹھائیں اور محنت و کوشش سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس سے خود فائدہ ہی نہیں اٹھایا ایک معزز ملازمت ترک کر کے قومی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور نہایت ہی قدر و منزلت میں عمر بیوگی بسر کی۔[۱۸]

انیسویں صدی میں خواتین کی جدید تعلیم و تربیت کے حوالے سے مختلف مصنفین کی مختلف آراء تھیں۔ نذیر احمد مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام کی بجا آوری کو ناممکن سمجھتے تھے۔ راشد الخیری کے ہاں تو مغربی تہذیب کا اختیار کرنا گویا مذہب سے ہی نہیں بل کہ اخلاق سے بھی بے گانہ ہو جانے کا نام ہے لیکن اس کے ہر خلاف خواتین ناول نگار جو کہ نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثر سے باہر ہیں نہ صرف مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام کی بجا آوری ممکن سمجھتی ہیں بل کہ اس کو مستحسن قرار دیتی ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے ساتھ مشرقی اقدار کو بھی اپنانے پر زور دیتی ہیں۔ یہ رجحان صغرا ہمایوں کے ناول زہرا یا مشیر نسواں سے لے کر بیگم ا۔ض۔ حسن کے روشنک بیگم، تک سبھی کے پاس ملتا ہے۔ زہرا میں انگریزی وضع پر آراستہ مکان ملتے ہیں اور ساتھ ہی یہ تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ کسی قوم کے رسم و رواج کی آنکھیں بند کر کے تقلید کرنی فضول ہے۔ البتہ اس کے ہنر سیکھنے چاہیے۔ صغرا ہمایوں سرگزشت ہاجرہ میں بھی اس تہذیبی امتزاج کو اپنے ایک کردار کے ذریعے ظاہر کرتی ہیں۔

مذہب کے ساتھ مغربی تہذیب کو اپنانے کا جذبہ اس وقت کے بہت سے ناولوں میں شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی پابندی پر ہر ناول نگار نے زور دیا ہے۔ خواتین پر مذہب کی گرفت زیادہ رہتی ہے۔ خواہ وہ ہندوستان کی ہو یا انگلستان کی۔ مذہب اور اخلاق پر زور انگلستان کی بھی خواتین ناول نگاروں نے دیا ہے۔ مس فیلڈ نے سوسن سوفریر (Susan Fraer) کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے تمام ناول اخلاقی مقاصد کے لیے لکھے گئے ہیں اور اس نے دوسری ناول نگار میریا اجورتھ (Mariaedge Worth) کے پاس ضرورت سے زیادہ اخلاقیات پر

زور دینے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح مس ینگ (Miss Young) کے ناولوں کو اس نے مذہبی پروپیگنڈا قرار دیا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی یہ پاس داری ہماری خواتین ناول نگاروں کے پاس بھی بڑی شدت سے ملتی ہے۔[۱۹]

نذر سجاد حیدر بھی اپنے وقت کی بہت بڑی ریفامر تھی۔ ان کی تحریریں اصلاح معاشرہ اور تعلیم نسواں کے لیے تھیں۔ وہ خواتین کی تعلیم اور حقوق و آزادی کی انیسویں صدی کے علم برداروں میں سے ایک بڑی علم بردار نھیں۔ قرۃ العین لکھتی ہیں:

> خواتین کی تعلیم اور ان کے حقوق و آزادی کے سلسلے میں تو اماں Pioneer لیڈی تھیں بڑی ہی Dynamic۔[۲۰]

وہ مسلمان لڑکیاں جو انگلینڈ سے پڑھ کر آئیں یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں ان کو نذر سراہتیں، لیکن بے جا آزادی اور تہذیب مغرب کی نقائی کی شدید مخالف تھیں۔ ناول "نجمہ" میں ایک کردار کی زبانی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

> مگر یورپ کی ملمع کاری مجھ کو ناپسند ہے۔ وہ لڑکی ایک تعلیم یافتہ وشائستہ نوعمر لڑکا معلوم ہوتی ہے۔[۲۱]

مصنفہ اس آزادی کے خلاف تھیں جو عورت سے اس کی نسوانیت چھین لے وہ مسلمان عورت کو مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات سے مزین دیکھنا چاہتی تھی مگر مغربی کی بہترین خصوصیات سے مزین دیکھنا چاہتی تھی مگر مغربی "نجمہ" میں مغربی تہذیب کے منفی پہلوؤں کے خطرناک نتائج دکھا کر اس باغیانہ لہر کو اٹھنے سے روکنے کی کوشش کی جو مغربی تعلیم کے زیر اثر نوجوان طبقے میں پروان چڑھنے لگی تھی۔ "نجمہ" ایک ایسی ہی آزاد خیال لڑکی کی کہانی ہے جو حد سے بڑھی ہوئی آزادی کی ہوس میں الم ناک انجام سے دوچار ہوتی ہے۔

> مرحومہ انگریزی بورڈنگ کی تربیت یافتہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ شائستہ مگر خدا کا خوف۔۔۔ ان کو نہ تھا۔ ورنہ وہ ایسی بے باک فیشن پرست ہو کر اپنے کو تباہ نہ کرتیں۔ جائز و ناجائز آزادی کو اپنا حق سمجھ کر جو چاہا کیا۔[۲۲]

نذر نے "نجمہ" میں تین خاندانوں کا مقابلہ کر کے مغرب زدگی کے ساتھ ساتھ دقیانوسی انداز اختیار کرنے کے خطرناک نتائج دکھائے ہیں۔ ناول نگارے کے نزدیک وہ خاندان نصب العین کی حثیت رکھتا ہے۔ جو مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام پر بھی کاربند ہو۔ ناول کے آخر میں نجمہ کی الم ناک موت سے اس بات کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم اور مشرقی اقدار کی پاس داری ضروری ہے۔

> قدیم طرز کی پابندیوں کی تو میں بھی حامی نہیں لیکن اس قدر آزادی کو بھی میں لڑکیوں کے لیے پسند نہیں کرتی۔ کم سنی میں وہ بہت ناسمجھ ہوتی ہیں۔ کالجوں کی تعلیم بے پردگی اور بے حد آزادی فطرتاً ہر

کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ مگر اس امر کا خاص خیال رکھنا لازمی ہے کہ لڑکے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے۔ [۲۳]

نذیر احمد نے اپنے پہلے ناول مراۃالعروس میں اصغری کے مثبت کردار کو پیش کر کے ثابت کیا کہ انسانی زندگی میں عورت کی جدید تعلیم کا رول کس قدر اہم ہے۔ ایک پڑھی لکھی، سمجھ دار، سلیقہ مند ذہن عورت نہ صرف اپنے گھر کو سنبھالتی ہے۔ بل کہ اس کے فیض سے محلے کی عورتیں بھی سُدھر جاتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو علم کا شوق دلاتی ہے۔ نذیر احمد نے اصغری کو قومی فلاح وہبود کے کام کرتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔

سرشار کی فسانہ آزاد کی ہیروئن حسن آرا مختلف علوم پر دسترس رکھتی ہے۔ شعر وادب کا ذوق ہے۔ وہ تعلیم نسواں کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ بے تکلفانہ سماجی موضوعات پر گفتگو کرتی ہے۔ اپنی سہیلیوں سے سماجی برائیوں پر بحث ومباحثہ کرتی ہے۔ سرشار کے دوسرے ناول کامنی میں بھی ایک پڑھی لکھی ہندو عورت کا ذکر ہے کہ کس طرح وہ اڑوس پڑوس کی عورتوں میں بے داری پھیلاتی ہے۔ جھاڑ پھونک کی مخالفت کرتی ہے۔ ڈاکٹری علاج کے بارے میں معلومات پہنچاتی ہے۔ وہ گاؤں کی عورتوں کو سمجھا بجھا کر ڈاکٹری علاج کروانے پر راضی کرتی ہے۔ حجاب النساء میں بھی عورتوں کو ڈاکٹری کا پیشہ اپنانے کی ترغیب دی ہے۔

نذر سجاد حیدر کے ناول جاں باز کی ہیروئن کو گاندھی اور اس کی تحریک میں دل چسپی ہوتی ہے۔ وہ خلافت کے جلسے میں شہر سے باہر جا کر شریک ہوتی ہے۔ ناول کی ہیروئن زبیدہ کے حوالے سے ایک مرد کردار یوں اظہار کرتا ہے۔

آفریں ہے آفریں، ہندوؤں کا بیڑا پار ہے۔ جس میں ایسی محب وطن دیویاں پیدا ہو گئیں۔ [۲۴]

انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے میں پستی میں پڑی اور پسی ہوئی عورت کے لیے جدید تعلیم بہت ضروری تھی۔ وہ عورت جو صدیوں سے خود کو بابل کے کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے سمجھتی تھی۔ جدید تعلیم کی بدولت اس نے آزادی کی طرف اپنا پہلا قدم بڑھایا۔ جس کی بدولت وہ کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے نہیں رہی بل کہ وہ انسان بن گئی۔ اس نے اپنے گھر اور سماج کو سنوارا، اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے خود کیے۔ مرد جو عقل کل سمجھا جاتا تھا اسے مشورے دیے جو اس پر اثر انداز ہوئے۔ خود اعتمادی بھی جدید تعلیم کی دین ہے۔ حرماں نصب کی فیروزہ اس خود اعتمادی کی بدولت ہی دق ودق میدان میں تنہا وبے پار مددگار رہتی ہے۔

جدید تعلیم نے عورت کے روایتی منفی رویے کو ختم کیا۔ وہ عورت جو دوسری عورت پر ظلم ڈھاتی تھی۔ کہیں ساس کے روپ میں اور کہیں سوتن کے روپ میں، اب عورت کے مسائل سمجھنے لگی۔ نذر نے حرماں نصیب میں ایک

عورت کی دوسری عورت سے ہم دردی کو فیروزہ کے کردار کے ذریعے سامنالایا ہے۔ جب ظفر نے فیروزہ کو پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کے لیے کہا تو فیروزہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ " تمھاری محبت کی ایک اور دعوے دار ہے تمھارا فرض ہے کہ تم ان سے محبت کرو اور اس کو خوش رکھو۔"[۲۵]

طبقاتی سماج میں جدید تعلیم کی ہی بدولت عورت کو قوتِ فیصلہ کی صلاحیت نصیب ہوئی۔ اس سے پہلے وہ مرد کے تابع اور مرہون منت تھی۔ اس کی اپنی ذات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جدید تعلیم کی بدولت وہ معاشی طور پر مستحکم ہوئی اور اپنے مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے لگی۔ اپنی ذات کے بارے میں خود فیصلہ کرنے لگی۔ ظفر کے لیے محبت کے جذبات رکھنے کے باوجود فیروزہ کا اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہ تھامنا اس حقیقت کی عکاسی ہے کہ جدید تعلیم نے عورت میں قوتِ فیصلہ کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

جدید تعلیم نے عورت کی معاشرتی حیثیت کو بلند کیا تھا اور اسی کی بدولت ایک توانا عورت کا تصور سامنے آیا۔ اختر النساء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ۔۔۔۔ ورنہ ہندوستانی بیواؤں کی قابل رحم حالت سے کون واقف نہیں بڑی بڑی مال دار عورتیں شوہر کے انتقال کے بعد دوسروں کی دست نگر اور سب کی نظروں میں حقیر اور ٹکڑے کو محتاج ہو جاتی ہیں اور اختر بے چاری تو نہایت مفلس و نادار شخص کی بیوی تھی۔ اگر چار حرف نہ پڑھے ہوئے ہوتے تو اس کا بھی نہایت خراب حال ہوتا۔ چرخہ کات کر یا مایہ گیری کر کے بسر اوقات کرنی پڑتی۔ مگر چوں کہ تعلیم یافتہ تھی کس سے کس درجے کو پہنچ گئی۔ [۲۶]

پردہ بہت حد تک عورت کی ترقی اور تعلیم کی راہ میں حائل تھا۔ عورت کی سماجی حیثیت کی بہتری میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان میں سانس لیتے ہوئے مسلمان خاندان میں پردہ وہ ذیلی ادارہ تھا۔ جس کی گرفت اپنی عورتوں پر شدید رہی لیکن سچ تو یہ ہے کہ مسلمان ہی کیا۔ ہندوؤں بھی اپنی عورت سے پردہ کرواتا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد پردو زیادہ سخت ہو گیا۔ یہ مرد ہی کی طرف سے خواتین پر پابندی نہیں تھی بل کہ شریف خواتین خود اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی غیر مرد انھیں دیکھے۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ نور جہاں ہوا خوری کے لیے محل کے کوٹھے پر ٹہل رہی تھی کہ کسی راہ گیر نے اسے دیکھ لیا۔ اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا اسی وقت تیچنہ نکال کر راہ گیر کو ختم کر دیا۔[۲۷]

برصغیر کے علمی و ادبی طبقے میں جب پردے کی بحث شروع ہوئی تو شروع میں ناول نگاروں نے زیادہ تر پردے کی حمایت کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ عورتوں کی ترقی کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ بے پردہ ہو کر علم حاصل کریں۔ وہ پردے میں رہ کر بھی باہر کے کام اور انتظام کر سکتی ہیں۔ ناول نگاروں نے ناولوں میں ایسے کردار

پیش کیے جن میں عورتیں پردے کی پابندی کے ساتھ باہر کے کام اور انتظامات دیکھتی تھیں۔ مولوی نذیر احمد اپنے ناول فسانہ مبتلا کے کردار کے منھ سے بالکل مبہم اور دبی زبان میں پردے کی مخالفت کراتے ہیں۔

> ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دونوں چیزوں کو ملا کر اپنے طرز معاشرے کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا دیا ہے۔ بلاشبہ اسلام کا حکم ہے کہ بیباں پردہ کریں اس میں بھی شک نہیں کہ پردے سے ہزارہا مفسدوں کا انسداد ہوتا ہے مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے پردے کو لازم کر دیا ہے۔ افراط ہے۔[۲۸]

عبدالعلیم شرر نے ابتدا ہی سے اپنے ناولوں میں پردے کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے ناولوں میں ایسے واقعات بیان کیے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو پردے کی وجہ سے کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ ناول مینا بازار میں انھوں نے پردے کی مخالفت کی۔ بدر النساء کی مصیبت کا موضوع بھی یہی ہے۔ پردے کی حمایت کرنے والوں کا کہنا تھا کی پردے کی رسم اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان مرد اپنی عورتوں کی قدر کرتے ہیں ان کی عفت و عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کو بے پردہ کرکے بے حرمت نہیں کرتے۔ اس کا جواب شرر نے بدر النساء کی مصیبت کے دیباچے میں یوں دیا:

> جس طرح کسی بڑے موتی یا ہیرے کو آپ سرمایہ ناز سمجھ کر صندوق میں مقفل کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ چاہتے ہیں کہ عورتوں کو بھی مایہ عزت قرار دے کر ڈبیہ میں بند کر دیں۔ خلاصہ یہ کہ عورت ہے بڑی قابل قدر چیز مگر اس کا شمار غیر ذی روح اشیاء میں ہے۔[۲۹]

شرر نے اپنے دوسرے ناول مینا بازار میں پردے کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

> پردے میں رہنے والی عورتیں جو دنیا و مافیا سے بے خبر ہیں اور قیدیوں کی طرح اپنے گھر میں دبی کچلی پڑی رہتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملیں جلیں زمانے اور حالات سے واقف ہوں۔[۳۰]

شرر نے پردے کے خلاف شدید رد عمل پیدا کر دیا۔ بدر النساء کی مصیبت کو مقبولیت حاصل ہوئی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ شرر نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کیا ہے اور ایک ایسے مسئلے پر اپنے پلاٹ کی عمارت کھڑی کی جس پر بات کرتے ہوئے بڑے بڑے روشن خیال اور باہمت لوگ گھبراتے تھے۔ وہ عورت کو چار دیواری کا پابند رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مذہبی نقطہ نظر سے اس پردے کو غلط قرار دیا جو اس زمانے میں مسلمان گھرانوں میں رائج تھا۔ انھوں نے کامنی اور فسانۂ آزاد میں بھی پردے کی مخالفت کی۔ اس دور میں ناول نگار جو پردے کے حق میں نہیں بھی تھے وہ بھی اس ڈر سے اظہار نہیں کرتے تھے کہ لوگ عورتوں کی تعلیم کے

خلاف نہ ہو جائیں۔ اس لیے زیادہ تر لوگ پردے کی حمایت کرتے۔ نواب میر محمد علی کی تصنیف نئی روشنی میں ان لوگوں پر تنقید ہے جو تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ بے پردگی کا پرچار کرتے ہیں۔

ہادی حسین نے حجاب النساء میں دو بہنوں کے کردار پیش کیے۔ ایک نوری اور دوسری ہرمزی نوری پردے میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے جب کہ ہرمزی مغرب کی لیڈیوں سے متاثر ہو کر پردہ چھوڑ کر آزاد ہو جاتی ہے اور اپنی زندگی برباد کر لیتی ہے اور ذلت و رسوائی اس کے ہاتھ آتی ہے۔

طیبہ بیگم کے ناول انوری بیگم میں بھی دبے الفاظ میں پردے کی بہت زیادہ سختی کی مخالفت کی گئی ہے۔ عباسی بیگم اپنے ناول شوکت آزاد میں پردے کے موضوع پر دبے الفاظ میں اظہار خیال کرتی ہیں۔

نذر نے براہ راست اپنے ناولوں میں پردے کی مخالفت نہیں کی۔ مگر اپنے ناولوں میں بلا واسطہ عورتوں کو بے پردہ اور آزادی سے لوگوں سے ملتے جلتے رکھایا ہے۔ مثلاً حرماں نصیب کی ہیروئن پردہ نہیں کرتی۔ اپنے ناول ثریا میں کہتی ہیں کہ:

> کلکٹر صاحب بہادر نے پہلی بیگم صاحبہ کی طرح ثریا جبیں کو بالکل پردہ نہیں کرایا تھا۔ وہ مثل یورپین لیڈیوں کے سوسائٹی میں داخل تھیں۔ بیگم قمر الزماں بھی سندر لال ستیش چندر کلکٹر صاحب اور مکرجی کے سامنے ہوتی تھیں۔[۳۱]

پردہ کے علاوہ بیوگی بھی ہندوستانی عورت کا سب سے بڑا مسئلہ اور اس کے لیے ایک بڑی مصیبت تھی۔ شوہر کے مرنے کے ساتھ ساتھ عورت کی زندگی بھی راکھ ہو جاتی۔ عورت کو شوہر کے ساتھ ہی جلا دیا جاتا۔ آگ کے ہولناک شعلوں میں اس کی درد بھری چیخوں اور زندگی کی بھیک کو دبانے کے لیے بلند و بانگ نعرے لگائے جاتے۔ ہندوستان کی عورت بیوگی کی ناقابل برداشت اذیتوں کو سہنے کے بجائے موت کو گلے لگانا زیادہ پسند کرتی تھی۔ گویا عورت پہلے باپ اور بھائی کی ملکیت تھی بعد میں شوہر کی، بیوہ کی شادی کے خلاف شرافت سمجھا جاتا تھا۔ دوسری شادی کو مرحوم شوہر کی بے وفائی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ منحوس سمجھ کر زندگی کے عام معاملات سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ اسے زندگی میں ہر موقع پر دوسروں سے کم تر سمجھا جاتا۔

راجارام موہن رائے سے لے کر گاندھی تک مصلحین نے ہندوستانی سماج میں بیوہ کی حالت کو بہتر بنانے پر زور دیا ان کے لیے آشرم کھولے گئے۔ ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا کیوں کہ اس کا تعلق ایک حد تک اس بات سے بھی تھا کہ عورتیں خود کفیل نہیں تھیں۔ بنات النعش میں نذیر احمد نے سب سے پہلے بیوہ کے نکاح ثانی کے مسئلے کو اٹھایا اور بیوگی کی مصیبت بھری زندگی کو سامنے لایا۔ ان کے ناول ایامی کا موضوع بھی بیوہ ہے۔ جس میں ہندوستانی

مسلمان بیوہ کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے عقد بیوگان کے مسئلے پر قلم اٹھا کر صدیوں سے چلی آنے والی روایت سے بغاوت کر کے غیر معمولی جرات کا ثبوت دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر زینت بشیر:

> بیوگی کہنے کو تو پانچ حرفی لفظ ہے لیکن اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اس کا صحیح اندازہ ایک بیوہ ہی کر سکتی ہے۔ اس لیے بیوگی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عذاب ہو نہیں سکتا۔ [۳۲]

نذیر احمد نے اپنے ناولوں (ایامی اور بنات النعش) میں بہت کھل کر بیوہ عورتوں کی شادی کی حمایت کی ہے۔ اور اس بات کو انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ بیوہ کی شادی کوئی معیوب بات نہیں بل کہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ وہ بیوہ کو آزادی سے نکاح کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

> بس تم نکاح کر کے اپنی مصیبت رفع کرو گی بل کہ سینکڑوں ہزاروں بیواؤں کی مصیبتیں جو فقط اتنے اشارے کی منتظر ہیں کہ کوئی تم جیسی خداترس آگے بڑھے اور یہ پیچھے ہو لیں۔ [۳۳]

اپنے ایک اور ناول فسانہ مبتلا میں بھی انھوں نے بیواؤں کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ اس کا کردار عارف کہتا ہے کہ سب سے بڑا ظلم جو ہم نے اپنی عورتوں پر کر رکھا ہے۔ وہ ہے کہ بیوہ کا دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے ہزار رہا اللہ کی بندیاں ہیں کہ جنھوں نے شوہر کا منھ تک نہیں دیکھا اور نصیب پر ایسے پتھر پڑے کہ رانڈ ہو گئیں۔ ہندوؤں کی طرح ستی ہو کر ایک بار جل کر مرنا ساری عمر کے جلاپے سے ہزار بہتر تھا۔ [۳۴]

نذیر احمد نے یہ ناول ۱۸۹۱ء میں لکھا اور اس وقت اس طرح کھل کر بیوہ کی شادی کی حمایت کرنا بیوہ کے حق میں بولنا اور اس کی خواہشات کی اہمیت ظاہر کرنا اتنی ہی جرات مندانہ بات ہے جتنی کہ شرر کی پردے کے خلاف جرأت مندانہ حمایت۔

سرشار نے بیوہ کے مسئلے کو پہلے فسانہ آزاد اور پھر کامنی میں اس سے زیادہ کھل کر اٹھایا کہ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے۔ جب کہ لڑکیوں کی شادی بچپن میں ہی ہو جاتی تھی اور وہ اپنی پہاڑ سی زندگی اور جوانی بیوگی کی حالت میں گزارتی تھی۔ بیوہ کی زندگی کس قدر اذیت ناک ہے سرشار کو اس کا پورا پورا احساس تھا۔ انھوں نے ایسی رسوم کی اصلاح پر زور دیا جس کی وجہ سے بیوہ کو سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ وہ اس مظلوم طبقے سے گہری ہم دردی کا اظہار کرتے تھے۔

شرر نے بھی بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کی ہے۔ انھوں نے اپنے ناول دلچسپ میں صاف صاف کہا ہے کہ اسلام میں بیوہ کی شادی کی اجازت ہی نہیں بل کہ یہ اس کا فطری حق ہے جس طرح مرد کا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بیوہ کے اوپر جو طرح طرح کی پابندیاں ہیں جن سے وہ زندگی کی ہر لذت و خوشی سے محروم کر دی جاتی ہے یہ اسلامی نہیں ہے کہ بل کہ یہ مقامی رسم و رواج ہیں۔

محمد طیب کے ناول کا موضوع بھی عقد بیو گان ہے۔ بیوہ عورتوں پر جو ظلم کیے جاتے ہیں ان کی پر زور مذمت ہے۔ اس کا ایک کردار چندر سین ایک نو عمر بیوہ سے محبت کرتا ہے۔ آریا سماج کے منعقدہ جلسوں میں عقد بیو گاں کی حمایت کرتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں قصہ بیان کیا ہے۔ پر اس قصے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے اگر بیوہ کی شادی نہ کی جائے تو اس کے کیا خراب نتائج نکل سکتے ہیں۔

ہندوستانی بیوہ کی زندگی کو راشد الخیری نے اپنے ناول ''نوحہ زندگی'' میں بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ اس قدر تکلیف میں ہے کہ وہ آخر خودکشی کر لیتی ہے۔

شب زندگی میں بھی وہ بیوہ کی زندگی کی پر زور حمایت کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ایک عورت کے ساتھ نا انصافی ہے کہ اس کو بیوگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے۔ دوسرے اس سے کئی معاشرتی۔ اخلاقی برائیاں پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ شب زندگی ناول کی ہیروئن اپنی بیوہ بہو کا نکاح کروادیتی ہے جو کہ آسان کام نہ تھا جو اس پر گزرتی ہے وہی جانتی ہے مگر خدا اور اس کے رسول کے ارشاد میں فرق نہیں آنے دیتی۔

پریم چند کے ابتدائی ناول ہم خرماں وہم ثواب کا موضوع ہندو بیوہ کی حالت کا سدھار ہے۔ پریم چند آریا سماجی تھے۔ آریا سماج نے ہندو مذہب کی قدامت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور آریا سماج نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے بھی کوشش کیں۔ اس ناول میں پریم چند اس رسم کی مذمت کرتے ہیں کہ ہندو بیوہ کا سر منڈوادیا جائے۔ وہ اپنے ناول کے ہیرو کی شادی ایک بیوہ سے کراتے ہیں۔ ان کا دوسرا ناول بیوہ میں ہندو سماج میں بیوہ کی حالت زار کو نہ صرف دردناک پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ بل کہ پریم چند نے اس ناول میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ جن لوگوں کی پہلی بیوی مر چکی ہوں۔ وہ دوسری شادی کسی بیوہ سے کریں اس طرح بیوہ کا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائے گا۔ بیوہ کا ہیرو امرت رائے بیوہ کے مسئلے پر کسی مصلح کی تقریر سن کر بیواؤں کے لیے آشرم کھولتا ہے۔ اس طرح بیواؤں کو بے آسرا ہونے اور مالی طور پر خود کفیل ہونے کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ پریم چند نے اپنے ناول بیوہ میں بیوہ کے مسائل کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے ہر مسئلے اور ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ عقد بیو گان کی پر زور حمایت بھی کی ہے۔ مگر بیوہ کی شادی نہیں کرائی۔ اس کی وجہ امرت رائے یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ آشرم میں پناہ لینے والی بیوہ سے شادی کرے گا تو لوگوں کو آشرم کے بارے میں غلط فہمی ہو گی۔ بیوائیں آشرم میں آنے سے گھبرائے گی۔

پریم چند نے بیوہ کے مسئلے کو زیادہ تر اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً جلوہ ایثار کی ہیروئن برجن ساری زندگی اپنی بیوگی کو بھگتی ہے اور اپنے خراب شوہر کی یاد سینے سے لگائے بیٹھی رہتی ہے۔ گوشہ عافیت، میں بھی

انھوں نے گائتری کے توسط سے بھی بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ وہ اپنی محرومی کو بھلانے کے لیے مزہب اور مصنوعی روحانیت میں پناہ لیتی ہے۔ آخر کو اس کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔ غبن ناول میں بھی انھوں نے بیوہ کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ میدان عمل میں بھی انھوں نے بیوہ کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ پریم چند نے گئودان میں نچلے طبقے کی بیوہ کو پیش کیا ہے۔

فسانۂ خورشیدی (افضل الدین) میں بھی بیوں کی دوسری شادی کی حمایت کی ہے۔ اس ناول کا اصل موضوع تو عورت کی تعلیم ہے مگر اس کا ایک ضمنی کردار مشتری ہے جو کم سعی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جس کا نکاح نواب صاحب سے بہت کوششوں سے ہو جاتا ہے۔

حاجی محمد احسن نے اپنے ناول اشک حسرت میں بیوہ عورتوں کے عقد کی حمایت کی ہے۔ اور اس کے مخالف نظریات کے جواب بھی دیے ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے بھی اپنے ناول اختر النساء میں بیوہ کی حالت کو کئی جگہ موضوع بنایا ہے۔

ہندوستانی رانڈیں ایک کونے میں پڑ کر ساس سسر کی جوتیوں میں عمر بسر کر دیتی ہیں۔[۳۵]

۔۔۔۔بیوگی کی بلا میں بھی مبتلا ہو گئی اب نحوست کے طعنے ہوں گے اور غریب اختر: ساس کی جھڑکیاں ہو گی۔۔۔۔۔ اور بدنصیب اختر۔[۳۶]

اختر النساء کے علاوہ نذر نے دوسرے ناولوں میں بیوہ کے مسائل اور ان کا حل زیر بحث نہیں لایا۔

رشیدۃ النساء نے بھی اپنے ناول اصلاح النساء میں بیوہ کو منحوس سمجھنے کی مخالفت کی ہے اور اس بات کی شدید مذمت کی ہے کہ بیوہ کو شادی بیاہ کے موقعوں پر ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس کو کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ایک جگہ شادی کے موقع پر ایک بیوہ دلہن کے جوڑے پر ہاتھ رکھنے سے گھبراتی ہیں تو دلہا کی ماں ان سے کہتی ہے۔

آپ کو میرے سر کی قسم امتیاز الدین کی دلہن کے کپڑے چھوئے اور خالہ کا ہاتھ کپڑوں پر رکھ دیا۔[۳۷]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خواتین ناول نگاروں نے اس مسئلے کو زیادہ اجاگر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مسلم معاشرے کی خواتین کی عکاسی کی ہے۔ اس معاشرے میں اگرچہ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی اور ہندوستانی سماج کی طرف سے مسلمان بیوہ پر پابندیاں عائد تھی مگر اس کی حالت اتنی زبوں بھی نہ تھی۔ اس کی زندگی میں دوسری محرومیاں ہوں گی مگر مشترکہ خاندانی نظام میں وہ عام طور پر عزت کی زندگی گزارتی تھیں۔

بیوگی کے مسئلے کے علاوہ ہندوستانی مصنفین نے اپنے ناولوں میں مردوں کی ایک سے زائد شادیوں کے سلسلے کو بھی پیش کیا ہے۔ جس کی وجہ سے عورت کو کئی مسائل کا سامنا تھا۔ ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت نذیر احمد نے اپنے ناول فسانہ مبتلا میں پر زور انداز میں کی ہے اور اس کا دردناک انجام بھی دکھایا ہے ضمناً انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ غیرت بیگم جو کہ مبتلا کی بیوی تھی ان کی جہالت، کج فہمی، کی وجہ سے مبتلا کو دوسری شادی کرنا پڑی۔ انھوں نے اسلام کی رو سے چار شادیوں کی اجازت کی وضاحت بھی کی اور یہ بتایا کہ اصل حکم کیا ہے اور کن حالات کی وجہ سے ایسا کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دوسری شادی سے عورتوں کو دُکھ سہنے پڑتے ہیں اور اُن کے ساتھ نا انصافیاں ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ مردوں کو بھی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس ناول میں انھوں نے مردوں کی دوسری شادی کے بُرے نتائج قصے کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔

سرشار اس معاملے میں مردوں کی بے راہ روی پر فسانہ آزاد میں اس اظہار خیال کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے متعلق کہتے ہیں کہ:

> یہاں کے رئیس زادے تو معاذاللہ دو چار دس بیس پر بند نہیں دو گھر ڈال لیں چار کا ساتھ ہے تین نکاح میں کوئی حد نہیں پھر بیسسوائیں الگ۔[۳۸]

کرشن پرشاد کول کے ناولوں میں دوسری شادی کی مخالفت کی گئی اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ دھرم کے پرانے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر قانون میں اس طرح ترمیم ہونی چاہیے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی ہرگز جائز نہ ہو۔

راشد الخیری نے بھی ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت کی۔ وہ بھی اس بات کے حامی ہیں کہ مذہب نے کڑی شرائط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ انھوں نے دوسری شادی کو نفس پرستی پر عبارت کیا ہے اور وہی اس کی بہت حد تک ذمہ داری عورتوں پر بھی ڈالی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے مردوں کو دوسری شادی کرنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ ان کے ناول شب زندگی میں وسیم دلہن ایسا ہی کردار ہے جو تیز مزاجی کی وجہ سے شوہر کی دوسری شادی کی وجہ بن جاتی ہے۔

یاسمین شام میں بھی ایک سے زیادہ شادی کے مسئلے کو لیا ہے۔ اس میں مصنف نے ان والدین کی مذمت کی ہے جو شادی شدہ کو اپنی بیٹی دے دیتے ہیں۔

اکبری بیگم نے گورڈ کا لال میں اس طرح کے مسئلے کو اٹھایا ہے کہ اس معاشرے میں مرد تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور عورتیں جاہل اور بے ترتیب ہیں۔ جن سے ماں باپ زبردستی شادی کر دیتے ہیں۔ مرد مجبور ہو کر جاہل بیوی کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر موقع ملتے ہی روشن خیال پڑھی لکھی عورت سے شادی کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی

کہنا ہے لوگوں کو ایسے مردوں سے اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کرنا چاہیے جن کی پہلے سے بیویاں موجود ہوں۔ اگر مجبوراً ایسا کرنا بھی پڑ جائے تو پڑھی لکھی بیویوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی جاہل سوت کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنے اس کے حقوق کی حفاظت کرے اور ناانصافی نہ کرے۔

بشیر الدین کے ناول اقبال دلہن کا موضوع نکاح ثانی کے برے نتائج کا بیان ہے۔ خیار بانو کا ناول فریب زندگی کا موضوع بھی ایک سے زیادہ شادی کے بُرے نتائج ہیں۔ ناول کا ہیرو دوسری شادی ایک طوائف سے کر لیتا ہے۔ اس شادی کا انجام برا ہوتا ہے اور پورے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مرد کی ایک سے زائد شادی پورے ہندوستان کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ نذر سجاد حیدر نے کثرت ازواج سے جنم لینے والے خواتین کے دیگر کئی اور مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ عورت، مرد کی کئی شادیوں کی صورت میں محرومیوں کا شکار ہو جاتی تھی۔

> بہت ہی محبت بھری ساعتوں میں جب کہ وہ مجھ پر بھی نثار ہوا کرتے تھے کسی خیال کے آتے ہی گم ہو کر آہ کر لیتے تھے ان کی اس کیفیت کا ان کی بیوی کے دل پر کیا اثر ہوتا ہو گا؟ ذرا اور بیویاں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں۔[۳۹]

نذر نے اپنی تحریروں میں کثرت ازواج کی مخالفت کرتے ہوئے اس سے اٹھنے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس پر زور دیا ہے کہ دو شادیاں اقتصادی نقطہ نظر سے غلط ہیں۔ مرد کی ایک سے زیادہ شادی سے عورت کن مصیبتوں سے گزرتی ہے اس کو آہ مظلوماں میں بڑے پر اثر انداز سے بیان کیا۔

> ۔۔۔۔ دوپہر دن چڑھ آیا کسی نے ان کی (زبیدہ پہلی بیوی) روٹی کی پروانہ کی بچوں نے بھوک سے بلبلانا شروع کیا وہ مجبور کیا کرتی کہاں سے لاتی سوا بھُس اور کھلی کے گھر میں کچھ نہ تھا۔ پڑوسیوں سے ملنے کا حکم نہ تھا تمام دن سخت مصیبت سے گزرا۔ دن بھر کھانے کی کسی نے خبر نہ لی۔۔۔ آہ ایسے ظالموں پر آسماں کیوں نہ ٹوٹ پڑتا۔ کیا زبیدہ اس گھر کی حق دار نہ تھی یا وہ غریب ان کے بچے نہ تھے۔ ہائے اس مظلوم پر کیا گزری اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔[۴۰]

اپنے ناولوں میں نذر جابجا اس برائی کے خلاف احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔ ناول اختر النساء میں ستارا کی زبانی کہلواتی ہیں:

> ستارا۔ معاف کریں۔ آپ لوگوں میں دوسری شادی کا بہت بُرا رواج ہے۔ اسی کے سب بُرے نتائج ہیں۔[۴۱]

ہندوستانی معاشرہ میں کثرت ازدواج نے رواج کی صورت اختیار کی لی تھی۔ ذرا سا بہانہ لے کر مرد دوسری شادی کر لیتا تھا۔ دوسری شادی کے اس معاشرے میں کئی محرکات تھے اولاد نرینہ، بیوی سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

---بعض ہندوستانی لوگوں کا خیال ہے کہ کم از کم ایک بیٹا ضرور ہونا چاہیے جو جائیداد وغیرہ کا مالک ہو اور جس سے نام چلے۔[۴۲]

جہاں تک میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کا معاملہ ہے اس میں بغیر مرضی کی شادی کا بہت حد تک عمل دخل تھا، اس میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ گھر کے بزرگ شادی طے کرتے تھے۔ ان کی مرضی اور پسند پر شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ مرد کسی نہ کسی حد تک اپنی مرضی شامل کر لیتے تھے۔ اور اگر زبردستی ان کی بے مرضی کی شادی ہو بھی جاتی تو پھر اپنی مرضی سے دوبارہ شادی کر لیتے۔

---حضور جانتے ہیں مجھ کو سلطنت آراء بیگم (بیوی) سے ذرا محبت و موانست نہیں اس صورت میں میں ان سے کیسے نباہ کر سکتا ہوں جب کہ میری دل و جان کی مالک اب مجھے مل گئی ہے۔ امید کرتا ہوں۔۔۔ میری بے ادبی کو معاف فرمائیں گے اور آئندہ اپنے پوتوں کی شادیوں کے وقت احتیاط سے کام لیں گے اور ان کی شادیاں ان کی مرضی کے موافق کریں گے۔[۴۳]

ناول نجمہ میں بھی نذر نے دوسری شادی کی مخالفت کی ہے۔ نجمہ کا الم ناک انجام مصنفہ کی اس سوچ کا عکاس ہے۔ اگرچہ وہ خود کو جمیل کی کنیز خیال کرتی ہے۔ اس کو اپنا مالک قرار دیتی ہے۔ اور شوہر پرست عورت کی طرح جمیل پر پروانہ وار نثار ہوتی ہے۔ جمیل بھی اس سے انتہائی قلبی و روحانی وابستگی رکھتے ہیں۔ لیکن دوسرے نکاح سے احتراز کرتے ہیں جس کو سراہتے ہوئے مصنفہ شکیلہ کی زبانی لکھتی ہیں۔

اگر جمیل سچے مسلمان اور فرض شناس و رحم دل انسان نہ ہوتے تو ضرور ان سے بھی شادی کر لیتے اور میں زندہ درگور ہو جاتی ان بیچارے نے خود قلبی روحانی تکالیف برداشت کیں۔ مگر اس سے دوسرا نکاح نہ کیا۔[۴۴]

اپنے ایک اور ناول حرماں نصیب میں بھی وہ جب ہیروئن کو ہیرو سے ملواتی ہیں تو وہ شادی شدہ ہوتا ہے۔ ہیروئن اس سے شادی کرنے کے بجائے سمجھا بجھا کر پہلی بیوی کی طرف بھیج دیتی ہے۔ یہاں وہ مسئلے کا یہ حل نہیں نکالتی کہ مرد شادیاں کرے اور دونوں بیویاں اتفاق سے رہیں۔

ظفر اب جو باتیں بے سود اور رنج زدہ ہیں ان کے کرنے سے کیا فائدہ اور اگر تم انھیں چھیڑو تو اپنی بیوی کے مجرم ہو میرا مالک تو سوائے تمھارے نہ کوئی ہوا نہ ہو گا مگر تمھاری تمام محبت کی ایک اور

دعوے دار ہے۔ تمھارا فرض ہے کہ تم اس سے محبت کرو اور اس کو خوش رکھو۔ بیوی سے چھپ کر مجھ سے ملنا یا مجھ سے محبت کرنا اخلاقی گناہ اور خدا کا گناہ ہے۔[۴۵]

مصنفہ نے اپنے ناول آہ مظلوماں میں مردوں سے درخواست کی ہے وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں اور عورتوں کی زندگی بہتر بنانے اور ان کے سلسلے میں اصلاحات کی بھی درخواست کی گئی ہے۔

---نہایت ہی منت و عاجزی کے ساتھ آپ ہی سے صدہا نہیں ہزارہا دردمند دلوں کی التجا ہے کہ ہمارے سچے ہم درد باپوں حقیقی خیر خواہ بھائیوں خدا کے واسطے ہم پر رحم کر کے سب سے پہلے ہماری خبر لو۔ تب تو ہم بھی ریفارم کیے گئے۔ ورنہ خواہ کسی قدر اصلاحیں کیوں نہ کرو ہمیں کیا ہماری زندگیاں تو یوں جل جل کر گھٹ گھٹ کر مر مر کر برباد ہو رہی ہیں۔[۴۶]

اردو کے ناول نگاروں نے بے جوڑ شادی کو شروع ہی سے موضوع بنایا ہے۔ ایامی میں مولوی نذیر احمد اس کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کے معاملے میں عورتوں کی درماندگی اس درجے کو پہنچی کہ ان میں اور افریقہ کی لونڈی غلاموں میں کچھ فرق نہیں۔ مالک نے جس کے ہاتھ چاہا لونڈی غلاموں کو بھیج دیا۔ اس طرح ولی بزرگ یا سرپرست جس کے ساتھ جی میں آیا عورت کو بیاہ دیا۔[۴۷]

سرشار بھی شوہر کے انتخاب میں لڑکی کی مرضی کو اہمیت دیتے ہیں۔ فسانہ آزاد کی ہیروئن حسن آرا کی زبانی وہ اس بات کو بہت وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ میاں بیوی کو ایک متعدبہ حصہ باہم صرف کرنا پڑتا ہے اور اگر نہ بنی یا پھوٹ ہو گئی یا چخ چلی یا شکر رنجی ہو گئی تو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔[۴۸] اس لیے ضروری ہے کہ شادی کے فیصلے میں دونوں کی مرضی شامل ہو۔

شرر نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی پسند کی شادی کی پرزور حمایت کی۔ انھوں نے احکام شرع کو نظر انداز کر کے رسم و رواج پر عمل کرنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسلام میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی پہلی شرط ہے۔ یہ جہالت اور رسم پرستی کی وجہ سے شادی کا معاملہ مشاطوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں کئی شادیاں ناکام ہو جاتی تھیں۔ اپنے ناول دل چسپ میں بھی انھوں نے مرد کی ناپسند کی شادی کو موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں اس کا بھگتان عورت ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

راشد الخیری کا ناول سوکن کا جلاپے کا موضوع بھی دوسری شادی کے غلط نتائج ہیں۔ سنجوگ کا موضوع بھی دولت کے لالچ میں آکر لڑکی کی دوسری شادی اور اس کا بُرا انجام دکھایا گیا ہے۔

طیبہ بیگم کے ناول انوری بیگم میں بھی پسند کی شادی کی حمایت کی ہے۔ وہ لڑکی کی بغیر مرضی کی شادی کی مذمت کرتی ہے، اور تمام والدین کو لڑکیوں پر اس ظلم سے باز رہنے کا مشورہ دیتی ہے۔

عباسی بیگم کا ناول زہرا بیگم، صغرا ہمایوں کا سرگزشت ہاجرہ، محمد علی کا ناول اختر و حسینا میں بھی جبری شادی کے نقصانات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ شادی اگر مرضی کے بغیر نہ ہو تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔

پریم چند کے متعدد ناولوں کا بھی یہی موضوع ہے۔ ان ناولوں میں جلوہ ایثار، بازار حسن، نرملا، چوگان ہستی وغیرہ شامل ہیں۔

اکبری بیگم کا ناول گورڈ کالال کی ہیروئن ثریا جبین ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ شادی کے موضوع پر کھل کر بات کرتی ہے اور وہ یہ بتاتی ہے کہ وہ کس طرح کے شوہر کو پسند کرتی ہے۔

مجموعی طور پر اس دوران جتنے بھی ناول لکھے گئے ان سب کا موضوع عورت کی سماجی حیثیت تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ان ناولوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ عورت کی حیثیت کو بہتر بنائے بغیر مصلحین قوم کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ اگر ان تمام ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت کی روداد بیان کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عابدہ علی، عورت قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں (لاہور: قرآن منزل۔ س۔ن)

۲۔ شوکت تھانوی، بہشتی زیور (لاہور: کتب خانہ جمیلی، س۔ن۔)۔

۳۔ عقیلہ جاوید، اردو ناولوں میں تانیثیت (ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۲۰۔

۴۔ رشیدۃ النساء، اصلاح النساء (کراچی: احمد برادر، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۔

۵۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء، ص ۱۰۲۔

۶۔ ایضاً، ص ۳۲۔۳۳۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۸۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۱۔ نذیر احمد، دیباچہ مراۃ العروس (مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد)، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۸۰۱۔

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ س۔ن)، ص ۸۱۔

۱۴۔ عبدالحلیم شرر، حسن کارڈاکو (لکھنؤ: دل گداز پریس، س۔ن۔)، ص ۲۴۔

۱۵۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص ۱۷۲۔۱۷۳۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۱۷۔ غلام محی الدین انصاری سالک، ہندو پاک کی خواتین ناول نگار (نئی دہلی: شاید پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۴۔

۱۸۔ نذر سجاد حیدر، ا ختر النساء بیگم، ص ۲۴۵۔

۱۹۔ یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، (حیدرآباد: نیشنل بک ڈپو، ۱۹۸۳ء)۔

۲۰۔ ارتضیٰ کریم، قرۃ العین : ایک مطالعہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء)، ص ۴۱۔

۲۱۔ نذر سجاد حیدر، نجمہ، ص ۱۵۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۵۔

۲۳۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص ۱۷۴۔

۲۴۔ نذر سجاد حیدر، جاں باز، ص ۲۷۔

۲۵۔ نذر سجاد حیدر، حرماں نصیب، ص ۸۶۔

۲۶۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص ۲۴۵۔

۲۷۔ زاہدہ حنا، عورت: زندگی کا زنداں، ص ۱۳۵۔۱۳۶۔

۲۸۔ نذیر احمد،فسانۂ مبتلا(مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد)،ص۱۹۷۔

۲۹۔ عبدالحلیم شرر،بدر النساء کی مصیبت(لکھنؤ:نسیم بک ڈپو،۱۹۷۲ء)،ص۲۵۔

۳۰۔ عبدالحلیم شرر،مینا بازار(لکھنؤ:یونائیٹڈ انڈیا پریس،س۔ن۔)،ص۹۔

۳۱۔ نذر سجاد حیدر، ثریا،ص۱۰۔

۳۲۔ زینت بشیر،نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار(حیدرآباد:الیاس ٹریڈرز، ۱۹۹۷ء)،ص۴۱۹۔

۳۳۔ نذیر احمد، ایامی،ص۱۴۲۔

۳۴۔ نذیر احمد، فسانۂ مبتلا(مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد)،ص۷۲۰۔

۳۵۔ نذر سجاد حیدر،اختر النساء بیگم،ص۱۶۶۔

۳۶۔ ایضاً،ص۱۷۳۔

۳۷۔ رشیدۃ النساء،اصلاح النساء،ص۳۲۔

۳۸۔ سرشار،فسانۂ آزاد،ص۳۴۱۔

۳۹۔ نذر سجاد حیدر،نجمہ،ص۱۶۸۔۱۶۹۔

۴۰۔ نذر سجاد حیدر، آہ مظلوماں،ص۳۳۔

۴۱۔ نذر سجاد حیدر،اختر النساء بیگم،ص۲۲۰۔

۴۲۔ ایضاً،ص۱۸۴۔

۴۳۔ نذر سجاد حیدر، ثریا،ص۱۰۴۔۱۰۵۔

۴۴۔ نذر سجاد حیدر،نجمہ،ص۱۷۵۔

۴۵۔ نذر سجاد حیدر،حرماں نصیب،ص۸۶۔

۴۶۔ نذر سجاد حیدر،آہ مظلوماں،ص۱۰۴۔

۴۷۔ نذیر احمد،ایامیٰ،ص۱۳۸۔

۴۸۔ سرشار،فسانۂ آزاد،ص۳۲۲۔

باب چہارم:

نذر سجاد کے ناولوں کے کرداروں کا تانیثی مطالعہ

اختر النساء بیگم(تانیثی مطالعہ):

نذر سجاد حیدر کا شمار اردو کی اولین قصہ گو خواتین میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے بنت نذر باقر کے نام سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نذر سجاد حیدر اردو کے پہلے افسانے نگار یلدرم کی زوجہ اور اردو ادب کی مایہ ناز ناول نگار قرۃ العین کی والدہ تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں میر نذر الباقر کے ہاں پیدا ہوئیں جن کا نام مسرت تنویر رکھا گیا۔ میر نذر باقر کا گھرانہ روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ شدید روایتی پردے کے بھی مخالف تھا۔ میر باقر نے اپنی بیٹی نذر زہرا اور ان کی چھوٹی بہن ثروت کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک یوریشین میم ملازم رکھی۔ وہ اپنی بڑی بیٹی نذر زہرا کو ڈاکٹر بنانا چا

ہتے تھے لیکن وہ اردو کی ایک قابلِ فخر ادیب بن کر سامنے آئیں۔ انھوں نے افسانے مضامین اور ناول لکھے جو اس زمانے کے مشہور رسائل "تہذیب نسواں"، "خاتون" اور "عصمت" میں شائع ہوتے رہے۔

۱۹۰۹ء میں مولوی ممتاز علی کے جاری کردہ ہفتہ وار اخبار "پھول" کی ایڈیٹر بھی رہیں جو دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ نذر سجاد نے بچوں کے لیے سلیم کی کہانی، پھولوں کا ہار، سچی رضیہ اور اس کی بکری جیسی کہانیاں لکھیں جنھیں پنجاب ٹیکسٹ بک کمپنی نے اردو نصاب کا حصہ بنایا لیا۔

اختر النساء بیگم نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۱۰ء میں چودہ سال کی عمر میں لکھا۔ نذر سجاد نے تقریباً دس ناول اور دو سو افسانے لکھے جن میں سے اختر النساء (۱۹۱۰ء)، آہ مظلوماں (۱۹۱۴ء)، جاں باز (۱۹۳۵ء)، نجمہ (۱۹۳۹ء) اور حرماں نصیب (۱۹۳۸ء) زیادہ مقبول ہوئے۔ مولانا رزاق الخیری نذر سجاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اگر یہ بحث چھڑے کہ خود عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی انتھک کوششیں کیں، عظیم المرتبت، بلند پایہ لکھنے والیوں میں اردو کی کون سی مصنفہ ہے جس کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی
>
> شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو تو ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک نام لیا جائے گا نذر سجاد حیدر۔[1]

نذر سجاد حیدر نے جب لکھنا شروع کیا تو یہ بیسویں صدی کے اوائل کا دور تھا۔ جس میں ہندوستان سیاسی و سماجی ہر دو سطحوں پر بڑی تبدیلیوں کی زد میں آ چکا تھا۔ پرانی اقدار تیزی سے بدل رہی تھی لیکن عوام کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس وقت کا ہندوستان مسائل کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ عورتوں کی حالت خاص طور پر خراب تھی۔ معاشرے کے بے جا رسم و رواج کی قید نے عورت پر بہت ظلم ڈھایا تھا۔ تعلیم کے فقدان نے جاہلانہ ریت و رواج کو تقویت بخشی جس کی وجہ سے معاشرہ مسلسل انحطاط کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں لوگ اصلاح کے لیے آئے۔ خواتین نے بھی اپنے طبقے کی اصلاح کے لیے آواز اٹھائی۔ انھی خواتین میں نذر سجاد حیدر کا نام بھی اہم ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعے عورت کو معاشرے کا اہم جز قرار دیتے ہوئے اسے اس کی صلاحیتوں سے آگاہ کروایا بل کہ غازی پور میں اسلامیہ گرلز سکول

سامنا کرنا پڑا۔

مارچ ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ میں شیخ محمد عبداللہ، نذر زہرا اور چند دوسری خواتین اور حضرات نے ایک آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء کو سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ یہ کانفرنس نسبتاً کامیاب رہی لیکن ایک اخبار نے تنقید کرتے ہوئے لکھا:

> جب سے یہ تحریک شروع کی گئی ہے بہت سی گوشہ نشین خواتین میں ایک جوش سا پیدا ہو گیا ہے۔ خدا نہ کرے بنت نذر باقر اور ان کی ہم خیال لڑکیوں اور بیگمات کو اس میں کامیابی ہو یہ بے جا آزادی کا پیش خیمہ ہے۔[۲]

نذر سجاد حیدر نے ان تمام مخالفتوں اور تعصبات کی فکر نہ کرتے ہوئے حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

> وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اولین خاتون رہنماؤں میں سے تھیں جنھوں نے لاتعداد بے زبان عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور انھیں مردوں کے پنجۂ استبداد سے رہا کرانے کی کوشش کی۔ ان کے متعدد افسانے اور ناول اسی جدوجہد کی غمازی کرتے ہیں۔[۳]

نذر سجاد کی مساعی جمیلہ کا مقصد خواتین کو اپنی صلاحیتوں کی پہچان کرا کر بہ وقتِ ضرورت ان کو بروئے کار لانے کا جذبہ اجاگر کرنا تھا۔ اس کے حصول کے لیے انھوں نے ایسے کردار تخلیق کیے جو تعلیم یافتہ، باہمت، خود اعتماد، اور آزاد خیال ہیں، جو اپنا راستہ خود اپنی جدوجہد سے متعین کرتے ہیں۔ اختر النساء بیگم کی تخلیق بھی مصنفہ کی اسی سوچ کی عکاسی ہے۔

نذر سجاد کی تحریروں کے موضوعات عورت کی مظلومیت، بے چارگی، پردے کی بے جا پابندی، تعلیم کی کمی، دوسری شادی، عورت کے عورت پر مظالم، بے جا آزادی ور مغرب کی اندھی تقلید کے خلاف ہیں۔ "اختر النساء بیگم" بھی انھی موضوعات پر مشتمل ایک ایسا ناول ہے جو انھوں نے انتہائی کم عمری میں "تہذیبِ نسواں" کے لیے لکھا۔ قرۃ العین حیدر اس بارے میں لکھتی ہیں:

> امی نے چودہ برس کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اصلاحی ناول لکھا جس کی ہیروئین اختر النساء بیگم نے مردوں کے معاشرے سے مظالم کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔[۴]

اختر النساء بیگم انیسویں صدی کے روایت پرست معاشرے میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی دردناک سرگزشت ہے جو اپنی روشن خیالی اور تعلیم کی بدولت مسائل پر قابو پا لیتی ہے۔ نذر سجاد نے یہ ناول طبقہ اناث کی اصلاح و حمایت میں لکھا وہ خود لکھتی ہیں:

اپنے قلم کج مج رقم سے ایک مضمون قصے کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیا جس میں بے سوچے سمجھے دوسری شادی کی خرابیاں، جاہل ماں کا سوتیلی اولاد سے بُرا برتاؤ، تعلیم یافتہ لڑکی کا بد مزاج جاہل سوتیلی ماں کی اطاعت کرنا اور دوسری شادی کے بعد باپ کا بیٹی کی طرف سے بے پرواہو جانا اور جاہل بیوی کے کہنے سے ایک جاہل و ذلیل گھر میں بیٹی کی شادی کر دینا اور سمجھ دار لڑکی کا صبر و تحمل کے ساتھ سب مصیبتیں برداشت کرنا اور بعد انتقال شوہر لاوارثی کی حالت میں کوشش اور محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے قومی خدمت میں عمر بیوگی بسر کرنا وغیرہ مضامین مذکورہ تھے۔[۵]

اختر النساء بیگم کا پلاٹ دو گھرانوں کی کہانی پر مشتمل ہے۔ ایک گھرانہ رفیق احمد کا اور دوسرا مسز وقار کا ہے۔ رفیق احمد کی بیٹی اختر النساء آٹھ برس کی تھی کہ اس کی ماں جو کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت سلیقہ شعار خاتون تھیں، وفات پا گئیں۔ بیوی کی وفات کے بعد رفیق احمد (بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی) جو کہ نہایت آزاد خیال جنٹلمین تھے۔ لوگوں کے کہنے سننے میں آکر دوسری شادی پر آمادہ ہو گئے۔ جانی بیگم ان کی دوسری بیگم تھی جو نہایت بد سلیقہ، پھوہڑ اور جاہل عورت تھی، جس نے آتے ہی نہ صرف پورے گھر کا نظام بگاڑ دیا بل کہ اختر بھی ان کے سوتیلے پن کا بری طرح شکار ہونے لگی، لیکن اپنی امن پسند طبیعت کی بدولت کبھی باپ سے شکایت نہ کی۔ بیوی کے چکر مکر میں آکر رفیق احمد بیٹی سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً اختر جیسی سلیقہ شعار، اور پڑھی لکھی لڑکی کی شادی، جانی بیگم اپنے مفاد کی خاطر ایک جاہل و ذلیل گھرانے میں کرا دیتی ہے جہاں پہلے ہی سے کئی مسائل اور مصیبتیں اختر کی منتظر تھیں جنھیں اختر خاموشی سے برداشت کر گزرتی ہے۔ شوہر (ظفر) کی وفات کے بعد مسائل و دقتوں میں گھری اختر دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کرتی ہے اور انتھک محنت و کوشش کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انسپکٹریس زنانہ مدارس کے عہدے پر فائز ہو کر اپنی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔

ناول میں اختر کی خالہ مسز وقار کے گھر کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ، با اخلاق اور شریف لوگوں پر مشتمل ایک گھرانہ ہے جس کی امن و آشتی، سکھ، چین لوگوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ یہ مسز وقار کی بہترین تربیت و پرورش کا نتیجہ ہے جو ہر کام شریعت و تہذیب کے تقاضوں کے مطابق سر انجام دیتی ہیں۔

نذر سجاد کا یہ ناول ان کی روشن خیالی، جدت پسندی اور ہندوستانی سماج پر ان کی دقتِ نظر کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے ناول میں لاڈلی اور جانی بیگم کے کرداروں کی صورت میں ناخواندہ ہندوستانی عورت کی جہالت و کج رویوں کو سامنے لایا ہے جس کی کج خلقی، بد سلیقگی اور جہالت کے باعث کنبے کے کنبے بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ناول میں جانی بیگم ایک ایسا ہی کردار ہے جو ہندوستانی نام نہاد پردے اور رسم و رواج کی ایسی اسیر ہے کہ مسٹر رفیق جیسے عالی خیال شخص کو اپنے دام جال میں ایسا پھانس لیتی ہے کہ وہ اب اکثر اوقات گلے اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لپیٹے رکھتے

تھے۔ اسی پر بس نہیں تھا بل کہ پوری رفیق منزل جو مرحومہ مسز رفیق کی نفاست اور اعلیٰ ذوق کا نمونہ تھی ہندوستانی رسم ورواج کا اکھاڑہ بناڈالتی ہیں۔

گو ابھی ان بیگم صاحبہ کو آئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا لیکن اختر نے گھر کا انتظام اور ہی پایا۔ کیوں کہ انھوں نے یہاں آتے ہی سب ردوبدل کر دیا تھا۔[6]

کھانے کا کمرہ، خانساماں، باورچی خانہ، مالی، سب کچھ بدل دیا گیا یہاں تک کہ ہندوستانی پردے کے پیش نظر باغیچے کے جنگلے کے گرد قناتیں لگوادی گئیں۔ جس پر اختر کہتی ہے کہ "ابا جان! آخر اماں جان بھی اسی میدان میں آیا کرتی تھیں۔ کیا ان کا پردہ نہ تھا؟"[7]

اختر کا متشدد قسم کے پردے پر اٹھایا گیا سوال مصنفہ کے جدت پسند خیالات کا ترجمان ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ عورت کی مادر پدر آزادی کی حامی ہیں بل کہ انھیں پردہ کی بے جا پابندی کھلتی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ "ہندوستانی پردے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ شدت کا پردہ محض ہندوستان کی اختراع ہے۔"[8]

دراصل نذر سجاد اس پردہ کے خلاف تھیں جو عورت کو چاردیواری میں قید کر کے زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک ہونے میں حائل تھا جس کو بنیاد بنا کر ہندوستانی مسلم سماج نے عورت کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

ناول میں جانی بیگم نہ صرف اس روایتی پردے پر سختی سے کاربند ہے بل کہ ایک ان پڑھ وجاہل عورت کے روپ میں سوتیلی ماں کا ایک ایسا کردار بھی ہے جو اپنے جاہلانہ اور عدوات پر مبنی فیصلوں کی بدولت اختر کی زندگی کو اجیرن بنادیتی ہے اور موقع بہ موقع اختر ان کے عناب کا نشانہ بننے لگی۔

آیندہ مجھے اماں جان اماں جان کہہ کر نہ بلانا ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔[9]

جانی بیگم کا یہ کاٹ دار اور تفاخر بھرا لب ولہجہ ایک جاہل عورت کی نفسیات کو بڑی وعمدگی سے پیش کرتا ہے۔

جانی بیگم کو بیگم صاحبہ کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل ہے کہ اختر کی حسیّت لہجوں کے فرق کو سمجھتی اور محسوس کرتی ہے لیکن اپنی امن پسند طبیعت کی بدولت کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی سوائے اس کے کہ

۔۔۔۔ اور مجھے کسی کی کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو یہ کہ بیگم صاحبہ اسکول میں مجھ کیوں نہیں جانے دیتیں۔[10]

اختر کی امن پسندی وصلح جوئی کے باوجود جانی بیگم اپنی مکرانہ چالوں سے باز نہ آئی۔ باپ کو بیٹی سے بدگماں کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

انھیں خیال آیا کہ میاں آئیں گے، بیٹی کو روتا دیکھیں گے تو بُرا نہ ہو خود بھی منھ پر رومال رکھ کر لیٹ گئیں۔[11]

حسین بیوی کے اسی مکر و فریب اور ناز و غمزے کا نتیجہ تھا کہ آہستہ آہستہ رفیق احمد بیٹی سے لاپرواہوتے چلے گئے۔ نتیجہ اختر کی ان پڑھ شوہر اور رزیل خاندان میں شادی کی صورت میں سامنے آیا۔ نذر سجاد نے اس ناول میں سوتیلی ماں کے ناروا سلوک کا عذاب سہنے والی اختر کی زندگی کو پیش کر کے ہندوستانی مسلم سماج میں پنپنے والی دوسری شادی جیسی قبیح رسم کا خاتمہ کرنا چاہا۔ یہی وجہ ہے رفیق احمد پر حقیقت کے عیاں ہونے پر خود اس کا اقرار کرواتی ہیں۔

---اس تکلیف کا باعث صرف بیگم ہی نہیں بل کہ میری دوسری شادی ہوئی۔[12]

ستارا کے روپ میں اختر بھی اپنی ذات پر گزری زیادتیوں کا نتیجہ والد کی دوسری شادی کو قرار دیتی ہے۔

آپ لوگوں میں دوسری شادی کا بہت بڑا رواج ہے اسی کے سب برے نتائج ہیں۔[13]

دوسری شادی اور سوتیلی ماں کی بد سلوکیوں کا کرب سہنے والے بچوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے نذر سجاد خود لکھتی ہیں:

جاہل و ظالم سوتیلی ماں کے ہاتھوں ہزاروں بن ماں کے بے بس بچوں کی جانیں عذاب میں ہیں لڑکے پھر بھی تھوڑے عرصے بعد خود مختار ہو کر ان عذابوں سے نجات پا لیتے ہیں لیکن افسوس بے چاری لڑکیوں کی حالت پر جو بوجہ بے زبانی و بے بسی و کم علمی کے عمر بھر کو برباد اور زندہ در گور ہو جاتی ہیں۔ اول تو سوتیلی ماں کے اختیار میں میکے میں ہی سخت محنت اٹھاتی ہیں۔ پھر ماں کی مہربانی سے دوسرا گھر بھی دوزخ سے کم نہیں ملتا۔[14]

ایسا ہی کچھ قصے کی ہیروئن اختر کے ساتھ ہوا۔ رفیق احمد بھی اختر کو سوتیلی ماں کو سونپ کر بیٹی کی ہر طرح کی ذمہ داری سے بے نیاز ہو گے، اور بغیر تحقیق و چھان بین تعلیم یافتہ اختر کو ایک بے جوڑ شخص سے منسوب کر دیا گیا۔ اختر کو اس بات کا نہایت قلق تھا جس کا اظہار یوں کرتی ہے:

وہ کون لوگ ہیں کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی۔ اس کی عادات۔ مزاج۔ اخلاق۔ تعلیم، عمر، خیالات۔ نام تک بھی تو مجھے معلوم نہیں۔۔۔۔[15]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کو اس زبوں حالی کا شدت سے احساس تھا، کہ جہالت کی بنا پر عورت کی مرضی و رضا کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اختر کس طرح عورت کی بے بسی اور بے زبانی کو محسوس کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب مسٹر وقار اپنی بیٹیوں کو نسبت طے کرنے سے پہلے ان کی رائے لینا چاہتے ہیں۔ تب اختر سماج کے جھوٹے روایتی اصولوں کے خلاف اپنے خالہ اور خالو کے طرز عمل کو سراہتی ہے۔

یہ آپ کی زمانہ شناسی اور دور اندیشی اور اس بے بس و بے زبان فرقے کے حال پر کمال مہربانی ہے کہ اپنا ہر طرح کا اطمینان اور سوچ وبچار اور پسند کر لینے پر بھی ان کم عمر، کم سمجھ بے چاریوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی تمام عمر کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے۔ میرے خالو جان آپ کی اس اعلیٰ ہم دردی اس سچی محبت کا جو اپنی لڑکیوں سے ہے بل کہ یوں کہوں کہ اس بے کس فرقے سے ہے تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔[۱۶]

اختر النساء بیگم کا عورت کے لیے بے بس اور بے زبان طبقے جیسے الفاظ کا استعمال اس امر کا غماز ہے کہ اختر عورت کی مظلومیت کو محسوس کرتی تھی۔

نذر سجاد معاشرے کی کج رویوں کی محض نشان دہی پر اکتفا کرنے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ ایک مصلح تھیں اپنی تحریروں کے ذریعے اصلاحی مشن لے کر چلیں تھیں جس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مسئلے کا حل بھی پیش کیا۔ اس مقصد کے لیے اپنی ناولوں میں تعلیم یافتہ گھرانوں کو تشکیل دیا۔ ناول "اختر النساء بیگم "میں مسز وقار کا گھرانہ ہے، جس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں۔ حصول تعلیم اور زندگی بسر کرنے کے طور طریقے دونوں کے لیے یکساں ہیں حقوق و فرائض میں دونوں مساوی درجے پر فائز ہیں۔ مسز وقار کے گھرانے کا ماحول پیش کر کے نذر سجاد حیدر معاشرے کے لیے تعلیم کی اہمیت واضح کرنا چاہتی ہیں کہ تعلیم انسان کی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ تعلیم ہی کے ثمرات تھے کہ مسز وقار اور ان کا گھرانہ لغو رسومات سے کوسوں دور تھا۔ ایک موقع پر بچپن کی منگنی کے خلاف مسز وقار اپنی خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

چونکہ ہم لوگ صفر سنی کی منگنی وشادی کے مخالف ہیں اس لیے کوئی رسم ان کی زندگی میں نہ کی گئی۔ خیال تھا جب دونوں تعلیم سے فارغ ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔[۱۷]

انیسویں صدی کے مسلم معاشرے میں کئی قباحتوں نے رسوم کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ مثلاً بچپن کی منگنی بچپن کی شادی اور نکاح وغیرہ۔ نذر سجاد نے عقد ثانی، پردے کی بے جا پابندی کے ساتھ اس موضوع کو بھی اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہوئے کہا زمانہ بدل گیا ہے لڑکیاں گائے بکریاں نہیں رہیں کہ جہاں چاہا باندھ دیا جائے۔ نذر سجاد شادی سے قبل منگنی کو اچھی چیز سمجھتی ہیں کہ اس رسم صورت میں لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ساتھ یہ تجویز بھی دی کہ نکاح سے بیشتر ان دونوں میں خط و کتابت بھی کرا دی جائے۔[۱۸]

اس ناول میں مسز وقار ایک ایسا کردار ہے جو حقوق نسواں کے لیے مسلسل محترک و سرگرم عمل ہے جو اپنی تقریر اپنے عمل کے ذریعے ہر اس رواج کی جو عورت کو انسانیت کے مقام سے گرا کر باندی و کنیز کے درجے تک لے جاتا ہے، کی پرزور مذمت کرتی ہیں۔

---اس واہیات نشان بے عزتی و کنیز کی ہمیں بالکل ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں ناک میں سوراخ کرانے کا بالکل دستور نہیں۔[19]

وہ ہر اس امر کو جو عورت کی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ چاہے وہ ہندوستانی سماج میں پنپنے والی رسومات قبیحہ ہی کیوں نہ ہوں، جنھیں ایک جاہل عورت فرض عین سمجھ کر ادا کرتی ہے چاہے وہ کوڑی کوڑی کی ہی محتاج کیوں نہ ہو چوٹ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

یہ رسومات بربادی بخش و تباہ کن ہیں اور انھی جھوٹی شیخوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا، کہ وہ بیوہ عورت جس کی آمدنی کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ اور لڑکی کی شادی کرتی ہے، تو یہی چاہتی ہے کہ تمام دنیا کی رسومات ختم کروں کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔[20]

مسز وقار بٹنا، کنگھا، صحنک ، تجگہ، سلامی، منڈھا، گود بھرائی اور ساچق وغیرہ جیسی تمام فضولیات سے چھٹکارے کا حل تعلیم نسواں کو گردانتی ہیں۔

---مگر یہ مصیبت آسانی سے حل ہو سکتی ہے۔ اس کا سہل علاج "تعلیم نسواں" ہے۔[21]

جہاں ایک طرف نذر سجاد تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیتی ہیں وہی وہ جانتی ہیں عورت کے بدلے ہوئے روپ کو سماج قبول نہیں کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے مصنفہ نے اختر کو سوتیلی ماں اور سسرال کے ہر دکھ اور وحشیانہ سلوک پر صبر و قناعت کا مجسمہ بنا کر پیش کیا۔ ساس سسر اور شوہر کے مرنے پر چچا سسر و ساس کی خدمت پر مامور کر دیا۔ یہاں تک کہ سلطانہ جیسی گنوار عورت کے قدموں میں گر کر گھر و چھت کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ بقول مصنفہ اس قدر مصیبت و ذلت کوئی جاہل و غریب گھر کی لڑکی بھی برداشت نہ کرتی "اور اختر تو تعلیم یافتہ تھی کسی اسکول ہی میں کام کر کے بافراغت زندگی بسر کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس قدر مصائب اپنے سر لیے ہوئے تھی۔ نذر سجاد زمانہ شناس عورت تھیں وہ جانتی تھیں، مردانہ سماج تو درکنار جہالت کی اسیر خواتین بھی اختر کے اس اقدام کو قبول نہیں کر پائیں گی۔

کہ دیکھو تعلیم کا اثر۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا؟ ہندوستانی رانڈیں ایک کونے میں پڑ کر ساس سسر کی جوتیوں میں عمر بسر کر دیتی ہیں۔ یہ علامہ نوکری کرنے نکلی۔[22]

بیوہ کی زندگی ہندوستانی معاشرت کا کرب ناک پہلو ہے۔ جس میں فضولیات کا حصار اس کے وجود کے گرد کھینچ کر زندگی کا دائرہ اس پر تنگ کر دیا جاتا تھا۔ پوری زندگی سوگ کی حالت میں ثواب کی نیت سے بٹھادی جاتی۔ اس کے ہنسنے، بولنے، کھانے، پہننے، اوڑھنے کو حقارت و نفرت سے دیکھا جاتا۔ جس کا تذکرہ اختر بڑے دکھ کے پیرائے میں کچھ اس طرح کرتی ہے۔

آپ تین سال انگلینڈ رہ کر ہندوستانی رسم ورواج کو بالکل بھول گئے لیکن مجھے تو اس آوارہ گردی میں بھی سب کچھ یاد ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ ہندوستانی بیوائیں کس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ [۲۳]

مرحومہ مسز رفیق کی تربیت کی بدولت اختر تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کو بخوبی سمجھتی تھی۔ کم عمری میں ہی جب جانی بیگم کی جہالت کے نتیجے میں سکول سے اٹھالی گئی تو اپنا سب سے بڑا نقصان علم سے دوری قرار دیتی ہے۔

مجھے بس سکول بھیج دیں اور تو میرے سب نقصان ہو رہے ہیں اور ہوں گے تعلیم سے تو نہ جاؤں۔ [۲۴]

یہی وجہ ہے کہ بیوگی کے بعد اختر پھر سے سلسلہ تعلیم بحال کرتی ہے لیکن پردہ آڑے آجاتا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں پردہ ترک کرتے ہوئے ان مسائل اور مجبوریوں کو بیان کرتی ہے جو انیسویں صدی کے روایت پرست مسلم معاشرے میں تعلیم نسواں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔

ابا جان صرف اس غرض سے میں نے اپنا نام بدلا تھا کہ اختر النساء مشہور ہونے سے سب پہچان گے کہ میں ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی ہوں اور مجھے یہ بات اس لیے پسند نہ تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا آزادانہ طریق سے تعلیم پانا ہماری قوم کی نظروں میں کھٹکے گا اور معیوب سمجھ کر عوام کی نظریں مجھ پر پڑیں گی اور میں تماشا بن جاؤں گی۔ لوگ ہزاروں باتیں بنائیں گے اور تو علیحدٰہ رہے قومی اخبارات ہی لعن طعن کر کے کچھ کا کچھ لکھیں گے۔ اس خیال سے بجائے اختر کے ستارا نام ظاہر کیا کہ پارسی لڑکی سمجھ کر کسی کو حرف گیری کا موقع نہ ملے گا۔ [۲۵]

سماج کے انھی ڈھکوسلوں نے اختر کو نام اور قومیت چھپانے پر مجبور کیا جس پر اختر آبدیدہ ہے۔

۔۔۔مجھے سخت رنج ہے کہ اپنا قومی لباس ونام کیا قومیت کی چھوڑ کر علم حاصل کرنے کو دوسری وضع اختیار کی، مگر کیا کرتی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ [۲۶]

عورت کے حوالے سے مسلم سماج کی جہالت کا سلسلہ یہی پر نہیں تھمتا بل کہ تعلیم حاصل کر کے جب اختر اپنے بل بوتے پر کام کرنے لگتی ہے۔ تو مخالفین تعلیم نسواں کی طرف سے اٹھنے والے ممکنہ اعتراضات کے پیش نظر اپنے والد کو ایک خط کے ذریعے آگاہ کر کے اپنی مجبوریوں سے بھی مطلع کر دیتی ہے۔

ابا جان زمانہ بہت برا ہے اور خصوصاً ان اطراف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفین تعلیم نسواں میری بابت آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہیں گے اور بیگم صاحبہ تو غضب ہی ڈھائیں گی جس کا مجھے از حد خیال ہے مگر میں مجبور ہوں کہ سوائے قومی خدمت کے میری بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ [۲۷]

اختر کی حسیّت نوکری کرنے اور تنہا زندگی بسر کرنے پر مردانہ سماج کے رد عمل کا ادراک رکھتی ہے۔ لیکن وہ باحوصلہ اور مضبوط قوت ارادی کی مالک لڑکی ہے جو محض اس وجہ سے اپنی زندگی خراب نہیں کرتی بل کہ حالات

سے مسلسل نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہے اور اپنی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر کے لڑکیوں کے لیے مثال قائم کرتی ہے۔

ناول کے اختتام پر وہ طبقہ اناث کو تعلیم کی ترغیب دیتے ہوئے کہتی ہے۔

> اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ہو سکے۔ تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی۔[۲۸]

نذر سجاد عورت ہونے کے ناطے اپنے طبقے کی زبوں حالی کا بخوبی احساس رکھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں عورتوں کی اصلاح ہو تا کہ وہ اپنی زندگی مرضی سے جی سکیں اور اس لیے وہ تعلیم کا حصول از حد ضروری خیال کرتی ہیں۔

حرماں نصیب(تانیثی مطالعہ):

حرماں نصیب فیروزہ اور ظفر کی ناکام داستان عشق اور ایک بہن کی بھائی کے لیے محبت کی داستان ہے۔ جاپان کی رہنے والی فیروزہ اپنے دادا اور اپنے بھائی فیروز کے ساتھ گرمائی تعطیلات گزارنے کے لیے مسوری آتی ہے۔ یہیں اس کی ملاقات ظفر سے ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔ ظفر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت جاتا ہے۔ اور فیروز کی اچانک موت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو بے حد چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتی اور زندگی سے بے زار ہو جاتی ہے اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر تنہا زندگی گزارنے لگتی ہے۔

ظفر ولایت سے واپس آکر اسے سمجھاتا ہے لیکن وہ شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتی اور بھائی کی روح کی تسکین کے لیے ڈاکٹری پڑھ کر غریب لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ مایوس و نامراد ظفر والدین کے اصرار پر شادی کر لیتا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں وہ مسوری میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ یہاں ظفر کی ملاقات پھر فیروزہ سے ہوتی ہے اور ظفر کو پتا چلتا ہے کہ فیروزہ ابھی تک اس کی محبت دل میں سجائے کنواری ہی ہے۔ یہ جان کر ظفر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے اپنے بیوی بچے ہیں۔ پھر بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فیروزہ کے پس پہنچ جاتا ہے لیکن چونکہ فیروزہ پڑھی لکھی حساس دل کی مالک عورت ہے اسی لیے وہ دوسری عورت یعنی ظفر کی بیوی کا حق چھننا نہیں چاہتی وہ ظفر سے کہتی ہے۔

> ظفر اب جو باتیں بے سود اور رنج زدہ ہیں ان کے کرنے سے کیا فائدہ اور اگر تم انھیں چھیڑو تو اپنی بیوی کے مجرم ہو۔ میرا مالک سوائے تمھارے کوئی نہ ہو گا۔ مگر تمھاری تمام محبت کی ایک اور دعویدار ہے، تمھارا فرض ہے کہ تم اس سے محبت کرو اس کو خوش رکھو مجھ سے ملنا یا مجھ سے محبت کرنا اخلاقی گناہ اور خدا کا گناہ ہے۔[۲۹]

فیروزہ عورت ہونے کے ناطے ایک عورت کے لیے شوہر کی محبت اور وفا کی اہمیت جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے دل میں ظفر کی انتہائی محبت محسوس کرنے کے باوجود ظفر کے بڑھے ہوئے ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیتی ہے۔

نذر سجاد کا یہ ناول عورت کی اس ازلی محبت کی بھی کہانی ہے۔ جو وہ بہن کے روپ میں بھائی کے لیے اپنے دل میں رکھتی ہے۔ فیروزہ ایک ایسی ہی عورت ہے جو بھائی کی وفات پر دل برداشتہ ہو کر تنہا ایک انجان جگہ پناہ لیتی ہے۔ اور دنیا سے لاتعلقی اختیار کر لیتی ہے۔

> مجھ کو بھلا شہروں سے کیا تعلیق۔ میرا فیروزہ خدا جانے کس ویرانے میں تنہا پڑا ہے۔ وہ اجاڑ بیابانوں میں ہو اور میں عالی شان مکانوں میں یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ [۳۰]

فیروزہ کا یہ شدت غم اسے ظفر کی محبت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

> مسٹر ظفر میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کا مجھ سے ایسا کیا تعلق ہے؟ آپ کا مجھ پر کسی طرح کا حق نہیں صرف دوستی محبت تھی وہ تمام ہو چکی۔ [۳۱]

اگرچہ فیروزہ کا یہ رویہ بعید از حقیقت معلوم ہوتا ہے ، لیکن نذر سجاد نے بہن کی بھائی کے لیے محبت کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ نذر نے بہن کی آئیدیل محبت کو پیش کیا ہے۔ جو اپنی زندگی اور زندگی کی ہر خوشی بھائی کی محبت پر قربان دیتی ہے اور ڈاکٹری پڑھ کر مرحوم بھائی کے ایصال ثواب کے لیے غریبوں کا مفت علاج معالجہ کرتی ہے۔

> یہ پڑھنا پڑھانا صرف اسی خوشی میں کر لیا کہ اس کے نام پر اس کو ثواب پہنچانے کو بے کسوں کی خدمت کروں گی۔ [۳۲]

بنیادی طور پر یہ کہانی فیروزہ کی محبت کا فسانہ غم ہے۔ ایک عورت کی بے لوث محبت کا خوب صورت مرقع ہے۔ بیک وقت دو رشتوں کی محبت کی اسیر فیروزہ کے کرب انگیز لمحوں کی داستان ہے۔ جہاں ایک رشتہ کی جدائی دوسرے سے جدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔

> نہ تھا، مگر جب وہ برداشت کر رہی تھی تو یہ بھی کیا۔۔۔ [۳۳]

یہ ایک عورت کی انتہا محبت کا وہ رخ ہے۔ جسے سمجھنے میں مردانہ سماج نے ہمیشہ دھوکا کھایا۔ ظفر اسی سماج کا نمائندہ کردار ہے، جو بدگمانیوں میں مبتلا ہو کر نیا رشتہ بنانے پر آمادہ تو ہو گیا، لیکن دوہری کیفیات کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اپنے تئیں بیوی کے حقوق و فرائض کا دعوٰی کرنے والا فیروزہ کو بھی دل میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ مسوری میں ایک بار پھر سے فیروزہ سے ملاقات پر پرانی محبت کے تذکرے اور فیروزہ سے ملاقاتوں کی صورت میں نذر نے مردانہ

معاشرے کی اس ذہنیت کی عکاسی کی ہے۔ جہاں شادی شدہ مرد کے لیے سب جائز اور روا ہے، مگر یہی سماج عورت پر کوئی بھی لیبل چسپاں کر دینے میں ذرا بھر بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ فیروزہ پر بھی بلا جھجک و بلا تحقیق بے وفائی اور سنگ دلی کے مہر ثبت کر دی گئی۔

مگر آپ کی بے وفا محبوبہ آپ سے بھی زیادہ سنگ دل تھی۔ [۳۴]

عورت جیسی رفیق القلب مخلوق کے لیے ایسے القاب بذات خود مرد کی سنگ دلی کا مظہر ہیں۔ بیگم ظفر جو اپنی سمجھ داری، مزاج شناسی اور محبتوں کی بدولت میاں کی آنکھ کا تارا بن گئی تھیں۔ بالا آخر اسی کی بد دیانتی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

ظفر بیگم سے ضبط نہ سکا۔ مسہری پر پڑ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ ان کا پیارا شوہر آج فیروزہ سے رخصت ہونے گیا ہے۔ [۳۵]

انگلستان سے ڈاکٹری کر کے لوٹنے پر ایسی ہی سنگ دلی کا سامنا فیروزہ کو بھی ہے۔

۔۔۔ آخر کیا کرو۔۔۔ اپنا سا دل سمجھتے ہو نا میرے جاتے ہی شادی رچالی۔۔۔ [۳۶]

مصنف نے فیروزہ کے کردار میں خالصتاً ایک مشرقی لڑکی کو پیش کیا ہے جو وفا کا مجسمہ اور محبت کا پیکر ہے اور عہد محبت کا پیکر ہے، اور عہد محبت کو بڑے استقلال سے نبھائے جا رہی ہے۔ یہاں نذر سجاد نے اس کے ان نسائی جذبات کو زباں دی ہے جو مشرقی عورت کا خاصہ ہیں۔

بڑے ظالم اور سنگ دل ہو۔۔۔ [۳۷]

مشرقی عورت کا جذبہ ایثار ہمیشہ تنہائیوں و محرمیوں پر ہی منتج ہوتا آیا ہے۔ فیروزہ کو بھی محبتوں میں ایثار کے جذبات نے بالا آخر زندگی کے لق و دق صحرا میں تنہا رہ جانے کر مجبور کر دیا جسے وہ نصب کا کھیل قرار دیتے ہوئے مردانہ وار حالات کے سامنے سینہ سپر ہے۔

دنیا کبھی انسان کی مرضی کے موافق نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ پڑے اسے صبر و شکر سے مرادانہ وار برداشت کرو۔ [۳۸]

فیروزہ نذر کی ایک تعلیم یافتہ، باحوصلہ اور خود اعتماد ہیروئن ہے جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔ ڈاکٹر بننے کے لیے انگلستان جاتی ہے۔ جاپان کی سیریں کرتی ہے۔ بھائی کی جدائی میں رنجیدہ دل ہو کر ویرانے میں جا ٹھکانہ کرتی ہے۔ کم عمری میں اس طرح تنہا و بے یار و مددگار رہنا اس کی خود اعتمادی و بہادری پر دلالت کرتا ہے، لیکن ناول

میں اس کی یہ خود اعتمادی جذباتیت کا شکار نظر آتی ہے۔ پورا ناول ہی جذبات کا بہتا ہوا، دھارا معلوم ہوتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے احساسات کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ ناول کے آخر میں ظفر و فیروزہ جب ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ایک طلاطم خیز جذباتی منظر ہے۔

> ظفر کچھ نہ بولا۔ فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سینے وفور رنج و غم سے پھٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کئے رہے۔ مگر رکشہ کا بڑھنا تھا کہ خون دل ظفر کی آنکھوں میں امڈ آیا۔ ادھر فیروزہ گھر جا کر صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔[۳۹]

عورت کے جذبات کی ایسی عمدہ عکاسی نذر کی نسائی حسیّت کا بین ثبوت ہے۔

جاں باز (تانیثی مطالعہ):

جاں باز بھی اس سلسلہ میں لکھا گیا ناول ہے جو قمر اور زبیدہ کی کہانی کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کا موضوع وطن پرستی ہے، زبیدہ ایک وطن پرست لڑکی ہے جس کی منگنی قمر سے ہو چکی ہے۔ قمر مغربیت کا پرستار نوجوان ہے۔ جب زبیدہ خود کو قمر کی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال پاتی تو قمر اپنی ہم خیال لڑکی نجمہ سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن نجمہ کی حد سے بڑھی ہوئی آزاد خیالی کے باعث دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ زبیدہ جو قمر کی بے وفائی کے بعد خود کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ قمر کی حالت دیکھ کر اس کے قریب آجاتی ہے اور اس طرح دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

ناول کی کہانی حب الوطنی اور ہندوستانی سودیشی تحریک سے متعلق ہے زبیدہ ناول کا مرکزی کردار ہے جو قمر نامی شخص کی منسوبہ ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ، باشعور، خود اعتماد، اور سچی قوم پرست (لڑکی) کا کردار ہے جو تحریک عدم تعاون میں عملی حصہ لیتی ہے اور جس کا دل وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ مصنفہ نے زبیدہ کو مسلمان (لڑکی) کے لیے آئیڈیل بنا کر پیش کیا ہے لیکن مغربیت کا دل دادا قمر، زبیدہ جیسی سرخی و غازے سے محروم دیس سُدھارک لڑکی میں دل چسپی برقرار نہیں رکھ پاتا۔ اسے قابل رحم حالت میں چھوڑ کر اپنی ہم خیال اور فیشن پرست نجمہ نامی لڑکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شادی کر لیتا ہے۔ نجمہ سے ملاقات کے بعد زبیدہ کی جان نثاری و وفاداری اب اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہاں مصنفہ نے مرد کی تلون مزاج فطرت پر چوٹ کرتے ہوئے اسے محبت سے عاری مخلوق قرار دیا۔ جو انسانیت کی بجائے مجسموں کا متلاشی رہتا ہے۔

> مردوں کو حقیقی محبت تو شاذ ہی ہوا کرتی ہے۔ یہ ظاہراً چمک دمک حسن کے شیدائی ہیں۔[۴۰]

جس کا صلہ ہمیشہ اسے نجمہ جیسی عورت کے روپ میں ملتا ہے جو ایک آزاد خیال اور بے باک لڑکی ہے جسے گھریلو زندگی سے کوئی دل چسپی نہیں ناچ، گانا، اور بال روم جانا جس کا مشغلہ ہے۔ نجمہ کی صورت میں نذر سجاد نے مغربی تہذیب کے دل دادہ طبقے کو سامنے لایا ہے۔ بلاشبہ نذر مسلمان عورت کو آزاد اور نڈر دیکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن مسلمان عورت کی ایسی بے راوی کے خلاف تھیں جس سے عورت کی نسوانیت و قار پر آنچ آئے۔ نجمہ کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی پر ملامت کرتے ہوئے قمر کی زبانی کہتی ہیں کہ "لعنت ہے مسلمانوں کی لڑکی ہو کر یہ ہوس یہ جرات۔"[۴۱]

نذر فیشن وجدت کو پسند کرتی تھیں اپنے لڑکپن سے وہ فیشن لیڈر کے طور پر سامنے آئیں اپنی پھوپھی اکبری بیگم کے ساتھ مل کر کپڑوں کی ڈیزائنگ کرتیں جو فیشن ایبل طبقے میں بہت پسند کیے جاتے۔ اپنی جدت پسند طبیعت کے باوجود ہمیشہ اس امر کے خلاف رہیں جو مسلمانی طریقوں کو مسخ دیں۔ وہ مغربیت کے اٹھتے ہوئے طوفان کی مخالفت نور محمد سے یوں کرواتی ہیں۔

---اس قسم کی یورپین تعلیم یافتہ کرسچن نما مسلمان لڑکیاں تو اس وقت بے تعداد موجود ہیں مگر جس جوہر کا میں متلاشی ہوں وہ کمیاب ہے۔ جس سے مسلمان کی دنیا بہشت ہو جائے۔۔۔[۴۲]

نذر اپنی صدی کی جدید خیالات کی مالک عورت تھیں لیکن بے جا آزادی کی بالکل قائل نہ تھیں۔ بقول ڈاکٹر شگفتہ حسین:

---ان کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کر لیا جائے، مشرقی شرافت اور وقار کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو۔۔۔[۴۳]

وہ بیسویں صدی کی ترقی پسند لکھاری اور عورتوں کے حقوق کی بہت بڑی علم بردار تھیں۔ انھوں نے ہر موقع پر عورت کے شرعی حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ شادی جیسے اہم فیصلہ کے تعین میں عورت کی پسند و ناپسند کی اس حد تک قائل ہیں کہ ان کے ناولوں کے کردار اپنی بہن کا عقد اس شخص سے کرا دیتے ہیں جسے بہن پسند کرتی ہے۔ "جاں باز" کا نور محمد بھی اپنی منھ بولی بہن زبیدہ کی رضا کو مد نظر رکھتے ہوئے قمر سے رشتہ طے کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

---یہاں اس لیے ٹھہرا ہوا ہوں کہ آپ کے برافروختہ خاندان کو قمر الزماں کی طرف راغب کر کے اس کی درخواست منظور کرا دوں۔[۴۴]

لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بغیر عقد مرد و عورت کی بے جا بے تکلفی کو نامناسب سمجھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں کہ "جس وقت تک آپ کے رشتے کا فیصلہ نہ ہو لے زیادہ بے تکلفی مناسب نہیں۔"[۴۵]

نذر بے جا بے تکلفی اور آزادی کو عورت کی عصمت کے منافی قرار دیتی ہیں۔ اس لیے نجمہ کی نور محمد سے بڑھتی ہوئی بے حجابیوں و بے تکلیفوں پر نور محمد کی زبانی یوں گویا ہوئیں:

> ابھی تم ایک دوسرے کی منکوحہ ہو جس وقت تک قطع تعلق نہ ہو جائے زیادہ بے تکلفی جائز نہیں۔۔[۴۶]

نذر کا یہ ناول مغرب پرستی کے خراب نتائج پر مبنی ہے۔ اس لیے بہ حیثیت مجموعی عورتوں کے متعلق مصنفہ کے احساسات کا اظہار زیادہ نہیں۔ البتہ زبیدہ کا کردار نذر کے پسندیدہ کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

نجمہ (تانیثی مطالعہ):

ناول نجمہ ایک ایسی لڑکی کی سرگزشت ہے جو مغربی رنگ میں رنگ کر اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں برباد کر ڈالتی ہے۔ نجمہ سے جمیل کی ملاقات مسوری میں ہوتی ہے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں لیکن جمیل کے گھرانے کی روایت پرستی اسے کھٹکتی ہے وہ جمیل سے کنارہ کش ہو کر کامران نامی شخص سے منسوب ہو جاتی ہے۔ جو ایک انتہائی روشن خیال اور عیاش پرست کردار ہے۔ جلد ہی اس کا دل نجمہ سے اکتا جاتا ہے اور دونوں کی نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ اب نجمہ کو جمیل کی قدر معلوم ہوتی ہے مگر جمیل والدین کے اصرار پر شکیلہ سے شادی کر چکا ہوتا ہے۔ اس

صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے کسم پرسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

نذر کا یہ ناول بھی ان کے دوسرے ناولوں کی طرح رومانوی انداز میں اصلاح معاشرہ کا پرچارک ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی پرانی اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور دوسرا روشن خیالی کی رو میں بہہ کر اپنی بھرپور تہذیبی اقدار سے بھی متنفر ہو گیا تھا۔ نتیجتاً دونوں ہی روبہ زوال تھے۔ نذر مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات کا انتخاب اور امتزاج چاہتی ہیں۔ اسے شکیلہ کی گفتگو مصنفہ کے انھی خیالات کی ترجمان ہے۔

> میری یہ رائے نہیں کہ لڑکیوں کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ مگر اس امر کا خیال رکھنا لازمی ہے لڑکے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے۔[۴۷]

ایک اور اقتباس جس میں مخلوط ماحول دکھایا گیا ہے۔

> سب ڈرائنگ روم میں آئے۔ اتفاق سے بیگم صدیقی کے ایک طرف انجینئر صاحب کی کرسی اور دوسری طرف نوشابہ کی۔ قاعدے کے فرائض بیگم صدیقی کو باری باری دونوں سے باتیں کرنا پڑیں مگر انجنیئر صاحب بہت خاموش تھے۔ کیپٹن صاحب اپنی عادت کے مطابق ہر ایک سے چھیڑ پھاڑ کر

رہے تھے۔ پورے دو گھنٹے میز پر صرف کیے گئے اور جب خدا خدا کر کے کہیں کھانا ہوا۔ سب ڈرائنگ روم میں آئے تو کافی کا دور چلا آپس میں ایک دوسرے سے گانے کی فرمائشیں کی گئیں۔۔۔[۴۸]

یہ مشرق و مغرب کے تہذیبی امتزاج کی خوب صورت مصوری ہے۔ جہاں عورت شمع محفل بھی نہیں اور مقید خانہ بھی نہیں۔ اگرچہ نذر کو مردوں کی برابری کا دعوی نہ تھا۔ لیکن مساویانہ حقوق کی وہ سب سے بڑی علم بردار تھیں۔

نذر نے مساویانہ حقوق کی جنگ تو تا عمر لڑی لیکن مسلمان خواتین کی بے جا آزادی کی ہمیشہ مخالف رہیں۔ نجمہ کے کردار کا بھیانک انجام مصنفہ کی اسی سوچ کا ترجمان ہے کہ آزادی بے راہ روی کا نام نہیں۔ نجمہ بے جا آزادی کا شکار ہو کر کامران جیسے غلط نوجوان سے منسوب ہو جاتی ہے جب کہ نجمہ کی کیفیت یہ ہے کہ

بس جناب میں بھر پائی، اب دولہا نہیں چاہیے کافی بدنام ہوئی ایک قدیم شریف گھرانے کی لڑکی ناچ گھروں میں گئی، غیر شخص کے ساتھ آزادانہ گھومتی پھری۔ مگر خدا جانتا ہے میں نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کا مالک سمجھ کر ایسا کیا۔[۴۹]

اس ناول کا ایک اور کردار نجمہ کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

اگر لڑکیوں کو آزادی دے دی جائے تو اس کے یہی نتیجے رہیں گے۔ نجمہ نے اپنی زندگی حد سے زیادہ آزادی کی ہوس میں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی۔[۵۰]

نذر کا یہ تبصرہ عورت کی بے جا آزادی پر قدغن لگاتا ہے قراۃ العین اپنی والدہ کے حوالے سے ایک واقع کا ذکر کرتی ہوئے لکھتی ہیں کہ موسم گرما میں مسوری کے سوائے، ہوٹل میں چند مسلمان خواتین ہال روم میں رقصاں نظر آئیں تو نذر سجاد نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

عوام ایسے ہی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم اور بے پردگی کے خلاف ہیں بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کو کالجوں اور اسکولوں سے اٹھا چکے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو ہال روم میں ناچتے دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ آخر تفریح کے اور بھی ہزار طریقے ہیں سیر و شکار، ٹینس، اسکٹینگ، گالف۔[۵۱]

نذر عورت کی بے باکی و فیشن پرستی کو پسند نہ کرتیں تھیں۔ تاہم معاشرتی قدروں اور آزادی کی حدود کے احساس کے ساتھ وہ عورت کے لیے اظہار رائے کی آزادی کی داعی تھی۔ لیکن روایت پرست سماج عورت تو درکنار مرد کو بھی یہ حق دینے کو تیار نہ تھا۔ شرم نے روایت کا حصہ بن کر زبانوں کو مقفل کر دیا تھا۔ بالخصوص شادی کے فیصلے میں فریقین کی رضا کو گناہ اور بے شرمی سے تعبیر کیا جاتا۔ نتیجتاً زندگیاں تلخ و بے مزہ ہو کر رہ جاتیں۔

شکیلہ بھی سماج کی اس ستم ظریفی کا شکار ہوئی۔۔۔۔اور بڑی وجہ میری خاموشی کی یہ تھی کہ جب ایک خود مختار لڑکا دل پر جبر کر کے بزرگوں کی خوشی کے خیال سے خاموش ہو گیا ہے۔ تو میری کیا ہستی ہے۔ غرض کہ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اور ہم دونوں کی زندگی بدمزہ اور دوبھر ہو گئی۔ [۵۲]

یہی معاشرتی جبر مرد کو منافقت اور عورت کو سسک سسک کر جینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جمیل کی شخصیت کا دوغلا پن نام نہاد مشرقی شرافت ہی کی دین ہے جس کے اظہار میں شادی تو شکیلہ سے رچالیتا ہے لیکن اپنی محبتوں کا حق دار نجمہ ہی کو بنائے رکھتا ہے۔ یہی رویہ شکیلہ بیگم جیسی صابر شاکر اور رحم دل عورت کو بھی اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

نواب انجینئر صاحب کی حسین و جمیل، آزاد خیال لڑکی کا شہر سن کر شکیلہ بیگم جمیل اس موقعہ پر بھی خوف زدہ ہو گئی تھیں کیوں کہ وہ اپنے منچلے شوہر کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ کبھی نجمہ کے تھے۔ پھر بیوی کو چاہنے لگے اور اب سمجھ داری کو عمر میں آکر ایک ذلیل ٹائی پسٹ عورت کے پروانہ ہو رہے ہیں اور یہ نواب زادی تو سب سے بہتر ہے۔ یورپ کی تعلیم و تربیت پھر ان دونوں سے کہیں زیادہ حسین و کم سن خدا ہی خیر رکھے۔ [۵۳]

شکیلہ شوہر کے اس رویے پر شاکی ہے جو اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں۔ ذیل اقتباس عورت کے اسی کرب کی عکاسی ہے۔

بہت ہی محبت بھری ساعتوں میں جب کہ وہ مجھ پر بھی نثار ہوا کرتے تھے۔ کسی خیال کے آتے ہی گم ہو کر آہ کر لیتے تھے۔ ان کی اس کیفیت کا ان کی بیوی کے دل پر کیا اثر ہوتا ہو گا؟ ذرا اور بیویاں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں۔ [۵۴]

شکیلہ و جمیل کی ناخوش گوار ازواجی زندگی کا نقشہ بیان کر کے مصنفہ شادی کا بندھن میں بندھنے کے لیے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہوئے اپنے ایک کردار کی زبانی کہلواتی ہیں۔

اگر شادی سے قبل لڑکا یا لڑکی کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور شادی دوسری جگہ ہو جائے تو دونوں کی زندگی عذاب ہوتی ہے۔ شریف اور نیک میاں بیوی تو رو دھو کر بسر کر لیتے ہیں اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے خلاف بزرگوں کا حکم سنتیں اور اپنے چاہنے والوں کی جدائی برداشت نہیں ہو

برباد ہوتی ہے۔ شادی ہمیشہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی سے ہونی چاہیے۔ [۵۵]

لیکن ساتھ ہی انھیں احساس ہے یہ کہنا آسان ہے لیکن ریت و رواج کے اسیر معاشرے میں اس پر عمل یقیناً مشکل ہے، کیوں کہ سماج کے بندھن اس کو پسند نہیں کرتے۔

بھائی ہندوستانی شادیاں اس طرح ہوتی ہیں پہلے شادی پھر محبت اور یہ کامیاب شادیاں ہیں اور جو لوگ پہلے محبت پھر شادی کرتے ہیں وہ ناکامیاب رہتے ہیں۔[۵۶]

اس سے اندازہ ہوتا ہے نذر سماج کے بندھنوں کی سختی سے سخت نالاں ہیں۔ نذر کے عہد کو معلومات کی صدی کہا گیا، جس نے ذہنوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی وہ تہذیبی اقدار کو گھن بھی لگا دیا۔ بے راہ روی کی راہیں ہم وار ہونے لگیں۔ مغربی تعلیم کو محض فیشن پرستی سمجھ لیا گیا۔ نتیجتاً خواتین میں بھی ایک ایسا طبقہ سامنے آنے لگا جس میں نہ ہندوستانیت تھی نہ نسوانیت۔ نذر یورپین ملمع کاری سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ مگر یورپ کی ملمع کاری مجھ کو تو ناپسند ہے۔ نسوانیت اور ہندوستانیت کا تو پتہ نہیں۔ وہ لڑکی تو ایک تعلیم یافتہ وشائستہ نو عمر لڑکا معلوم ہوتی ہے۔ مصنفہ مسلم معاشرے کے لیے ایسی آئیڈیل لڑکی کا تصور دیتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہو، خود اعتماد ہو لیکن بے راہ روی کا شکار نہ ہو۔ غرض وہ ایک مسلم لڑکی کو مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات سے مزین دیکھنا چاہتی ہیں۔

ثریا (تانیثی مطالعہ):

ناول ثریـــــا کا موضوع بغیر مرضی کی شادی کے خراب نتائج ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار ثریا کا ہے جو ایک حسین لڑکی ہے جس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی ہے۔ نواب کیواں قدر اس کے چاہنے والوں میں سے ایک ہیں۔ جن سے اس کی ملاقات اپنی سہیلی موہنی کے بھائی سندر لال کی پارٹی میں ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن کیواں قدر کے گھر والے اس شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتے۔ کیوں کہ وہ کیواں قدر کی نسبت بچپن سے ہی سلطنت آراء سے طے کر چکے تھے۔ کیواں قدر گھر والوں کی مرضی کے خلاف موہنی اور سندر لال کی مدد سے خاموشی کے ساتھ ثریا سے شادی کر لیتے ہیں۔ کیواں کے والدین جب ان کی سلطنت آراء سے شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کیواں نے ثریا سے شادی رچالی ہے لیکن وہ اس رشتے کو قبول کرنے کی بجائے کیواں کو عاق کرنے کی دھمکی دیتے ہیں جس پر کیواں سلطنت آراء سے شادی کر لیتے ہیں۔ ثریا اس وقت کیواں کے بچے کی ماں بننے والی ہوتی ہے۔ دادی کے لیے یہ بات باعث ننگ و عار تھی کہ شادی ہوتے کسی نے نہ دیکھی اور نواسہ سب دیکھیں۔ صبح ہوتے ہی گھر چھوڑ بھتیجے کے پاس چلی گئیں۔ ثریا نے بھی اس بربادی قسمت پر لکھنؤ چھوڑ دیا اور انتہائی مصیبت زدہ زندگی گزارنے لگی۔ کیواں قدر شادی کے سال بعد سول سروس کے لیے انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ ہندوستان واپسی پر ایک روز ان کی ملاقات ثریا سے ہو جاتی ہے۔ اب کیواں معاشی طور پر فارغ البال ہے اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتا ہے۔ لہٰذا والدین کی

پسند سے لائی ہوئی بیوی کو والدین کے پاس چھوڑ کر آئندہ زندگی ثریا اور اپنے بیٹے آسمان قدر کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

نذر کے اس ناول کا موضوع بھی بغیر مرضی کے شادی اور اس سے جنم لینے والی تلخیاں ہیں۔ جن کا شکار ہر دو سطح پر عورت ہی ہے۔ چاہے وہ سماجی اقدار کی پاس داری میں سلطنت کے روپ میں بیوی بنے یا پسند کی صورت میں ثریا کی شکل میں سامنے آئے۔ دو سطحوں پر جذباتی و ذہنی کرب کا شکار عورت ہی ہے۔ یہ ناول عورت کی ازدواجی زندگی کے اس کرب کو بیان کرتا ہے جو وہ شوہر کے روپ میں مرد کے بے التفاتی کے رویے سے سہتی ہے۔ ناول میں ثریا ان تکلیف دہ لمحات سے اس وقت گزرتی جب کیواں قدر مجبوریوں کے سامنے بے بس ہو کر سلطنت آراء سے منسوب ہو کر ثریا کو ایک بچے کے ساتھ بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں اور سلطنت آراء کو اس اذیت کا اس وقت سامنا ہے جب وہ اپنی تمام محبت کیواں پر نچھاور کر کے تین بچوں کے ساتھ کیواں کی طرف جھٹلا دی جاتی ہیں۔ مرد کے اس دوغلے پن پر نذر کی نسائیت نوحہ کناں ہے۔ "یہی ہے مردوں کی انسانیت و محبت آفرین ہے۔"[۵۷]

نذر نے اس ناول میں ایک اہم معاشرتی المیے کو پیش کیا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں والدین کی اکثریت بچوں کی شادی کے معاملے میں اپنی پسند و ناپسند کو اہمیت دیتی ہے اور بچوں کی رائے کو اس معاملے میں بے شرمی سے تعبیر کرتی ہے۔ زبردستی کے منڈھ دیئے جانے والے فیصلوں کے نتیجے میں کئی زندگیاں تلخ ہو جاتی ہیں۔ بچے باشعور ہونے کے باوجود اپنی من چاہی زندگی نہیں گزارتے۔ کیواں قدر سلطنت آراء کو چھوڑنے کی وجہ اپنے والد کو لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> حضور جانتے ہیں کہ مجھ پر سلطنت آراء بیگم (بیوی) سے ذرا محبت و موانست نہیں۔ اس صورت میں ان سے کیسے نباہ کر سکتا ہوں جب کہ میری دل و جان کی مالک مجھے مل گئی ہے۔۔۔۔۔ آپ میری۔۔۔۔۔ اس بے ادبی کو معاف فرمائیں گے اور آئندہ اپنے پوتوں کی شادیوں کے وقت احتیاط سے کام لیں گے اور ان کی شادیاں ان کی مرضی کے موافق کریں گے۔[۵۸]

نذر کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری گردانتی ہیں۔ ناول میں ثریا جب کیواں سے خاموشی سے نکاح کرنے پر کہتی ہے کہ خدا ہمارا گناہ معاف نہیں کرے گا تو نذر کیواں قدر کی زبان سے یہ بات پیش کرتی ہیں:

> ہم نے خدا کا ذرا بھی گناہ نہیں کیا اگر کچھ ملزم ہیں تو سوسائٹی کے جاہلانہ رسم و رواج کے۔ ہمیں شرعاً و قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند و محبت سے اپنے عمر بھر کے رفیق کا انتخاب کریں۔ والدین یا کوئی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔[۵۹]

نذر کے دور میں متحدہ ہندوستانی معاشرت کئی پُر فریب رسم و رواج میں جکڑی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں کئی معصوم عورتوں کی زندگیاں جہنم بنن رہی تھی۔ نذر ایک اصلاحی پرچار کے طور پر اُبھری اور اپنے ناولوں کے ذریعے سماج سے ان فرسودہ ریت و رواج کو ختم کر کے ان کی اصلاح کرنی چاہی۔

شہید جفا(تانیثی مطالعہ):

ناول کا موضوع دوسری شادی اور اس سے پیدا ہونے والی ناگوار صورتِ حال ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کوشلیا، سرلا، مسٹر چندر اور مسٹر روشن لال ہیں۔ کوشلیا اور سرلا کی دوستی انگلینڈ میں بورڈنگ سے شروع ہوتی ہے۔ انگلینڈ سے واپسی پر جہاز میں ان کی ملاقات مسٹر چندر سے ہوتی ہے۔ کوشلیا، مسٹر چندر میں دل چسپی لینے لگتی ہے۔ مسٹر چندر بھی اسے پسند کرنے لگتے ہیں اور کوشلیا سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر والدہ اور دادی کے اس رشتہ کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ناراضگی میں جائیداد چھوڑ کر ایک سیٹھ کی دوکان کی مینجری اختیار کر لیتے ہیں لیکن کوشلیا ان سے بے وفائی کر کے اپنی دوست سرلا کے شوہر مسٹر روشن لال سے شادی رچا لیتی ہے۔ سرلا ان دنوں نینی تال میں ٹھہری ہوئی تھی۔ کوشلیا کی دھوکا دہی سے اپنے شوہر کے ساتھ شادی کی خبر پڑھتے ہی رنج و الم کی کیفیت میں زندگی کا گلا اپنے ہی ہاتھوں دباڈالتی ہے۔

نذر کا یہ ناول مرد کی دوسری شادی جیسے قبیح فعل پر جنم لینے والے عورت کے اس درد و کرب کا عکاس ہے جس کے نتیجے میں وہ زندگی ہار بیٹھتی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں کثرت ازدواج ے رواج کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی زد میں پڑھا لکھا، ان پڑھ، ادنیٰ، اعلیٰ ہر طبقے کا مرد تھا۔ جو کوئی بھی جوازیت پیش کر کے شادی کر لیتا تھا اور بعض دفعہ جواز دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ مسٹر روشن لال بھی شہید جفا کا ایک ایسا ہی کردار ہے جو اولاد نرینہ کے بہانے بیوی کی سہیلی کوشلیا کو رفیقِ حیات بنالیتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ سرلا کا بھری کائنات میں اس کے سوا کوئی بھی عزیز اور سرپرست باقی نہیں رہا۔ نذر عورت ہونے کے ناطے عورت کی اس تڑپ کو اچھے سے محسوس کرتی ہیں جو مرد اسے دوسری شادی کی صورت میں دان کرتا ہے۔ اس لیے وہ ایسے مردوں کو ظالم اور ایسی رسموں کو وحشیانہ قرار دینے میں ذرا بھی نہیں چونکتی۔ "ظالم مرد اور ہندوستانی رسمیں تعلیم پا کر بھی یہ لوگ ایسے وحشیانہ فعل کرنے سے نہیں رکتے۔"[۶۰]

وہ جانتی ہیں کہ مردوں کا یہ فعل اس سماج کے لیے قابل نفریں نہیں بل کہ اولاد نرینہ کی آڑ میں کی گئی شادیاں مردانہ سماج میں ضرورت اور وقت کا تقاضا کہلاتی ہیں۔ اس لیے وہ سرلا کی بہ زبانی کہتی ہیں۔ "۔۔۔لوگ اُن کی اس شادی کو ضرورت وقت کے مطابق بجا کہیں گے کہ ۵ سال سے اولاد نہیں ہوئی دوسری کرنی لازمی تھی۔"[۶۱]

نذر سجاد کی نسوانی سوچ ناول میں جابجا اس روایت کا تدارک کرتی نظر آتی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ قصہ کے کرداروں کے خارجی افعال پر زور دیتی ہیں۔

آہ مظلوماں (تانیثی مطالعہ):

آہ مظلوماں بنیادی طور پر دوسری شادی کے خطرناک نتائج پر مبنی ہے۔ ناول میں دو کہانیاں چلتی ہیں۔ ایک اعلی طبقے کی اور دوسری متوسط طبقے کی۔ یہ قصہ ڈپٹی صاحب کا ہے۔ ان کی شادی ایک معزز گھرانے میں ہوتی ہے۔ بیوی کا نام سلطنت آرا ہے جو ایک پڑھی لکھی باشعور عورت ہے۔ ڈپٹی صاحب اور سلطنت آرا میں محبت موجود ہے۔ لیکن ایک عورت زرین نامی ان درمیان آجاتی ہے۔ میاں صاحب اس کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ بیگم کو حیلے بہانوں سے میکہ روانہ کر کے خود اس سے شادی کر لیتے ہیں۔ سلطنت آرا کو شادی کی خبر ملتی ہے تو وہ بے چاری پھر بھی شوہر کی طرف آجاتی ہے۔ زرین کے طرح طرح کے الزمات کو برداشت کرتی ہے۔ زریں ڈپٹی صاحب کے دل سے سلطنت آرا کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد ڈپٹی صاحب بیمار پڑ جاتے ہیں۔ زریں ڈپٹی صاحب کی صحت سے مایوس ہو کر ملازمہ کے ساتھ مل کر زیور لے کر فرار ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اسے حدشہ ہے کہ اسے اپنے زیور ڈپٹی صاحب کے علاج کے لئے فروخت کرنے پڑ جائیں گے۔ سلطنت آرا کو جب ان تمام معاملات کی خبر ہوتی ہے تو وہ تمام خطائیں بھول کر یہ کہتے ہوئے کہ آپ نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔ مردوں کا کام ہی یہ ہے۔ ڈپٹی صاحب کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ سلطنت اس سماج کی پیداوار تھی۔ جس میں مرد کی ہر خطا اور منافقانہ رویے کو مرد کا شیوہ کہہ کر معاف کرنے کا سبق عورت کو کم سنی ہی سے پڑھایا جاتا تھا اور اسے عورت کے شریفانہ طور و اطوار سے منسوب کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سلطنت تعلیم و شعور سے بہرہ مند ہونے کے باوجود ڈپٹی صاحب کے سنگ درانہ فعل پر یہ کہ کر خاموش اختیار کر لیتی ہے۔

> ۔۔۔میں بھی یہ سب باتیں جانتی ہوں اور تنہا ہی ان کو پورا مزہ دکھا سکتی ہوں۔ مگر مجھے یہ کسی طرح گوارا نہیں۔ کہ خلاف دستور شرفا ہندوستان میں کوئی جھگڑا کراوں جو مصیبت ہوں گی برداشت کروں گی۔ مگر منھ سے اف تک نہیں کروں گی۔"[۶۲]

ناول کا دوسرا حصہ متوسط گھرانے کا ہے۔ جہاں عظمت اس کی والدہ اور اس کی بیوی زبیدہ رہتے ہیں۔ زبیدہ سلیقہ مند اور خاموش طبع عورت ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو پدرسری سماج کی مشرقیت کی تعریف کا مکمل عکاس ہے۔

> ایسی کم سخن، خدمت گار، تابعدار کہ چراغ لے کر ڈھونڈیں تو دوسری نہ ملے۔[۶۳]

ناول میں سلطنت آرا اپنی جدید تعلیم اور زبیدہ اپنی جہالت کے ساتھ سماجی اقدار اور مشرقی روایات کی پاس دار نظر آتی ہیں۔ اگر سلطنت آرا کی یہ پاس داری تعلیم نسواں کو منفعیت کے لیبل سے بچانے کے لیے تھی، تو زبیدہ اس تہذیب کی دین تھی جس میں شوہر مجازی خدا اور ساس حقیقی خدا کا روپ تھی جن کی خوش نودی حاصل کرنے کی تاکید سنِ بلوغ سے ہی بچیوں کو دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے جب آبادی بیگم اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرا دیتی ہے۔ زبیدہ کو پرانے گھر بھیج دیتی ہے تو زبیدہ ہر طرح کا ظلم خاموشی سے سہہ گزرتی ہے کہ یہ شرفاء کی عورتوں کا دستور تھا۔ ظلم کے بدلے تابعداری اور وفاداری اس صدی کی عورت کی تہذیب بن چکی تھی۔ زبیدہ اسی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے جو بگڑے ہوئے حالات میں نہ صرف اس گھر میں واپس آتی ہے بل کہ شوہر اور ساس کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور سلائی کڑھائی کے کام سے گھر کا خرچ بھی چلاتی ہے۔

یہ ناول دراصل عورتوں پر کیے جائے والے مظالم اور دوسری شادی کے خطرناک نتائج کو سامنے لاتا ہے۔ جس کا شکار اعلی اور متوسط دونوں گھرانوں کی خواتین ہیں۔ جن کے لیے شوہر کی دوسری شادی کو بے بسی سے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

> سلطنت آرا۔ سبب کیا وہی جو مردوں کو شعار ہے۔ مجھے ایک منشی کے خط سے معلوم ہوا ہے۔ کہ کوئی خراب عورت پلے پڑ گئی ہے۔ تمکنت آرا (بے اختیار و ک) ہائے ہائے اب کیا کریں گی۔ سلطنت آرا ہوتا کیا اور میں کرتی کیا۔ جیسے اور صدہا بے کس، بے بس میری مظلوم نہیں، اپنے دن گزار رہی ہیں۔ میں بھی گزار لوں گی۔ [۶۴]

نذر کی نسائی حسیت عورت کی مظلومیت پر نوحہ کناں ہے۔ یہاں وہ آبادی بیگم اور ڈپٹی صاحب کی دوسری بیوی کی صورت میں عورتوں کے اس طبقے کے نشان دہی کرتی ہیں جو عورت ہو کر عورت کو پیستی ہیں اور خود اپنے طبقے کو برباد کرتی ہیں۔ اس قصے میں زبیدہ اور سلطنت ایک ہی طرح کے حالات سے دوچار ہیں۔ دونوں حالات کا مقابلہ بہادری سے کرتی ہیں لیکن چوں کہ سلطنت آرا تعلیم یافتہ عورت ہے اپنے حقوق کا ادراک رکھتی ہے وہ شوہر سے دبے الفاظ میں دوسری شادی کی وجہ بھی پوچھتی ہے۔

> کوئی ضرورت نظر نہ آئے آپ کے عقد ثانی کی کوئی شکایت نہیں سنی۔۔۔۔ میں یہ بھی نہ کہ سکوں گی۔ کہ اولاد کے لیے شادی ہے۔ کیوں کہ لڑکا موجود ہے۔ [۶۵]

زبیدہ اور سلطنت آرا کا کردار مظلوم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی ہے۔ دونوں اپنے شوہر کی شادی پر رونے دھونے کی بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ جب کہ انھیں اپنے شوہر کے اس فعل کا دُکھ بھی ہے۔ سلطنت آرا اعلی طبقے سے ہے۔ اور زبیدہ متوسط سے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری شادی جب

خطرناک مرض دونوں طبقات میں بدرجہ اتم موجود تھا۔اس ناول کا سب سے مضبوط کردار زبیدہ کا ہے۔ وہ اتنی حوصلہ مند ہے۔ کہ شوہر کی دوسری شادی کے بعد سوتن کی خدمت کرتی ہے۔ بچوں کو سنبھالتی ہے۔ لیکن اف تک نہیں کرتی۔ شادی کے دن ہی سوتن سے ملنے جاتی ہے سونے کے کنگن اس کو پہناتی ہے۔ زبیدہ کے حوصلے کی ایک جھلک درج ذیل ہے:

> آفریں ہے۔ زبیدہ کے حوصلے پر گھر سے نکالا خاوند چھینا، سوکن، پڑی ساس سسر جان کے دشمن اور پھر سوت کا منھ دیکھنے جانے کو تیار صرف اس خیال سے کہ شاید ساس رضامند ہو جائیں۔[۶۶]

دوسرے گھر میں بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ شوہر کو روٹی کپڑے کوئی فکر نہیں۔ ان حالات میں مایوسی کا شکار ہونے کی بجائے سلائی کر کے بچوں کے اخراجات پورے کرتی ہے اور جب شوہر کی حالت خراب ہوتی ہے تو واپس گھر آ کر گھر سنبھالتی ہے۔ سوت کے بچے کا دھیان رکھتی ہے۔ نذر عورت کو مجبور ہوتے ہوے بھی اس قدر مضبوط دیکھنا چاہتی ہیں کہ وہ خود بے سہارا ہو کر بھی کسی کا سہارا بنے جس کے لیے اس میں صبر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے مصنفہ کے ان الفاظ میں احتجاج کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

> یہ شریف بیبیوں کا حوصلہ ہے کہ اس قدر ظلم وستم سہہ کر بھی وفادار وجاں نثار رہتی ہیں۔ یہ شوہر پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ اے بے بسوں کی قسمتوں کے مالکوں اس طرف بھی توجہ دو سوچو تو ان مظلوموں میں بھی جاں ہے۔ گو دل ودماغ ظلم سہتے سہتے عرصہ سے مٹ چکا ہے، مگر جان تو ابھی باقی ہے۔ ہمیں یہ تاکید ہے کہ ہم ظلم کریں۔ تم سہو ہم ماریں تم نہ روؤ۔ بس اندر ہی اندر جل جل کر گھٹ گھٹ کر مر جاؤ۔۔۔ خدا کے واسطے ہم پر رحم کر کے سب سے پہلے ہماری خبر لو۔ تب تو ہم بھی ریفارمر وکہیں گے، ورنہ خواہ کسی قدر اصلاحیں کیوں نہ کرو ہمیں کیا۔۔۔[۶۷]

قوم کے ریفارمر و کو پکارنے کے ساتھ نذر سجاد عورتوں کو بھی احتجاج کے لیے اکسائی ہیں لیکن ان کا رویہ پھر بھی وہی ہے جو ایک شوہر پرست بیوی کا ہو سکتا ہے۔ بھائی رشید الملک سلطنت آرا کو اکساتے ہیں۔

> ڈپٹی صاحب نکاح ثانی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور بتائیں اجازت مذہبی کی آڑ میں جس قدر چاہے ظلم کر لیا۔ آخر ان کو ضرورت ہی کیا تھی دوسری شادی کی۔۔۔ آپ ہر گز اس وقت خاموشی اختیار نہ کریں۔ آپ کی صدہا ہندوستانی مظلوم بہنیں اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ آپ نے بھی انھی کی طرح روجھینک کر زندگی گزار دی تو کچھ فائدہ نہ ہو گا آپ کی تعلیم کا۔[۶۸]

رشید الملک کا کردار ایک پڑھے لکھے باشعور اور روشن خیال ہندوستانی مرد کا کردار ہے جو تانیثی سوچ اور رویے کا حامل ہے۔ رشید الملک اپنے ہم جنسوں کے روایتی اور جاہلانہ رویوں سے نالاں وعاجز نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا بہنوئی (ڈپٹی صاحب) اس کی بہن کو دھوکا دے کر دوسری شادی کر لیتا ہے تو وہ ایک عام ہندوستانی

کی طرح عورت کو ہر ظلم برداشت کر کے سسرال سے مر کر ڈولی اٹھنے کی نصیحت نہیں کرتا بل کہ وہ ایک پڑھی لکھی عورت کا ایسے رویوں پر چُپ سادھ لینے کو پورے طبقۂ نسواں کے خلاف ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔

دکھ بھری کہانی:

دکھ بھری کہانی کا موضوع بھی دوسری شادی اور جہیز کا لالچ ہے۔ قصے کا مرکزی کردار نجیبہ کے حالات کے سامنے بے دست وپا ہے۔ جو ایک غریب گھر میں پیدا ہوئی یتیمی و لاوارثی نے ماموں ممانی کے در پر لا پھنکا۔ احسان علی سے شادی نے نئی مصیبتوں کے در اس پر وا کر دیئے۔ شوہر بیوی کا قدر دان ہوا تو ساس کے روپ میں موجود عورت کی ازلی دشمنی آڑے آئی۔ اولاد نرینہ کے بہانے احسان کی دوسری شادی طے کر دی گئی۔

> ۔۔۔ڈیڑھ سال بعد ہی احسان علی کی دوسری شادی حمیدہ سے ہو گئی۔ اور ضرورت شادی کی یہ قرار دی گئی کہ ہمارا ایک ہی بچہ ہے نجیبہ سے اولاد نہیں ہوئی۔ بیاہ کو دو پرس ہونے آئے۔ اب کیا امید ہے۔"[۶۹]

حمیدہ ایک تو نئی بیوی تھی۔ دوسرے جہیز بھی نجیبہ سے زیادہ لائی تھی۔ پدرسری ذہنیت نے نئی بیوی کے آنے پر پرانی بیوی کو مالکن سے نوکرانی کی حیثیت پر لایا اور بالآخر گھر سے نکال باہر کھنڈر مکان میں ڈال دیا۔ جس کی مخالفت کرتے ہوئے نذر لکھتی ہیں:

> خدا سمجھے ایسے سنگ دل وحشی مردوں سے جو ایک ذرا سی مذہب کی آڑ پا کر بے ضرورت بیوی پر بیوی کرنے کو تلے ہوئے ہیں۔[۷۰]

قصے کے آخر میں مصنفہ جذباتی ہو کر قوم کے ریفارمرو کو پکارتی ہیں۔

> اے قوم کے ریفارمرو سب سے پہلے اس بے بس مظلوم فرقے کی خبر لینی ضرروی ہے آخر یہ بھی تو اس قوم کا ایک حصہ ہے جن کے ہاتھوں قوم پرورش پائی ہے۔[۷۱]

مذہب اور عشق:

مذہب اور عشق اصلاحی ناول ہے لیکن یہ نذر کے دیگر ناولوں سے الگ ہے۔ اس کا موضوع عورت کی اصلاح ہی ہے مگر یہ اصلاح اپنے طور پر کرانے کی بجائے نذر نے اسلام کے نقطۂ نظر سے کروائی ہے۔ ناول کی ہیروئن کا نام سوشیلا ہے جو ایک تعلیم یافتہ آزاد گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب بیرونی ملک سے تعلیم حاصل کر کے لوٹتی ہے تو اس کی ملاقات ایک مسلمان نوجوان شبیر سے ہوتی ہے۔ اسلام میں عورت کے مرتبے اور مقام کو لے کر دونوں کی بات ہوتی ہے۔ شبیر سوشیلا کی اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ وہ سوشیلا کے پوچھے گئے تما

م سوالوں کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیتا ہے۔ سوشیلا بے حد متاثر ہوتی ہے اور اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ شبیر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ ایک رومانوی کہانی ہے لیکن نذر نے سوشیلا کے سوالات کے ذریعے خواتین کو پیش آنے والے کئی مسائل پر توجہ دلائی ہے۔ سوشیلا شبیر سے کہتی ہے:

> دنیا کے کسی مذہب نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ہر مذہب عورتوں کو مردوں کی کنیز قرار دیتا ہے۔ جن لوگوں میں جتنی مذہبیت ہے ان میں عورت اس قدر ذلیل ہے۔[۴۲]

سوشیلا سمجھتی ہے کہ ہر مذہب عورت کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے کیوں کہ وہ عورت کے ساتھ رکھا جانے والا غیر مساویانہ سلوک ہی ہر طرف دیکھتی ہے جب کہ شبیر اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مساویانہ درجہ حاصل ہے۔

> نبی پاک صلعم نے فرمایا تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ حقوق کے متعلق ارشاد ہوا کہ مردوں پر عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے عورتوں پر مردوں کے حصول علم کو مردوں کو ساتھ عورتوں کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت دے کر عورتوں کی تعلیم اور ترقی کا دروازہ کھول دیا۔[۴۳]

سوشیلا عورتوں کی شادی کے متعلق بحث کرتی ہے کہ عورت کو سماج میں مرضی کی شادی کی اجازت نہیں۔ لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کہیں بھی کر دی جاتی ہے۔ شبیر اس معاملے میں بھی اسلام کی روشنی میں اسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔

> اسلام میں ہر مرد عورت کو سن بلوغ تک پہنچنے کے بعد اس کا کامل اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جسے چاہے رفیقِ زندگی بنائیں۔[۴۴]

اسلام کے اصولوں کے مطابق اتنی باتیں سن کر سوشیلا بے حد متاثر ہوتی ہے۔

> علاوہ بریں مجھے اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ اسلام میں عورتوں کو قریب قریب مردوں کے مساوی حقوق دیے ہیں اور اپنے قوانین میں اس کم زور جنس کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔[۴۵]

سوشیلا ہر بات کو حقائق پر پرکھنے کی عادی ہے کیوں کہ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے فیصلے پر اس کی بھاوج چندرانی اسے سختی سے تنبیہ کرتی ہے تو سوشیلا جواب میں کہتی ہے:

> اس زمانہ میں کوئی کسی پر سختی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ میں تو ہندوستانی ادب و لحاظ کی وجہ سے سب کچھ سہتی ہوں۔ اگر نہ سہوں تو کسی کو مجھ پر بے جا تشدد کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ پرانے ہندوؤں کی روایات کو تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک آزاد خیال لڑکی یہ سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔[۴۶]

سوشیلا اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہے وہ سماج کے کھوکھلے اصولوں اور نام نہاد عزت پر اپنی زندگی قربان نہیں کرنا چاہتی اس لیے مخالفت کے باوجود بھی وہ اسلام قبول کرتی ہے۔ شادی سے قبل شبیر سوشیلا سے پوچھتا ہے کہ کہیں وہ اس کی محبت کی خاطر تو اسلام قبول نہیں کر رہی۔ اس پر سوشیلا واضح انداز میں کہتی ہے کہ عورتوں سے متعلق میرے ذہن میں کئی سوال تھے۔ ان کا واضح جواب مجھے اسلام میں نظر آیا۔ میں نے اسی لیے اسلام قبول کر لیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوشیلا کی اسلام کی طرف رغبت کی وجہ اسلام میں عورت کی مساویانہ حیثیت ہے۔ نذر کوئی باضابطہ مذہبی مبلغ نہیں تھی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسرے مذاہب کی نسبت اسلام میں عورت کی حیثیت بہتر ہے تو انھوں نے اس بات کو تفصیلی طور پر اپنے ناول میں پیش کیا۔ یہ بھی خواتین کی اصلاح کی ایک کوشش ہے۔

نذر کی سنائی حسیّت عورت کی جس حیثیت کو دیکھنا چاہتی تھی وہ انھیں اسلام میں نظر آئی۔ وہ اس لیے اس بات کو کھلے طور پر نمایاں کرتی ہیں۔ نذر پردے کے خلاف تھی اور عورتوں کی آزادی میں اسے ایک رکاوٹ خیال کرتی تھی۔ وہ اپنے ناول میں بھی اسی احتجاج کو بلند کرتی نظر آئی جب سوشیلا پردے کے بارے میں گل نار سے پوچھتی ہے تو گل نار کہتی ہے۔

> بہن پردے میں ایک دو خرابیاں ہو تو بیان کی جائیں، اس میں برائی ہی برائی ہے۔[۷۷]

نذر کے نزدیک پردے میں کوئی اچھائی نہیں بل کہ پردہ عورت کی لیے قید ہے۔ اس لیے وہ اپنے کرداروں کے ذریعے پردے کو خراب گردانتی ہیں۔ غرض کہ نذر کے یہ خیالات یہ آشکار کرتے ہیں کہ وہ سماج میں عورت کو کس طرح دیکھنا چاہتی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ عظمیٰ فرمان، اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ، ص ۳۴۔

۲۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل، (لاہور: مکتبہ اردو ادب، س۔ن۔)، ص ۲۰۹۔

۳۔ سید جاوید اختر، اُردو کی ناول نگار خواتین: ترقی پسند تحریک سے دورِ حاضر تک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۷۔

۴۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ص ۱۵۲۔

۵۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم مرتبہ قرۃ العین حیدر، ص ۵۷۔

۶۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۵ء)، ص ۲۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۔

۸۔ نذر سجاد حیدر، ایک تجویز، عصمت، جلد ۴۰، (دہلی: ۱۹۲۸ء)، ص ۳۰۲۔

۹۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص۵۔۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص۱۸۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص۱۸۳۔

۱۴۔ نذر سجاد حیدر، ا ختر النساء بیگم مرتبہ قرۃ العین حیدر۔ ص۵۷۔

۱۵۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص۱۰۴۔

۱۶۔ ایضاً، ص۴۴۔

۱۷۔ ایضاً، ص۹۰۔

۱۸۔ نذر سجاد حیدر، رسم منگنی، عصمت، جلد۳۸، (دہلی: ۱۹۲۷ء)، ص۳۲۹۔

۱۹۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص۷۲۔

۲۰۔ ایضاً، ص۸۴۔

۲۱۔ ایضاً، ص۷۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۲۔۱۷۳۔

۲۳۔ ایضاً، ص۲۴۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۳۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص۲۳۷۔

۲۷۔ ایضاً، ص۱۷۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص۲۴۶۔

۲۹۔ نذر سجاد حیدر، حرماں نصیب، (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۸ء)، ص۸۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص۲۶۔

۳۱۔ ایضاً، ص۲۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص۸۰۔

۳۳۔ ایضاً، ص۷۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۷۳۔

۳۶۔ ایضاً، ص۷۰۔

۳۷۔ ایضاً، ص۷۶۔

۳۸۔ ایضاً، ص۸۴۔

۳۹۔ ایضاً، ص۸۹۔

۴۰۔ نذر سجاد حیدر، جاں باز (دہلی: عصمت بک ڈپو، ۱۹۴۲ء)، ص۳۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۵۔

۴۲۔ ایضاً، ص۱۹۔

۴۳۔ شگفتہ حسین۔ "بنت نذر باقر اور آزادی نسواں" مشمولہ دریافت، (اسلام آباد: ۲۰۰۳ء)، ص۵۰۰۔

۴۴۔ نذر سجاد حیدر، جاں باز، ص۹۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص۹۴۔

۴۶۔ ایضاً، ص۹۶۔

۴۷۔ نذر سجاد حیدر، نجمہ (دہلی: عصمت بک ڈپو، ۱۹۴۲ء)، ص۱۷۴۔

۴۸۔ ایضاً، ص۹۱۔

۴۹۔ ایضاً، ص۲۱۔

۵۰۔ ایضاً، ص۱۷۵۔

۵۱۔ قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ص۲۷۲۔

۵۲۔ نذر سجاد حیدر، نجمہ، ص۱۷۳۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۵۴۔ ایضاً، ص۱۶۹۔

۵۵۔ ایضاً

۵۶۔ ایضاً، ص۱۰۷۔۱۰۸۔

۵۷۔ نذر سجاد حیدر، ثریا، (دہلی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ص ۸۷۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۵۱۔

۶۰۔ نذر سجاد حیدر، شہیدِ جفا، نیرنگِ خیال (۱۹۳۲ء)، ص ۳۲۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۶۲۔ نذر سجاد حیدر، آہ مظلوماں، (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۴۰ء)، ص ۲۴۔۲۵۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۵۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۶۰۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔۱۰۴۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۶۹۔ نذر سجاد حیدر، دُکھ بھری کہانی، (لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء)، ص ۴۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۲۱۔۲۲۔

۷۲۔ نذر سجاد حیدر، مذہب اور عشق مرتبہ قرۃ العین حیدر، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ص ۸۵۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

باب پنجم:

معاصر خواتین ناول نگاروں سے نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تقابلی مطالعہ

نذر سجاد حیدر کی معاصر ناول نگار خواتین میں اکبری بیگم، صغرا ہمایوں مرزا، محمدی بیگم، مسز عباس طیب، عباس بیگم، بیگم شاہ نواز، ظفر جہاں بیگم، وغیرہ شامل تھیں۔ اکبری بیگم نذر سجاد حیدر کی سگی پھوپھی تھی۔ ان کا پہلا ناول "گل دستہ محبت" تھا۔ یہ ناول عباس مرتضیٰ کے فرضی نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا گیا۔ اکبری بیگم نے اس زمانے میں لکھا جب خواتین کا لکھنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے فرضی مردانہ نام سے لکھنا شروع کیا اور کئی ناول لکھے لیکن مقبولیت اور شہرت ان کے ناول "گودڑ کا لال" کو ملی۔ یہ ان کا دوسرا ناول تھا جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ اس ناول نے متوسط طبقے کی مسلمان عورتوں میں خصوصی حیثیت حاصل کر

لی اور لڑکیوں کی جہیز میں دیا جانے لگا۔ یہ ایک ترقی یافتہ ناول ہے۔ اکبری بیگم کا تعلق اس سماج سے تھا۔ جہاں عورت کی زندگی مرد کی مرضی کے مطابق گزارتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ تعلیم کی اس کمی کی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہوئی اور ان کی شخصیت دب کر رہ جاتی۔ اکبری بیگم نے عورتوں کی اس ابتر حالت کو دیکھا اور اپنے قلم کے ذریعے اس کے خلاف آواز بلند کی اور معاشرے کی حد بندیوں کے خلاف "گودڑ کا لال" ایک کامیاب کوشش ہے۔ دراصل اکبری بیگم اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کے روایتی بندھن توڑنا چاہتی تھی۔ وہ ظلم و ستم اور جبر و زبردستی کے خلاف تھی۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے نسوانی کردار پیش کیے جیسے وہ خود عورت کو دیکھنا چاہتی تھی۔ "گودڑ کا لال" میں مصنفہ نے ایسے تمام گھریلو مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ جس سے خواتین کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس میں پردے کی قید کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور پہلی بار مسلمان لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم کا تصور دیا ہے۔

اس ناول کی ہیروئن ثریا جبین بغیر نقاب کے لڑکوں کے ساتھ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں تین الگ الگ گھروں کی کہانی پیش کی ہے۔ ناول میں ایک متوسط خاندان ہے۔ جو اس ناول کی ہیروئن ثریا جبین کا گھر ہے۔ دوسرا گھر یوسف رضا اور اس کی بہن خیر النساء کا ہے۔ تیسرا گھر مسٹر افضال اور مس شکیلہ کا ہے، یہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ لوگ ہیں۔ اکبری بیگم کا مقصد دراصل سماج کی اصلاح اور خواتین کی حالت میں سدھار لانا ہے۔ اس لیے انھوں نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو خیر و شر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں مقبول بیگم، خیر علی اور نجف بیگم کے کردار پیش کیے۔ جو اپنی نااہلی سے اپنا گھر خراب کر دیتے ہیں۔ وہی حسن رضا، یوسف رضا، ثریا جبین، محبوب بیگم اور پھول بیگم جیسے تعلیم یافتہ اور باشعور لائق کردار پیش کیے اور یہ بتایا کہ کس طرح تعلیم و تربیت کی کمی انسان کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے، اور وہ زندگی میں غلط فیصلے کر کے اپنی زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے بنامرضی کی شادی، بے جوڑ شادی، تعلیم و تربیت کی کمی جیسے مسائل کو نہ صرف پیش کیا ہے بل کہ اس کا حل بھی بتایا ہے۔ ازواجی زندگی کے مسائل کو بھی مصنفہ نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ شادی لڑکا لڑکی کی مرضی سے ہو۔ اور ان کی مزاج کو دیکھتے ہوئے ان کا رشتہ جوڑا جائے۔ ایسا نہ ہوا تو ان کا حال بھی یوسف رضا اور مقبول بیگم کی طرح ہو گا۔ اس کے علاوہ اکبری بیگم نے بے جوڑ شادی کے مسئلے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اکبری بیگم کی نظر ایک اور اہم مسئلے پر بھی تھی اور وہ مسئلہ معاشرے میں عورت کی اہمیت و حیثیت کا تھا۔ انھیں سماج کے روایتی اصولوں سے نفرت تھی وہ عورت کے مقام کے لیے اس کی تعلیم کو ناگزیر سمجھتی تھی۔ اس بات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے وہ ثریا جبین کا کردار پیش کرتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ پردے کی پابندیوں کے خلاف بھی آواز اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ ثریا کے روپ میں ایسی لڑکی کو پیش کرتی ہیں۔ جو بے پردہ کالج جاتی ہے۔ مخلوط

تعلیم حاصل کرتی ہے۔ لیکن اس کا حلیہ اس طرح بناتی ہیں کہ کوئی اس کی جانب توجہ نہ دے۔ انھیں احساس تھا کہ اگر وہ اس کردار کو اس طرح پیش نہ کرتی تو لوگ اسے قبول نہ کرتے۔ ثریا کے کردار کو اس طرح پیش کرنا خود ناول نگار کی نسائی حسیّت کو سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ بغیر دباو کے لڑکیوں کو اپنی مرضی سے زندگی گزارتا ہوا دکھانا چاہتی ہیں اور دوسری طرف کہیں نہ کہیں انھیں سماجی بندشوں کا بھی احساس ہے۔ لیکن ان کی نسائی حسیّت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انھوں نے اپنے ناول میں معاشرہ کی اصلاح نسائی نقطہ نظر سے کی ہے۔ اور عورت کو اس طرح پیش کیا جیسے وہ خود عورت کو دیکھنا چاہتی تھی نہ کہ جس طرح سماج دیکھنا چاہتا ہے۔ یا شاید اس دور کی ہر لڑکی کی یہی خواہش تھی۔ انھوں نے ثریا کہ کردار میں ایک ایسی آئیدیل لڑکی کو پیش کیا۔ جو باہمت، خود دار اور تعلیم یافتہ ہے۔ جس میں اپنی مدد آپ کی صلاحیت موجود ہے۔ ثریا کو اس مقام تک پہنچانے میں اس کے بھائی حسن رضا کا بھی کافی کردار ہے۔ حسن رضا عورتوں کی تعلیم کی حمایت کرتا ہے۔ اور مردانہ ظلم و ستم کے خلاف جو باتیں کہتا ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مردانہ بالادستی کو ختم کرکے عورت کو اس کا جائز مقام دلانا چاہتا ہے۔ حسن رضا ایک موقع پر کہتا ہے۔

> بھائی ہمارے ملک کے مردوں کا مذاق بہت بگڑ گیا ہے۔ عورتوں کی قدر ان کو بالکل نہیں ہے۔ اپنا دست نگر اور محتاج سمجھ کر جس طرح چاہتے ہیں سلوک کرتے ہیں۔ اس کے جائز حقوق اور شرعی آزادی سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ علم جیسی نعمت سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ نہ کسی قسم کا ہنر سکھاتے ہیں۔ پھر ہر طرح سے موردالزام بتاتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے اگر خدا کی مدد بھی شامل حال ہوئی تو میں اسے بالکل کسی قسم سے مردوں کا دست نگر نہ رکھوں۔ اگر خدا نخواستہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہو جیسا ہمارے مرد بے زبان قابل رحم مستورات کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ اپنی مدد آپ کر سکنے کے قابل ہو۔[1]

عورتوں کی زبوں حالی کا بیان ایک مرد کی زبان سے کروانے کے پیچھے بھی ایک مقصد کار فرما ہے۔ وہ یہ کہ عورتوں کی حیثیت میں بدلاو لایا جائے اور مرد کو بھی اس بات کا احساس ہو کہ عورت کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے۔ عورتوں کی حالت کو بدلنے کی بات کرتے ہوئے اکبری بیگم یہ باور کروانا نہیں بھولتی کہ عورتیں اپنی تعلیم کا غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس لیے ثریا جبین جب شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ تو وہ محبوب بیگم کی زبانی ثریا کو نصیحت کرتی ہیں۔

> آپ کو یہ نظیر نہیں قائم کرنی چاہیے کہ دنیا کہے کہ فلاں خاتون کے زیادہ تعلیم پانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنے قابل ہی کوئی نظر نہیں آیا اور وہ تمام عمر اپنی

تعلیم کے غرور میں بن بیاہی رہی۔ آپ یہ نظیر قائم کریں کہ لوگوں کو باقی
مستورات کو تعلیم دلوانے کا شوق پیدا ہوا اور کہیں کہ ان کے زیادہ تعلیم پانے
کا کیا اچھا نتیجہ نکلا۔ اور کس خوبی سے ان کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔[۲]

اکبری بیگم ایک عورت ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہے کہ اگر ایک تعلیم یافتہ لڑکی اس طرح کا قدم اٹھائے گی تو دوسری لڑکیوں کا تعلیم پانا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ثریا جبین کو اس اقدام سے باز رکھتی ہیں تا کہ اس کے اس قدم کی وجہ سے آزادی نسواں کا جو عمل شروع ہوا ہے اس کو دھچکا نہ پہنچے۔ یہ پورا ناول اپنے آپ میں ایک اصلاحی پہلو رکھتا ہے۔ غرض کہ ہم کہہ سکتے ہیں "گودڑ کا لال" کے مطالعہ سے اکبری بیگم کے نسائی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور ناول کے مکالمے اور تقاریر ان کی نسائی حسیت کا پتا دیتے ہیں۔

ناول کا موضوع ہی "معاشرے کی اصلاح" ہے۔ مصنفہ کا براہ راست خطات عورت سے ہے۔ ناول کے سرورق پر مندرجہ ذیل سطر درج ہے۔ "خواتین و لڑکیوں کے لیے نصیحت خیز ناول" اکبری بیگم نے معاشرے کی چھوٹی چھوٹی برائیوں پر توجہ دی جو معاشرے کو برباد کرتی ہیں۔ انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی زور دیا۔ اور تربیت کی اہمیت کو بھی واضح کیا۔ مقبول بیگم کا کردار اس بات کو واضح کرتا ہے اگر ایک انسان تربیت سے ہی بے گانہ رہ جائے تو وہ معاشرہ، سماج یہاں تک کہ خود اپنی ذات کے لیے بھی عذاب بن جاتا ہے۔ انھوں نے حقیقت کو پیش کرنے کے لیے متنوع کردار پیش کیے۔ سگے بہن بھائیوں میں متضاد خصوصیات ڈالی۔ ان تخریبی خصوصیات کی وجہ یہ بتائی۔

سارے کنبے میں حسن رضا اور ثریا جبین کے اس قدر عقل مند ہونے کا باعث
یہ تھا کہ انھیں بچپنے میں تربیت اچھی ملی ورنہ یہ بھی ضرور انھی عادتوں کے
ہوتے اگر والدہ کے زیر سایہ بہن بھائی میں کھیل کر بڑھتے پلتے۔[۳]

ناول کے دوسرے حصے میں مقبول بیگم کے کردار کے مقابلے میں محبوب بیگم کر کردار ہے۔ محبوب بیگم سے یوسف رضا کی دوسری شادی ہے محبوب بیگم کے گھر والے اس بات سے ناواقف ہیں کہ یوسف رضا پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ مصنفہ لکھتی ہیں کہ

وہاں اب تک کسی کو علم نہ تھا یوسف شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔[۴]

صورت حال معلوم ہونے پر محبوب بیگم کی والدہ کہتی ہیں

ہم کو معلوم ہوتا کہ اس کی بیوی موجود ہے تو کبھی یہ ظلم اس بے چاری پر نہ
کرتے۔[۵]

یوسف رضا دراصل اس بچی کی پرورش کے لیے دوسری شادی کرتا ہے۔ یہاں یوسف کے کردار کا تضاد سامنے آتا ہے پہلی بیوی کو ناپسند کرنے کے باوجود فطری شرم وحیااور بزرگوں کی عزت کی خاطر وہ شادی کرتا ہے اور پھر دوبارہ دوسرے خاندان کو دھوکا دے کر شادی کرتا ہے۔ لیکن مصنفہ یوسف کے اس عمل کو اس کی کمزوری نہیں بتاتی اور نہ ہی یوسف کے اس عمل کو اس کی کمزوری نہیں بتاتی۔ اور نہ ہی یوسف کی دوسری شادی کو سماجی طور پر جائز قرار دے سکتی ہیں کیوں کہ یہ عمل ان کی مقصدیت کو کمزور کر سکتا تھا۔ کثرت ازواج کو بھی ختم کرنا مصنفہ کا مشن تھا وہ لکھتی ہیں۔

> کثرت ازواج کا انسداد ہونا بہت ضروری امر ہے ۔ جہاں تک احکام اسلام اجازت دیتے ہیں اس سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے قرآن شریف میں صاف حکم ہے اگر انصاف نہ کر سکو تو ہر گز دو شادیاں نہ کرو اور پھر یہ بھی فرمایا تم انصاف نہیں کر سکتے اگر چاہو بھی کرنا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے کثرت ازواج کو منع فرمایا ہے اور ہاں بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کی حالت میں حکم ہے۔[۶]

اکبری بیگم ، یوسف کی دوسری شادی کو شرعی نقطہ نظر سے غلط نہیں قرار دے سکتی تھی لیکن سماجی اور اخلاقی نقطہ نظر سے ان کے نزدیک یہ عمل کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں دوسری شادی کرتا ہے تو پھر خواتین کو چاہے کہ وہ مفاہمت کا طریقہ اختیار کریں اور ایک دوسرے کے حقوق کو پہچانے۔ محبوب بیگم کی ماں اپنی بیٹی کو یہ نصیحت کرتی ہے۔

> بیٹی یہ سوتیاڈاہ یا سوتیلے بچوں سے دشمنی تو کمینی اور جاہلوں کا کام ہے۔ تم اسے اپنی بڑی بہن سمجھنا ہمیشہ اس کی دل جوئی اور رضامندی کا خیال رکھنا وہ تو پہلے ہی دل شکستہ ہے۔ تم ہمیشہ اس کا حق اپنے سے فائق سمجھنا۔ میری نور چشم وہ پہلی ہے۔ اور کنبہ کی بیٹی اس کا حق ہر طرح سے تم سے زیادہ ہے۔[۷]

محبوب بیگم ماں کی نصیحتوں کو پلے باندھ لیتی ہے اور آئیدیل بیوی کا روپ دھارتی ہے اور گھر میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کو بڑی خوب صورتی سے حل کرتی ہے۔ "گودڑ کا لال" میں نجف کا کردار سب سے زیادہ دل چسپ معلوم ہوتا ہے نجف خانم ، مقبول بیگم کی بچپن کی سہیلی ہے۔ وہ مقبول بیگم کو زندگی کے تمام معاملات میں مشورے سے نوازتی ہے۔ بظاہر تو اس کا مشورہ بہتری کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے تمام تر مشوروں ہی کی بدولت مقبول بیگم بربادی کے دھانے پہنچتی ہے۔ نجف خانم کے کردار کے ذریعے اکبری بیگم خواتین کو یہ سبق دینا چاہتی ہیں کہ دوسروں کے بے جا صلاح و مشورہ پر عمل کرنے کی بجائے ہمیں اپنے اندر ہی اتنی سمجھ بوجھ اور خود اعتمادی پیدا

کرنی چاہیے کہ اپنی بھلائی اور برائی میں امتیاز کر سکیں۔ ہمیں اپنے معاملات میں دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے خود میں حالات سے لڑنے کا حوصلہ اور ہمت پیدا کرنا چاہیے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ناظرات دیکھا آپ نے ہٹ اور ضد کا نتیجہ یوسف ان مردوں میں سے نہ تھے جو اعلیٰ تعلیم پاکر اور امیر آدمی بن کر پہلی بستی ہوئی بیویوں کو برا ٹھہرا کر اور کرنا چاہتے ہیں۔ مقبول کو صرف اس کی ہٹ اور ضد نے برباد کیا۔ یہ سب نجف خانم کی صلاح و مشورے کی بدولت ہوا۔ پیاری بہنوں کسی کے صلاح و مشورے پر عمل نہ کرو صرف اپنے شوہروں کی خوشی اور مرضی پر چلو۔ ان کا حکم مانو اور خوش رکھو اپنی طبیعت پر چاہیے جبر ہی کرنا پڑے۔[۸]

نجف خانم کا کردار اکبری بیگم کے ہاں پیش کرنے کا مقصد اس کے نفسیاتی رد عمل میں پوشیدہ ہے۔ وہ مقبول بیگم کے منگیر کو پسند کرتی ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں موجود ہے جس کا اظہار وہ مقبول بیگم کے سامنے بھی کرتی ہے۔ "انھی دنوں تمھاری منگنی یوسف سے ہوگئی پہلے بھی دو ایک بار حسن رضا کے ساتھ میں نے انھیں دیکھا تھا۔ مگر منگنی کے روز تو دلہا بنا دیکھ کر تو جتنی مجھے تم سے محبت تھی اس سے کئی گنا تمھاری قسمت پر رشک آگیا۔ اور یوسف رضا کی منگیتر ہو جانے سے مجھے تم سے ایک طرح کا حسد ہو گیا۔ مگر اس حسد کو محبت کی تہ میں میں نے چھپائے رکھا اور کچھ سوچ کر تمھارے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ محبت جتانے لگی۔"[۹]

اور جب نجف خانم یوسف پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ تو اس کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مقبول بیگم اور یوسف کی زندگیوں میں پھوٹ ڈال دے اور اس کی زندگی تلخ کر دیے۔ اس کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہے۔

> وہ بدلہ اور میں کس طرح لے سکتی تھی سوائے اس کے کہ بے چارے کی تمام عمر تلخ اور خراب کرو۔ تم سیدھی اور بھولی تھیں اور میرے بس میں تھیں۔ میں نے ہر ایک بات تمھیں الٹی ہی سمجھائی اور سکھائی جو بات بتائی ایسی ہی بتاتی جو یوسف کی بدمزگی اور تکلیف کا باعث ہو۔ یوسف کی بیوی ہو جانے سے مجھے اب تمھاری ذرا بھی محبت نہ رہی تھی۔ بل کہ بجائے محبت کے ایک طرح کی جلن ہو گئی تھی۔ بس میں دونوں طرح خوش تھی یعنی تمھاری ناموافقت سے بھی اور یوسف کی تکلیف سے بھی۔[۱۰]

نجف خانم کے اعتراف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے یہ تمام اعمال اس کی غلط تربیت کا نتیجہ ہیں۔ "گودڑ کا لال" میں اکبری بیگم نے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم اولاد کی عمدہ تربیت معاشرے میں پھیلی ہوئی مختلف برائیاں، ہندوستانی سماج میں پھیلے غلط اور بے کار قسم کے رسم و رواج اور توہم پرستی کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ اس دور کی شادی بیاہ کی فضول رسمیں اور ان سے پیدا ہونے والی بے راہ رویوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

سمدھنیں فرش پر بٹھائی گئیں اور ڈومنیوں نے مغلظ گالیاں گانا شروع کیں۔ نواب بیگم صاحبہ دلہا کی خالہ نے خوشی سے سنیں اور بھرپور انعام دیا۔ بھاوج سے بی ڈومنیوں نے جھگڑ جھگڑ کر لیا۔ سمدھنوں کو شربت پلایا گیا۔ کٹورا میں بھاوج نے معقول لاگ ڈالا۔ نائن رضا کے دالان میں لکڑی کی ڈولی اور آٹا لے کر گئی۔ ڈولی سے زمین ناپی آٹے سے چوک کے اندر چوکی بچھائی۔ اوپر سرخ ٹول کر ٹکڑا اور پاس ابٹنے کا کٹورا اور پنڈ ٹیں لا کر رکھیں اور دلہن کا زرد کپڑے پہنا کر ایک سہاگن گود میں اٹھا کر لائی۔ چوکی پر گھونگھٹ نکال کر بیٹھا دیا۔ دائیں کلائی میں کنگنا باندھا۔ قریبی رشتہ دار بیبایاں اور سمدھنیں اندر بلائی گئیں۔ پیڑی توڑ کر منھ میں دی اور ہتھیلی پر گھلا ہوا ابٹنا ساتھ سہاگنوں نے رکھا۔ میراثنوں نے مانجھے کا گیت گایا۔[11]

نذر سجاد نے ان رسم ورواج اور معاشرتی مسائل کی عکاسی اپنے ناولوں میں اپنے انداز میں کی۔ کم عمری اور بچپن کی شادی کا رواج ہندوستان کے سماج میں معمول کی چیز بن گئی تھی۔ اسے اس معاشرے میں ناپسندیدہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور پر پسماندہ ذاتوں میں اسے ایک اچھی رسم خیال کیا جاتا تھا، کیوں کہ والدین ابتدائی عمر میں ہی بچیوں کی شادی کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جایا کرتے تھے۔ نذر سجاد حیدر نے ہندوستان کے انھی سنگین مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے تعلیمی اصلاحات پر بھی زور دیا۔ خواتین کی تعلیم کہیں تھی بھی تو صرف گھر کے اندر تھی، جہاں وہ گھر کی بڑی بوڑھیوں سے علوم خانہ داری حاصل کیا کرتی تھی۔ مجموعی طور پر تعلیم نسواں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جس کی وجہ سے عورت کی شخصی زندگی توہم پرستی اور رسومات کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ نذر سجاد کے نسوانی کردار جیسے کہ اختر النساء کی "اختر بیگم"، مذہب اور عشق کی "سوشیلا" اور ثریا کی ہیروئن "ثریا جبین" بھی انھی معاشرتی الجھنوں میں گرفتار دکھائی دیتی ہیں۔

صغرا ہمایوں کا شمار اردو کی اولین ناول نگار خواتین میں ہوتا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ اس دور میں حیدر آباد کی نسوانی دنیا بالکل مختلف تھی۔ عورتیں گھروں میں چار دیواری میں قید تھی۔ پردے کا رواج عام تھا۔ تہذیب و تمدن کچھ اور ہی اقدار تھے۔ تعلیم و تربیت کے لیے مدرسوں کا انتظام نہیں تھا۔ شرفا اپنی بچیوں کو مدرسے سے بھیجنے کے عادی نہیں تھے۔ ایسے ماحول میں صغرا بیگم کی تربیت گھر پر ہونے لگی۔ علم و ادب کے حصول کے بعد ان کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کو دیکھا۔ پردے کی پابندی، تعلیم کی محرومی اور ان کی دیگر مجبوریوں کا احساس کر کے صغرا ہمایوں نے عورتوں کے مسائل یکسوئی سے دیکھے اور ان کی بے داری اور ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے قدامت پسند ماحول اور غیر مساویانہ رویوں کے خلاف خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بل کہ عورت کی ترقی و اصلاح کے لیے باقاعدہ کام کرنے لگیں۔ صغرا ہمایوں ایک دردمند سماجی رکن تھیں۔

انھوں نے خواتین کے رسائل کی ادارت کرکے اور مدرسہ قائم کرکے عورت کی زندگی بدلنا چاہی اور پرانی روایتوں اور رواجوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ مختلف انجمنوں سے بھی وابستہ رہی۔ ان سماجی و فلاحی کاموں کے علاوہ انھوں نے اردو ادب میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ انھوں نے اپنے عمل اور قلم دونوں سے خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے کام کیا بقول طیبہ خسرو

> صغرا بیگم کی اولو العربی اور عورتوں کے مسائل سے گہری دل چسپی اور لگاؤ نے لاکھوں پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستے میں اجالے پیدا کر دیے۔ ان میں عام بے داری پیدا کر دی کہ وہ خود اپنی منزل پہچان سکیں۔ [۱۲]

صغرا ہمایوں ادیبہ، شاعرہ اور ایک اچھی ناول نگار بھی تھی۔ انھوں نے الگ الگ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ شاعری کی، موسیقی پر کتابیں لکھیں، ناول لکھے اور سفر نامے بھی۔ گلشن ترنم، نصیحت کے موتی، زہرا، مشیر نسواں، موہنی اور "سرگزشت ہاجر" جیسی کتابیں اور سفر نامہ عراق، سفر نامہ پونا اور والیٹئر، سفر نامہ یورپ سفر نامہ بہار و بنگال، سیاحت جنوبی ہند اور رہبر کشمیر جیسے سفر نامے لکھے۔

انھوں نے تقریباً چودہ ناول لکھے۔ جن میں "اختر النساء"، "مشیر نسواں"، "زہرا"، "موہنی" اور "سرگزشت ہاجرہ" بہت مقبول ہوئے۔ ان کے ناول "موہنی" میں مافوق الفطرت عناطر ملتے ہیں۔ اس میں داستانوی رنگ نمایاں ہے اور ایران کی تہذیب و تمدن کی تفصیلی طور پر تصویر کشی کی ہے جب کہ خواتین کے مسائل پر لکھا گیا۔ ان کا ناول "سرگزشت ہاجرہ" اہم ہے۔

صغرا ہمایوں نے "سرگزشت ہاجرہ" اس وقت لکھنا شروع کیا جب وہ ادبی دنیا میں قدم رکھ رہی تھی۔ یہ ان کا اہم اور اصلاحی ناول ہے۔ اس وقت لوگوں میں تعلیمی بے داری کے تحت شعور بے دار ہو رہا تھا۔ لوگ روایتی زندگی سے قطع تعلق کرکے عملی طور پر حقائق کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں ایسا کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ خاص کر اس معاشرے میں خواتین کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لیے جب صغرا ہمایوں نے قلم اٹھایا تو خواتین کی زندگی کو ہی موضوع بنایا۔ اس ناول میں انھوں نے خواتین کی تربیت اور ازواجی زندگی کی کامیابی کے اصولوں کو پیش کیا۔ ناول میں ہاجرہ، سارا اور مسز عون بھی اپنے تجربات بیان کرتی ہیں۔ دوران گفتگو یہ لوگ عورتوں کے مسائل اور حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ صغرا ہمایوں نے یہ ناول خواتین کو سمجھانے کے انداز میں لکھا۔ اس دور میں عورت کی حالت زار دیکھ کر آنے والے فکر انگیز خیالات کو بھی پیش کیا۔ جیسے کہ "ہاجرہ" نکاح کے وقت اپنے شوہر سے بالکل انجان تھی۔ اپنے ماں باپ کی پسند پر بھروسا کر لیا لیکن اپنے اوپر ہونے والی زبردستی اور حاکمیت کا دکھ پھر بھی محسوس کرتی۔ ہاجرہ کہتی ہے:

چاہے لڑکا زندگی حبشی ہو یا خوب صورت جوان ہو یا اسی برس کا بوڑھا عالم ہو جاہل۔ ہر حال میں ہاں کہنا ہی شریف لڑکیوں کا معیار ہے۔ میرے والدین روشن خیال تعلیم یافتہ تھے مگر انھوں نے بھی شادی سے قبل مجھ سے نہ پوچھا کہ تم کو یہ انتخاب پسند ہے یا نہیں۔ [۱۳]

اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لڑکی اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا احساس رکھتی تھی، اگرچہ روایتی ہندھنوں میں جکڑی ہونے کی وجہ سے اس کا اظہار تک نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے اس روایت کو بدلنے کی بات ضرور کی ہے۔ ناول میں "سارا" کہتی ہے:

واقعی ہند میں یہ بہت بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے دفیعہ کی تدابیر صاحب ہم لوگوں کو کرنا چاہے ۔۔۔۔اب تو یہ رواج ہے کہ لڑکی اپنی نسبت کی خبر تک نہیں سن سکتی۔ جہاں نسبت کا ذکر نکلا۔ لڑکی وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ [۱۴]

صغرا ہمایوں کا مقصد لڑکیوں کو کامیاب زندگی کے گر بتانا تھا۔ لیکن عورتوں پر کیے جانے والے ظلم پر بھی روشنی ڈالنا نہیں بھولتی۔ وہ چاہتی ہیں کہ عورت سے زور زبردستی نہ کی جائے۔ اسے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دیا جائے۔ وہ اپنے کردار ہاجرہ کی زبانی مرد حضرات کے عورتوں سے ناروا سلوک پر یہ بتاتی ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد ہم کو حقیر جانتے ہیں۔ حالاں کہ ہمارے سبب سے ان کی عزت ہے۔ ہمارے سبب سے ان کی آبرو ہے۔ ہمارے سبب سے ان کا وجود ہے۔ [۱۵]

آگے عورت کی وجہ سے مرد کی اہمیت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ

بے باپ کا بچہ پیدا ہوا ہے لیکن بے ماں کا بچہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔ [۱۶]

وہ سمجھتی ہیں کہ مرد کی دولت، آبرو، خاندان سب عورت ہی کے نام سے ہے۔ اسی لیے عورت مرتبہ میں مرد سے برتر ہو سکتی ہے کم تر نہیں۔ ہاجرہ، سارا، مسز عون سماج میں لڑکیوں کی ناگفتہ حالت پر تبصرہ کرتی ہیں۔ کہ سماج میں لڑکی کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں۔ مرد عورت کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے۔ لڑکیوں کو اس معاشرے میں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ہاجرہ لڑکیوں کو اس حالت سے باہر نکالنے کی تجاویز پیش کرتی ہے۔

ہم کو یہ کوشش کرنی چاہے والدین اپنی لڑکی کو ہرگز ایسے شخص کو نہ دیں جس کے پاس پہلی بیوی موجود ہو۔ خواہ اس کی اولاد ہو یا نہ ہو۔ اگر بیوی مر چکی ہو تو لڑکی دی جائے لیکن ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا عقد نہ کرنا چاہے۔ دوسرے یہ کہ عقد ثانی کا رواج ڈالا جائے۔ بیوہ عورتوں کو ترغیب دی جائے۔ جو عورت جوان بیوہ ہو اس کو عقد ثانی کرنا واجب کر دیا جائے۔ [۱۷]

مصنفہ چاہتی تھی کہ عورت جھوٹے سماجی بندھن سے آزاد ہو جائے اس لیے انھوں نے ہاجرہ کے کردار کے ذریعے ان مسائل سے باہر آنے کا حل بتایا وہ سمجھتی ہیں کہ سماج میں بیوہ کو ہر خوشی سے محروم کیا جارہا ہے۔ اور کوئی بھی عورت ایسا کرنا چاہے تو والدین اور رسم ورواج اسے ایسا کرنے نہیں دیتے۔ اس لیے ہاجرہ کہتی ہے۔

> بیوہ عورتیں عقد ثانی کرنا چاہتی ہیں ان کے والدین سر راہ ہوتے ہیں اور رواج مانع ہیں اس لیے اگر کوشش کی جائے تو اکثر بیوہ عورتیں عقد ثانی کرلیں گی۔ [۱۸]

ہاجرہ اپنی اچھی تربیت کی وجہ سے اپنی ازواجی زندگی کو کامیاب بنالیتی ہے لیکن اس کا اصل مقصد عورت کی حالت میں سدھار لانا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ:

> مجھے تین کاموں کی بڑی فکر ہے خدانے چاہا تو کرکے چھوڑوں گی ایک زنانہ تربیت گاہ قائم کروں۔۔۔۔ دوسرے اس کی کوشش کی جائے کہ کم سن بیوہ عورتوں کا عقد ثانی کیا جائے۔ ان کو ترغیب دی جائے۔ تیسرے ایسے شخص کو والدین لڑکی نہ دیں۔ جس کی پہلی بیوی زندہ ہو۔ اس کے لیے بڑی کوشش کرنی ہوں گی۔ [۱۹]

غرض صغرا نے ہاجرہ کے روپ میں اس عورت کو پیش کیا جو اخلاقی طور پر بلند ہے۔ وہ عقل و فہم سے اپنی زندگی کو کامیاب بناتی ہے اور اس کے ساتھ خواتین کی حالت میں بھی سدھار لانا چاہتی ہے۔ ہاجرہ کے تینوں کام کے ذریعے ہندوستانی سماج کے دراصل تین اہم مسئلوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ خیالات دراصل صغرا ہمایوں کی نسائی حیثیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ناول میں اخلاقی پہلوؤں پر بھی زور دیا گیا ہے۔ عورت کو مناسب حالات میں سمجھ بوجھ سے کام لے کر زندگی گزارنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نکاح میں لڑکی کی مرضی بیواؤں کو دوسری شادی کا حق جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے اور اپنے تئیں اس کا حل بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستانی، نسوانی معاشرت کے یہ متنوع رنگ نذر سجاد حیدر کے ہاں مختلف کرداروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ فکری پس منظر ان ناولوں کا ایک سیاہی ہے۔ جو اپنے اندر اس دور کی سماجی و تہذیبی زندگی کی جزئیات کو سموئے ہوئے ہے۔ اشرافیہ اور عام متوسط مسلم گھرانوں کی فضا، ماحول، شادی، بیاہ، پیدائش اور موت کی رسومات اور سماجی زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویریں دونوں کے ہاں یکجاں ہیں۔ دونوں خواتین کے نسوانی کردار روایات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کے لیے بیوگی ایک بڑی مصیبت تھی۔ شوہر تو مر جاتا لیکن عورت کی زندگی زندہ درگور ہو جاتی۔ عورتیں بیوگی کی ناقابل برداشت تکالیف کو سہنے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی تھی۔ ہندوستانی بیوائیں کس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ "سرگزشت ہاجرہ" کی ہاجرہ اور "اختر النساء" کی اختر اس کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ یہ روایتی ہندوستانی عورت کا کردار ہیں جو اپنے اوپر ہونے والے ہر ظلم کے جواب میں خاموشی کا زہر پیتی

ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے معاشرے میں عورت کو صحیح مقام دلانے کے لیے اچھی تربیت اور تعلیم نسواں کو بطور ہتھیار پیش کیا۔ تعلیم کی بدولت حالات سے لڑ کر ان میں سدھار لا سکتی ہے۔ اختر کا کردار انھوں نے اسی مقصد کے تحت تخلیق کیا۔ تعدد ازواج بھی اس صدی کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ ایک سے زائد بیویاں رکھنا نوابانہ، جاگیر دارانہ، شان بن چکا تھا۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ نے "آہ مظلوماں" میں دو بیبیوں کا قصہ بیان کر کے اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قصہ میں سلطنت آرا کا بھائی رشید، ڈپٹی صاحب سے نکاح ثانی کی وجہ پوچھنے کے لیے بہن پر اصرار کرتا ہے۔ یہاں نذر اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم پر عورتوں کو احتجاج کے لیے اکساتی ہیں۔

ناول "ثریا" میں بھی ثریا کی مصیبت زدہ زندگی کی وجہ نواب کیواں قدر کی دوسری شادی ہی بنتی ہے۔ اس سماجی برائی کی ایک وجہ بغیر پسند کی شادی بھی ہے۔ نذر سجاد اس بات کی حامی نہ تھی کہ عمر بھر کے رفیق کے انتخاب میں والدین یا کوئی اور دخل انداز ہونے کا مجاز ہو۔

اردو ناول نگاری کے سر آغاز پر ایک اور نام محمدی بیگم کا نظر آتا ہے۔ جو نامور ادیب وہ ناشر شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بیوی اور مشہور ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں۔ محمدی بیگم نے مشہور رسالہ "تہذیب نسواں" کی ادارت کی۔ اگرچہ اس کی انھیں بھاری قیمت بھی چکانا پڑی۔ انھیں اور ان کے شوہر کو ایسے خط بھی ملے جس میں فحش گالیاں بھی درج ہوتی تھیں۔ ان کے گھر کے در و دیوار کو بھی اسی قسم کی گالیوں سے آلودہ کیا جاتا۔ چند روایت پرست لوگوں نے ایک طوائف "اللہ دی زاکت" سے ایک زنانہ اخبار جاری کروایا۔ جس سے "تہذیب نسواں" کی تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ لیکن محمدی بیگم نے آخری سانس تک تہذیب نسواں کی ادارت سنبھالی اور یہ کام انھوں نے اسی جذبے سے جاری رکھا۔ جس کے تحت انھوں نے یہ جریدہ خواتین کی ذہنی تربیت اور ان کی اصلاح و ترقی کی غرض سے شروع کیا تھا۔ انھوں نے بے شمار علمی ادبی خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے بطور سوانح نگار، مضمون نگار، ناول نگار، اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں، خواتین کے میل جول کے آداب اور امور خانہ داری سے متعلق کئی کتابیں لکھی۔ ان کے کئی مضامین دیگر معاصر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

محمدی بیگم (شریف بیٹی):

انیسویں صدی میں خواتین کے لیے پردے کی پابندی نہ صرف لازم تھی۔ بل کہ اسلامی روایات کا حصہ بھی تھی۔ شرفا کی خواتین کے لیے پردہ اس دور کا طبقاتی امتیاز بھی تھا۔ ان حالات میں عورت کا گھر سے باہر نکلنا اور نکل کر کمانا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ اعلیٰ اور متوسط طبقے کی خواتین مجبوری کے باوجود بھی معاشی کردار ادا کرنے سے قاصر تھیں۔ البتہ نچلے طبقے کی خواتین گھریلو ملازمت یا دیگر چھوٹے چھوٹے کام کر کے کما کھا لیتی تھیں۔ اسی

متوسط طبقے کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے محمدی بیگم نے اپنا ناول "شریف بیٹی" تخلیق کیا۔ اس ناول میں خواتین کو مضبوط بنانے کے لیے ایسا کردار پیش کیا۔ جس کے ذریعے خواتین میں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے لیے مالی مسائل پیدا کرنے اور خاندان کو مضبوط کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ انھوں نے اس دور کی خواتین کی صورت حال کا تجزیہ بہت گہرائی سے کیا۔ ہم جنسوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پرکھا کہ خواتین کے یہ مسائل صرف معاشرے کے پیدا کردہ نہ تھے۔ وہ خود بھی اپنی ذہنی اور علمی تربیت سے بہت سے مسائل سے بچ سکتی تھیں۔ وہ اپنی کاوش سے چار دیواری کے اندر بیٹھ کر معاش کا ذریعہ پیدا کر سکتی تھیں۔

اس دور کے ناولوں میں عورت کو ایک ایسی دیوی بنا کر دکھایا گیا تھا۔ جس پر حرکت و عمل کے سب دروازے بند ہو۔ گویا اس کا کام دوسروں کو خوش کرنا اور دل بہلانے کے سوا کچھ نہ ہو۔

"شریف بیٹی" ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا۔ محمدی بیگم نے اس ناول میں ہاتھ پاوں ہلا کر اپنے خاندان کی معاونت کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی جس سے خاتون خانہ اپنے گھر میں ہر معاشی ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہو سکتی ہے۔ شریف النسا کا باپ عبدالغنی بیس روپے ماہوار کا ملازم تھا۔ خدا کو پیارا ہو گیا۔ شریف النساء کو خدا نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ اس نے سلائی کشیدہ کاری کی بدولت گھر کی بدحالی کو آسودہ حالی میں بدل دیا۔ اپنی بیمار ماں کا علاج کرایا۔ دونوں بھائیوں کو تعلیمی سہولیات فراہم کیں۔ ایک بھائی بیرسٹر بنا اور ایک سول سرجن۔

"شریف بیٹی" جس وقت لکھا گیا اس دور میں خواتین کے لیے نظام تعلیم وضع کرنے کی بخشیں جاری تھیں۔ گھروں کے اندر باقاعدہ سکول تو نہیں تھے لیکن مندرجہ ذیل اقتباسات سے گھریلو مدارس کے نظام کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> آتی ہے۔ لوگ مجھے ملانی کہیں گے۔ [۲۰]

> اہل محلہ کو یہ شوق چڑھ آیا کہ جس طرح ہو شریفن کو اس بات پر رضامند کیا جائے کہ وہ ہماری لڑکیوں کو پڑھا دیا کرے بعض نے تو اسے گھر بلا کر پڑھانے کے لیے معقول تنخواہ بھی دینی کی۔ مگر اس غیرت مند لڑکی نے کسی کے گھر جا کر استانی بن کر پڑھانے سے قطعی انکار کر دیا۔ [۲۱]

نذر سجاد کے ناول آہ مظلوماں کی زبیدہ شریف النسا کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ معاشی بدحالی دونوں کا مقدر ہے۔ اگرچہ پلاٹ کی بنت میں فرق ہے۔ لیکن مرکزی موضوع میں دونوں مماثلت رکھتے ہیں۔ "آہ مظلوماں" کی زبیدہ مشکل حالات سے نبرد آزماہ ہے۔ شوہر کے گھر سے نکالنے کے بعد زبیدہ مایوسی کا شکار ہونے کی بجائے اپنے اور بچوں کے اخراجات سلائی کر کے پورے کرتی ہے۔ جب شوہر کی حالت تباہ کن ہو جاتی ہے۔ تب وہ نہ صرف گھر واپس

آکر ان کی خدمت کرتی ہے بل کہ گھر کے اخراجات بھی چلاتی ہے۔ دراصل نذر سجاد اور محمدی بیگم عورت کو نامساعد حالات کے دھارے میں بہتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ اسے معاشرے میں مضبوط اور بااعتماد عورت کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔

محمدی بیگم (صفیہ بیگم):

محمدی بیگم کا ناول صفیہ بیگم ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں بچپن کی منگنی کا عبرت ناک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی کو پیش کیا ہے جو قبیح رسم کی وجہ سے زندہ درگور ہو گئی۔ صفیہ ایک شریف خاندان کی تھی جو مسلسل ذہنی صدموں کے باعث حرکت قلب بند ہونے سے چل بسی۔

ناول کا مرکزی کردار صفیہ ہنر مند، عقل مند، ذمہ دار اور احساس طبیعت کی مالک ہوتی ہے۔ کم عمری میں ہی اس کی منگنی اس کے رشہ دار صفدر کے ساتھ طے ہو جاتی ہے۔ صفدر عمر میں بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ بری عادتوں کا بھی مالک ہوتا ہے۔ اور صفیہ کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر جب اس کو پتا چلتا ہے کہ صفیہ کسی اور سے شادی کر رہی ہے۔ تو وہ شادی والے دن اس کے گھر والوں سے اصرار کر کے اس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ آخر کار حساس طبیعت کی مالک ان واقعات کو برداشت نہیں کر پاتی اور بیمار ہو جاتی ہے۔ بیماری کی حالت میں مر جاتی ہے۔ محمدی بیگم کی ہیروئن اپنے معاشرے کی روایت کے سامنے کچھ نہیں کر پاتی۔ اور نہ ہی وہ اتنی طاقتور ہے کہ وہ ان سے ٹکر لے۔ آج بھی برصغیر میں ارینج میرج کو خاص طور پر پریشانی کا سبب سمجھا جاتا ہے۔

محمدی بیگم بچپن کی منگنی کی رسم کو خلاف شریعت سمجھتی تھی۔ وہ اس سماجی کوڑھ کو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے کاٹ کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ یہ قصہ صرف صفیہ ہی کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بل کہ اس دور کی ان بے شمار بے بس بیٹوں کی دبی دبی سسکیوں کی بھی غمازی کرتا ہے جو ان فرسودہ رسموں کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔ اس معاملے پر محمدی بیگم نصیحت کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

> اے بزرگو مت بیاہو اپنی بیٹوں کو بد چلن لڑکوں سے ورنہ تمھاری وہ بیٹی جس کی آنکھ میں ذرا سے مرضی کے آنسو دیکھ کر تم گھبرا جاتے ہو اور دوائیں سر میں لگاتے پھرتے ہو۔ تمام رات اور تمام عام دن رنج و غم میں گھلے گی اور لہو کے آنسو روئے گی۔ مت بیاہو اپنی بیٹی کو ایسے شخص کو ساتھ جس کو وہ دل سے پسند نہ کرتی ہو۔ ورنہ اس کی تمام عمر رنج و غم میں کٹے گی وہ خود روتی اور اوروں کو رلاتی رہے گی۔ [۲۲]

اس ناول کی بعض سطروں میں اس معاشرے کے عمومی رویے کا اندازہ ہوتا ہے۔

بیوی: تو آخر اب میں کیا کروں؟ میں تو جانوں، تہذیب نسواں میں اشتہار۔ کوئی نہ کوئی لڑکا تو مل ہی جائے گا۔ یہ اخبار عموماً بڑے معزز گھرانوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں جاتا ہے، جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے کہ جوان بیٹی بٹھار کھی ہے۔

میاں: "بٹھار کھی ہے، تو کیا کسی کے سر پر بٹھار کھی ہے؟ لوگ کہتے ہیں تو بکا کریں۔

اب ہم لوگوں کے کہے سے ڈر کر اسے کسی اندھے کنوئیں میں تھوڑا دھکیل دیں گے۔ [۲۳]

اس ناول کی فضا انگریزی تہذیب کے اثرات کو نفاست سے پیش کرتی ہے۔ لیکن انگریزی تہذیب کو براہ راست موضوع نہیں بنایا گیا۔ اور نہ ہی اس کی برائی دکھائی گئی ہے۔ صفیہ جب تصویر بنانے لگتی ہے تو اسے ماں کی طرف سے شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہسپتال کی مس تصویر بنانی بھی جانتی تھیں۔ انھوں نے اس کو بھی تصویروں کا شوق لگا دیا۔ اب دیکھو تو بیسیوں تصویریں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔ اپنے گھر والوں کی اور اپنی سہیلیوں کی سب تصویریں اتار رکھی ہیں۔ جو تصویر پسند آئے گی اس کی تصویر اتار کر رکھ لے گی۔ بہتیرا کہتی ہوں کہ صفیہ سب ہی کام کرنا مگر بت پرستی مجھے نہیں بھاتی ان بتوں میں جان کہاں سے ڈالو گی؟ بیوی وہ مجھ سے بحث کرتی ہے اور جانے کیا کیا حدیثیں بتا کر کہتی ہے کہ وہ اور تصویریں ہیں جن کا بنانا گناہ ہے۔ [۲۴]

ناول کے مکالمے اس قسم کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس میں اولاد کو محض ایک قول کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔

صفیہ کا باپ: "کیوں میں نے پہلی عید پر تمھیں روکا تھا یا نہیں؟ کہ تم اس قسم کے لین دین مت رکھو، جب لڑکا لڑکی جوان ہوں گے تب دیکھا جائے گا" صفیہ کی ماں: "میری تو جان جائے گی پر آن نہ جائے گی۔ ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، چاہے اس بچی کا نیک نصیبا ہو، چاہے تیرے، چاہے ڈوبے۔ دوں گی تو صفدر کو ہی بیٹی دوں گی۔ [۲۵]

اس دور میں شادی کے معاملے میں لڑکی کی رضامندی کو اہم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بھی ماں باپ کے غلط فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاتی تھی۔ یہ دکھ تمام مظلوم لڑکیوں کا مشترکہ دکھ تھا۔

یہ میرے دل کی کم زوری ہے اور اپنی بری بھلی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میں اس وقت اپنی جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھی ہوں۔ کاش میں سخت دل محض جاہل ان پڑھ لڑکی ہوتی۔ میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ خدا اور رسول کے احکام نہ پڑھے ہوئے کیوں کہ اگر مجھے علم نہ ہوتا تو مجھے یہ خوف بھی پیدا نہ ہوتا کہ ناموافق شوہر کے حقوق خدمت ادا نہ ہونے میں گنہگار ہوں گی یا اس برائے نام شادی کے بعد جو انجام ہو گا اسے میں کس طرح کاٹوں گی۔ اگر میں جاہل مطلق ہوتی تو مجھے اونچ نیچ کا مطلق خیال نہ ہوتا اور

اس واقعہ کے پیش آنے سے ذرا ملال نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو اس قدر کہ میری آرزوئیں مر جاتیں نہ کہ میں خود ہی مر جاتی میں خوش ہوں کہ میں اس دنیا سے جانے والی ہوں۔ [۲۶]

ناول کے ذیلی عنوانات میں بھی خواتین کے مسائل کی جھلکیاں با آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔

تم اپنی والدہ سمیت ان کے ہاں ہو آؤ۔ [۲۷]

شرم کی کیا بات ہے تمھاری اماں جو ساتھ ہوں گی، باتیں وغیرہ تو کریں گی تم حال دیکھ لینا۔ [۲۸]

اگر نہ جانے دوں تو کتنا برا مانیں اور جو جانے دیتی ہوں تو یہ اور نیا ڈھنگ ہے کہ کنواری بیٹی اور بیگانے گھر جائے۔ صفیہ تو نے ڈبو دیا، میں تو کہیں کی نہ رہی۔ [۲۹]

بوا تم اپنی امی جان کو شوق سے بلالو وہ میری بزرگ ہیں، مجھ ان سے کوئی پردہ نہیں۔ [۳۰]

خواتین کے اس قسم کے مسائل کو نذر نے بھی اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ہندوستانی سماج میں والدین اپنی مرضی اور پسند کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس طرح بچے اپنی پسند کی زندگی نہیں گزار پاتے۔ نتیجے میں کئی زندگیاں تلخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ یہ سمجھتی ہیں کامیاب رفاقت کے لیے دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ یہ سب ان کا شرعاً قانوناً حق ہے۔ کہ وہ اپنی پسند سے اپنی عمر بھر کے ساتھی کا انتخاب کریں۔ اپنے ناول "ثریا" میں اس معاشرتی مسئلے کو اٹھایا ہے۔ اپنے ایک دوسرے ناول "اختر النساء" میں وکیل کی زبانی بلا تحقیق شادی کی مزمت یوں کرتی ہیں۔

فخر نسواں ہند کو آپ نے تباہ کر دیا۔۔۔ بیٹی بلا تحقیق بیاہ دی۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ جاہل میاں اور تعلیم یافتہ بیوی میں نبھ جائے گی۔ [۳۱]

محمدی بیگم (آج کل):

محمدی بیگم کا آخری ناول آج کل ہے۔ یہ قصہ فہمیدہ کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ فہمیدہ بہت سی خوبیوں کی مالک سگھڑ سلیقہ شعار اور خانہ داری میں ماہر تعلیم یافتہ، خاندان بھر کی لاڈلی خاتون تھی۔ مگر اس کی ایک بری عادت آج کا کام کل پر ڈال دینا تھی۔ والدین نے یہ سوچ کر اس کی شادی کر دی کہ ان کی بیٹی کی یہ عادت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ مگر شادی کے بعد اس کا شوہر اس کے ناز نخرے اٹھانے میں ایسا الجھا کہ خود بھی نکما ہو کر رہ گیا۔ ان کا ہر کام تاخیر کا شکار ہو گیا۔ جائیداد اجڑ گئی اور اس کا بیٹا کوٹھے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ جب تک فہمیدہ کو ہوش آیا تب تک گھر برباد ہو چکا تھا۔ شوہر نے سب نتائج کا ذمہ دار فہمیدہ کو ٹھہرایا اور طلاق دے کر گھر بھیج دیا۔ اور اس کی لاپروائی کی وجہ سے دوسرا بیٹا بھی اس سے چھین لیا۔ ناول کا موضوع روزمرہ زندگی سے لیا گیا ہے۔ فہمیدہ اپنی شادی شدہ زندگی

بہت عیش و عشرت میں گزار رہی ہوتی ہے۔ "اس کی شاہانہ طرز زندگی، ہر وقت نوکر چاکر دست بستہ میرے سامنے حاضر کیا مجال کہ میں ہل کر پانی پی لوں۔ ہل کر پانی پینا تو درکنار جب چاندی کے کوڑوں میں میرے لیے پانی آتا تو اس پر کا سرپوش بھی خادمین اتارتی تھیں۔ میں کٹورا یا گلاس ہاتھ میں تھام کر منھ سے تو ضرور لگا لیتی تھی میرے لبوں پر پانی پیتے میں کسی قدر تری لگ جاتی تو اسے بھی ایک دوسری خادمہ رومال سے جھٹ پونچھ دیتی۔"[۳۲]

اس شان و شوکت میں زندگی بسر کرنے والی فہمیدہ مزید سست الوجود ہو گئی۔ اس کی کاہلی اس حد تک بڑھ گئی کہ گھر داری کے معاملات میں نوکروں کو حکم دینے میں پس و پیش کرنے لگی۔ اس کی بظاہر یہ معمولی سی عادت انجام کار اس کے لیے ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن گئی۔

آج کل کہانی کے کردار ایسی خامیوں کے ساتھ ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں جو عموماً جیتے جاگتے انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کہانی کی ہیروئن اعلیٰ اوصاف کی مالک ہونے کے باوجود ایک معمولی بشری خامی کی وجہ سے المیے سے دوچار ہوتی ہے۔ جس کا اظہار وہ دکھ بھرے انداز میں یوں کرتی ہے۔

> اگر مجھ میں یہ عادت نہ ہوتی کہ آج کا کام کل پر ڈالتی تو یقیناً میرا شوہر دوسرا نکاح نہ کرتا۔ اگر میں یوسف کے لیے ناشکروں کی طرح رنج نہ کرتی تو خدا مجھ سے میرا دوسرا بچہ بھی نہ چھینا۔ [۳۳]

فہمیدہ کے شوہر کا کردار روایتی کرداروں سے مختلف ہے۔ وہ ناول کے ابتداد میں جابجا فہمیدہ سے والہانہ وابستگی کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک حد تک اس کی تمام غلطیوں کو درگزر کرتا ہے لیکن فہمیدہ کی پے درپے کی غلطیاں اُسے بیوی سے بد دل کر دیتی ہیں یہاں وہ روایتی مرد کے تمام حربے آزماتے ہوئے فہمیدہ کو بہلا پھسلا کر میکے بھیج کر دوسری شادی کر لیتا ہے، اور ایک روز دھوکے سے دوسرا بیٹا بھی لے لیتا ہے۔ ناول کے آخر میں فہمیدہ تمام عورتوں سے نصیحت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ

> اے میری پیاری بہنوں میں نے اپنی جان عزیز کھو دی اور کچھ حاصل نہ کیا۔ اب میری جان جا کر یہ چند سطریں زندہ رہیں۔ ان پر تم عمل کرو اور ان سے تم کوئی فائدہ اٹھاؤ۔ [۳۴]

اگرچہ محمدی بیگم اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کے حق میں کام کرنے والی راہنما خاتون کے نام سے جانی جاتی ہیں، لیکن اس ناول میں انھوں نے خواتین کے ساتھ معاشرے کے استحصالی رویوں کو پیش نہیں کیا۔ بل کہ روز مرہ زندگی کے معمولات میں سے ایک عام سی عادت آج کا کام کل پر چھوڑ دینا کو کہانی کے انداز میں پیش کیا۔

نذر سجاد نے اپنے کسی بھی ناول میں اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا۔ نذر کی پڑھی لکھی ہیروئن اپنی تعلیم کی بدولت اپنی زندگی کو سنوارتی ہیں۔ ناول اختر النساء میں اختر النساء کی زندگی اس کی عمدہ مثال ہے کہ

کیسے وہ اپنی تعلیم کی بدولت معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرتی ہے اور نسوان ہند ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ آج کل کی فہمیدہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ناکام اور ناشاد رہتی ہے۔

طیبہ بیگم (انوری بیگم):

اس زمانے کی ایک اور خاتون ناول نگار طیبہ بیگم ہیں۔ وہ ایک محترک اور با عمل شخصیت تھی۔ نواب عماد الملک کی صاحبزادی تھی۔ انگریزی۔ عربی، فارسی، اور اردو زبان پر دسترس رکھتی تھی۔ انھوں نے حیدر آباد رکن کی "انجمن خواتین اسلام" کی بنیاد رکھی۔ عورتوں کو دست کاری سکھانے کے علاوہ ابتدائی تعلیم کی طرف بھی راغب کیا۔ سماجی بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "آل انڈیا لیڈیز کانفرس" کی صدر بھی منتخب ہوئی۔ ان کے دو ناول حشمت النسا اور انوری بیگم قابل ذکر ہیں۔

طیبہ بیگم کے ناول انوری بیگم کا موضوع نئے اور پرانے زمانے میں امتیاز پیدا کر کے قاری کو نئی تہذیب کی طرف مائل کرنا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اپنی خالہ زاد بہن قدرت سبحان بانو سے بچپن سے منسوب ہے۔ سجاد حسین ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ جو رسم رواج کے خلاف ہے، لیکن لیاقت النسا بیگم بغیر رسموں کے اپنی بیٹی قدرت سبحان کو سجاد حسین سے بیاہنے سے یہ کہ صاف انکار کر دیتی ہیں کہ وہ بغیر رسموں کے شادی نہیں کرے گی۔ اور قدرت سبحان کی نسبت معین الدین حیدر نامی شخص سے ٹھرادی جاتی ہے۔

اس دوران اس کی ملاقات اپنی چچی زاد بہن انوری سے ہوتی ہے۔ وہ اسے چاہنے لگتا ہے۔ جو نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ فطرت سلیم کی بھی مالک ہے۔ کاظم حسین بیٹے کی خواہش کے مطابق اس کا رشتہ انوری سے طے کر دیتے ہیں۔ سول سروس کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان واپسی پر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دو سال ہنسی خوشی گزارنے کے بعد ایک روز انوری بیگم دوران زچگی سجاد حسین کو داغ مفارقت دے کر جہاں فانی سے کوچ کر جاتی ہیں۔

اسی ناول کا دوسرا قصہ احمدی بیگم کا ہے جو انوری بیگم کو چھوٹی بہن ہے۔ جس کی منگنی جعفر حسین سے ہو چکی ہے۔ یہ بھی ایک تہذیب یافتہ اور جدید تعلیم سے آراستہ ایک لڑکی کا کردار ہے جو مدلل انداز میں سید صالح کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی جو وہ عورت کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ سید صالح کا کردار جمیلہ بیگم کے بھانجے کا ہے۔ جو پڑھنے کی غرض سے خالہ کے گھر رہائش اختیار کرتا ہے۔ عورت کے حوالے سے اس کے نظریات اس دور کے پدر سری سماج کی ذہنیت کے عکاس ہیں۔ احمدی کی صحبت کا اس پر اثر ہونے لگتا ہے۔ سید صالح ایک خود غرض انسان ہے احمدی کی قابلیت حسن اور دولت سے متاثر ہو کر شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر جعفر حسین اس کی راہ کا کانٹا ہے

جس کو راستے سے ہٹانے کے لیے احمدی سمیت تمام گھر والوں کو ان سے بد گمان کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ آخر کار ناکام ہو جاتا ہے احمدی بیگم، جعفر حسین کے ساتھ بیاہ کر رخصت ہو جاتی ہیں۔

طیبہ بیگم کا یہ ناول ایک مخصوص پس منظر کا حامل ہے یہ متحدہ ہندوستان کے امیر مسلمانوں کی اس معاشرتی زندگی کا عکس ہے جس میں ایک طبقہ جاگیر دارنہ طور طریقوں کا محافظ اور نگہبان ہے اور ایک نئی روشنی کا دل دادہ ہے۔اس جاگیر دانہ معاشرت کی جھلکیاں انوری بیگم میں بھی با آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ انوری بیگم کے گھر کا نقشہ یہ ہے کہ باہر کے نوکروں کے علاوہ گھر میں ایک چھوڑ تین تین مامائیں، ایک مغلانی، ایک مشاطہ اور تین چار چھوکریاں ان کے علاوہ۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> اسی وقت گاڑی کی آواز آئی لیاقت النساو بیگم نے روشن بی کو بی دوڑایا کہ جا کر سواری کو اتروالائے۔
> حیدری بیگم سواری سے اتریں سوسن اور روشن بی نے پردہ پکڑ لیا۔ یہ اندر تشریف لائیں۔ [۳۵]

یہ جاگیر دار طبقہ اپنی فرسودہ رسموں کا اس قدر امیر تھا کہ رشتوں کو رسموں کی بھینٹ چڑھا دینا ان کے نزدیک قابل فخر عمل بن گیا۔ رسوم کو برتنا ان کے نزدیک دنیادی عزت و قار اور نام و نمود کا وسیلہ تھا۔ اس صدی میں رسوم کو ترک کرنا خاندانی وقار کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

> میں کنبے کے خلاف کیونکر کر سکتی ہوں؟لوگ سب میرے مجھ کو تھوکیں گے۔۔۔ میں قرض کروں گی۔ اپنے کو بیچوں گی۔ مگر شادی بغیر رسموں کے ہر گز نہ کروں گی۔ [۳۶]

لیاقت النسا بیگم اس تہذیب کا ایک ایسا ہی کردار ہے جو ایسے جاہل و گنوار شخص کو بیٹی دینا یہ خوشی قبول کر لیتی ہے۔ جو رسوم کا پابند ہے مگر ایسے لائق اور پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹی رہنا منظور نہیں جو رسموں سے انکار کریں کیوں کہ اس دور کی ایک تہذیبی نفسیات بن چکی تھی کہ "خصم چھوٹے پن رسم نہ چھوٹے۔" اور نئی تو کیا رسم بھی کوئی چھوڑا ہے؟۔۔۔۔" [۳۷]

یہ رسوم مسلک کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ جن کے بغیر شادی بیاہ غم و خوشی غرض ہر قسم کی تقریب نا مکمل سمجھی جانے لگی۔ رسوم سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ "۔۔۔۔جو رسم نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ رسموں کو برا کہنا کفر بکنا ہے۔ بغیر رسموں کے شادی نہیں، وہ تو نکاح ہے۔۔۔" [۳۸]

طیبہ بیگم کا ناول اس ہندوستانی معاشرتی زندگی کا مرقع ہے جس کی معاشرت و اخلاق پر مغرب آہستہ آہستہ اثر انداز ہو رہا تھا۔ اور ہندوستانی تہذیب و اقدار مغربیت کے سیلاب میں نامحسوس انداز میں بہے جا رہی تھی۔ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی سطح پر کئی کردار آپس میں اقدار کی لڑائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں مشرق کا تہذیبی رنگ بھی ہے۔ اور مغربی تہذیب کا دل فریب اور جدید رنگ بھی اور ان دونوں کی آمیزش سے وجود میں آیا

ہوا ایک نیا تہذیبی امتزاج بھی جس کی اپنی ایک الگ سی شان ہے۔ انوری بیگم کی مصنفہ طیبہ بیگم نے ناول میں رجعت کی بجائے ترقی کی ہم نوائی کی ہے۔ اور اپنے ناول میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے جو مشرقی، دینی اور اخلاقی قدروں کے پابند بھی ہیں اور زمانے کے تقاضوں سے وابستہ بھی۔ ناول میں انوری اور احمدی دو ایسے ہی کردار ہیں جو انگریزی تعلیم کے ساتھ مشرقی اقداد اور مذہبی ارکان کے پوری طرح پابند ہیں۔ مشرق و مغرب کے امتزاج کا ایک عکس ملاحظہ ہو:

> ۔۔۔۔ ان کی لڑکیاں اکثر انگلستان کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر انگریزی لکھتی پڑھتی تھیں۔ اس کے علاوہ مشرقی السنہ مثلاً عربی و فارسی وغیرہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ انوری کی طبیعت زیادہ تر خانہ داری اور دست کاری کی طرف مائل تھی۔۔۔ [۳۹]

انیسویں صدی کی ہندوستانی عورت کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم تھا۔ نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے، مسائل سے نبرد آزمائی اور سماجی حیثیت کی برابری میں جو دقتیں عورت کو درپیش تھی ان سب کا حل تعلیم میں مضمر تھا۔ ایک آدرش معاشرے کو جس طرح کی بیوی اور خاندگی ذمہ داریوں سے بہ طریق احسن عہدہ برآ ہونے کے لیے جس طرح کی عورت کی ضرورت تھی۔ ''انوری بیگم'' والے جعفر حسین خان، سجاد حسین کو اس طرح بتاتے ہیں:

> وہاں کی بیویاں اپنے شوہروں کی مددگار اور پورے طور پر ہم دم اور انیس ہوتی ہیں۔ سب کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ امور خانہ داری کو بہ کمال سلیقہ و ہنرمندی انجام دیتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم عمدگی کے ساتھ کرتی ہیں۔ کفایت شعاری اور انتظام خانہ داری کے ساتھ ساتھ شوہر کی ہر دم مونس و غم خوار رہتی ہیں۔ گویا دنیا کی گاڑی کا بوجھ دونوں شانوں پر برابر رہتا ہے۔ اور میاں بی بی ہر چیز میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔۔۔۔ وہاں کی بیبیاں امور مملکت و سلطنت سے واقف ہوتی ہیں۔۔۔۔ بھلا بتایئے ایسی بی بی ہمارے ہاں لاکھوں میں ایک بھی ملے گی۔ [۴۰]

ہندوستان میں انیسویں صدی میں خواتین میں خواندگی کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس کی وجہ سے اس صدی کا پدرسری سماج تھا۔ جو عورت کی دماغی قوت کو علم اور لیاقت حاصل کرنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ عورت کی جہالت اور کم زوریوں کی وجہ مرد تھے۔ جو مغربی عورت کی تہذیب و شائستگی کے اسیر تو تھے۔ مگر مشرقی عورت کو تہذیب سکھانے کے حق میں نہ تھے۔ نتیجتاً عورتیں علم و عقل میں مردوں سے پیچھے تھیں۔

طیبہ بیگم اور نذر سجاد حیدر کے موضوعات کا تقابل کیا جائے تو بہت سے پہلو دونوں خواتین ناول نگار کے ہاں مشترک نظر آتے ہیں۔ طیبہ بیگم نے ''انوری بیگم'' میں بچپن کی منگنی کو موضوع بناتے ہوئے قصہ کی شروعات کی، جو بالا آخر ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے پر ٹوٹ جاتی ہے۔ قدرت کی دوسری جگہ نسبت اور شادی جہاں ایک طرف بلا

تحقیق بیاہ دیے جانے کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف بچپن کی منگنی کا شاخسانہ تھی۔ سجاد حسین کا انکار لیاقت النسا(قدرت کی ماں) کی انا پر ضرب لگاتا ہے۔ نتیجتاً وہ قدرت کو بلا تحقیق ایک برائے نام جاگیر دار سے جو شادی شدہ ہے کے ساتھ بیاہ دیتی ہے۔

نذر سجاد حیدر اپنے ناولوں میں براہ راست کوئی کردار تخلیق کر کے بچپن کی منگنی کا کوئی عبرت ناک قصہ تو بیان نہیں کرتی۔ البتہ اپنے افسانوں اور مضامین میں اس رسم کی شدت سے مخالفت کرتی ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے پلاٹ کی بنیاد ہی بغیر مرضی کی شادی (ثریا) بلا تحقیق شادری (اختر النسا بیگم) اور بے جوڑ شادی جیسے موضوعات پر رکھتی ہیں۔

ہمارے قصہ گو خواتین میانہ روی کا مسلک اپنانے کی تلقین کرتی ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ بعض جگہوں پر مغرب کے غلط طور طریقوں کی بے جا تقلید کے عبرت ناک نتائج بھی دکھاتی ہیں اور بعض جگہوں پر مذمت کرتی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کے ناول "نجمہ" میں نجمہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھیانک انجام مصنفہ کی اسی سوچ کا عکاس ہے۔ انوری بیگم کے کاظم حسین کی انگریزی لباس پر تنقید "خوب میں نہ سمجھا تھا کہ وہ اس قدر انگریزی رسموں پر فریفتہ ہو گئے ہوں۔" [۱۲] دراصل طیبہ بیگم کے اپنے انداز فکر ہی کی جھلک ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو عورت کو پیش آنے والی تمام پریشانیاں، ماحول سے مطابقت اور نئے ماحول کے سانچے میں ڈھالنے والی تمام دقتیں ان ناول نگار خواتین نے اپنے ناولوں میں پیش کیں، نا صرف پیش کیں بل کہ ان کے حل بھی بتایا۔ ناول نگار خواتین نے بے شمار کہانیاں لکھیں اور ان میں ایک جیسے مسائل کو موضوع بنایا اور مقصدی، واعظانہ و منطقی انداز اختیار کیا۔ عورتوں کے ان ناولوں میں زندگی کے نقش کا بڑا روشن، صاف، واضح اور مکمل نقشہ پیش کرنے کے ساتھ اس دور کی عورت کو ماحول سے ہم آہنگ و ہم واری کا سبق دیا۔ اور مضطرب زندگی کے لیے ایک ایسی معاشرتی زندگی کا تصور اور ضابطہ پیش کیا جو مرد و عورت کے لیے سکون و راحت کا باعث بنا۔ ان ناولوں میں ہمیں ایک ضابطہ حیات اور زندگی گزارنے کے واضح ڈھنگ کی جو تصویریں ملتی ہیں یہ مردوں کے ناولوں میں تقریباً ناپید ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اکبری بیگم۔گودڑ کالال۔ص۱۵۰۔

۲۔ ایضاً،ص۵۲۶۔

۳۔ ایضاً،ص۴۸۔

۴۔ ایضاً،ص۵۔

۵۔ ایضاً،ص۲۸۵۔

۶۔ ایضاً،ص۱۵۵۔

۷۔ ایضاً، ص۲۸۵۔

۸۔ ایضاً، ص۲۷۹۔

۹۔ ایضاً، ص۵۸۰۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً، ص۵۹۔۶۰۔

۱۲۔ طیبہ خسرو، "صغرا بیگم اور نسوانی دنیا" مشمولہ یاد صغرا ہمایوں مرزا مرتبہ مرزا سرفراز علی، (حیدرآباد: ۱۹۷۲ء)، ص۲۳۔

۱۳۔ صغرا ہمایوں، سرگزشتِ ہاجرہ، ص۱۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص۱۳۔۱۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص۲۰۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ایضاً، ص۴۷۔

۱۸۔ ایضاً، ص۷۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص۹۱۔

۲۰۔ محمدی بیگم، شریف بیٹی، ص۴۹۔

۲۱۔ ایضاً، ص۴۷۔

۲۲۔ محمدی بیگم، صفیہ بیگم (لاہور: تاج و حجاب دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۵۹ء)، ص۹۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص۳۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص۹۲۔

۲۷۔ ایضاً، ص۱۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص۱۱۔

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً، ص۱۷۔

۳۱۔ نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص۱۸۶۔

۳۲۔ محمدی بیگم، آج کل (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۰ء)، ص۶۔۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص۵۴۔

۳۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۳۵۔ طیبہ بیگم، انوری بیگم، ص۶۷۔

۳۶۔ ایضاً، ص۶۹۔

۳۷۔ ایضاً، ص۷۴۔

۳۸۔ ایضاً، ص۷۹۔

۳۹۔ ایضاً، ص۳۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۶۰۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۷۹۔

ماحصل

میرے مقالے کا موضوع نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ ہے۔ بات عورت سے اگر کی جائے تو تانثیت کا لفظ ذہن میں آتا ہے۔ تانثیت کیا ہے۔ ثانثیت کی اقسام کیا ہیں۔ لبرل یا آزاد خیال فیمنزم مشرقی فیمنزم وغیرہ کیا ہیں۔ عورت کی سماجی و سیاسی حیثیت جاننے کے لیے اگلے باب میں تاریخی ادوار کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے کے لیے زرعی انقلاب سے پہلے کے ادوار سے رجوع کرنا پڑا۔ جس سے یہ بات سامنے آئی کہ زرعی انقلاب کے بعد مادری تھا جس کا محور عورت تھی۔ وہ بچے جنتی اور زمین کی کوکھ سے فصلیں اگاتی۔ آسمانی باپ کا تصور بعد کی پیداوار ہے۔ جب مرد کی فوقیت عورت پر مسلم ہو گئی تو دھرتی ماں آہستہ آہستہ اپنے مقام سے گر گئی۔

البتہ مصر میں اس کا کچھ وقار باقی رہا۔ فراعین کی بیویاں عزت دار اور خود مختار سمجھی جاتی تھی۔ انھیں حکومت کے معاملات میں بھی عمل دخل حاصل تھا۔ یہ عورت کے لیے ایک اعلیٰ صدارت تھی ورنہ اکثر ممالک میں عورت گائے بیل کی طرح مرد کی ذاتی املاک سمجھی جاتی تھی۔ مرد نے اسے جنس کا بازار بنا دیا۔ سرِعام بولی دے کر بیچا جاتا۔ امرا اپنے دوستوں کو تحائف میں عورت پیش کرتے سلاطین کے حرم سراؤں میں جو کنیزیں رکھی جاتی ان کی نگرانی بے رحم خواجا سراؤں کو دی جاتی۔ عیسائیت کے غلبے اور قدیم مذہب کے خاتمے کے ساتھ دیویوں اور داسیوں کے اداروں کا خاتمہ ہو گیا اور عصمت فروشی نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔

اس کاروبار کی ڈور مردوں کے ہاتھ میں تھی۔ عورتیں دو گروہوں میں تقسیم کی گئی۔ پڑھی لکھی، خوب صورت اور باتمیز عورت جس کی سرپرستی سلاطین و امرا کرتے اور عام وہ جو عوام کا دل بہلاتیں۔ منکوحہ عورتوں کی حالت بھی کچھ کم خراب نہ تھی۔ شوہر کو بیوی پر مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ ذرا سے شک و شبے میں اسے جان سے مارنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے ناک اور کان کاٹ سکتا تھا۔ کنیز بنا کر فروخت کر سکتا تھا۔ سرکش عورت کو پیٹنے کا مجاز تھا لیکن اپنے لیے کوئی سزا مقرر نہ تھی۔ اسے ہر طرح کی آزادی میسر تھا۔ وہ کنیزوں سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔

مغرب کے پادریوں نے ایک عجیب طریقہ وضع کیا کلیسا کی عدالت امیر عورتوں پر جادوگر ہونے کا الزام لگاتی۔ ان پر مقدمہ چلاتی۔ اور طرح طرح کے عذاب دے کر ان سے اعتراف کرایا جاتا کہ خلوت میں ان کے پاس شیطان آتا ہے۔ اس کے بعد انھیں سرِعام شعلوں میں جھونک دیتے اور جائیداد پر قابض ہو جاتے۔ اس طرح لاکھوں بے گناہ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

امرا عورتوں کو برہمن بھی ستی ہونے کی ترغیب دیتے۔ کیوں کہ ان کی وت کے بعد سونے چاندی کے بھاری قیمتی زیور برہموں کو ملتے۔ اس معاشرے میں عورت شخصی املاک بن کر رہ گئی تو اس میں بلند حوصلگی حق گوئی اور حریت فکر کی صفات کس طرح پیدا ہوتی۔ مرد نے عورت کے تمام حقوق کو سلب کر کے اپنی ہوس کا کھلونا بنا دیا۔ تو عورت کی اپنی فطرت مسخ ہو کر رہ گئی اس کی صلاحیتیں فنا ہو گئی اور وہ اپنے اصل مقام سے بے خبر ہو گی۔ اس کے دل میں یہ بات گھر گئی کہ اس کے مستقبل کا انحصار شوہر کی حصول رضا ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد مرد کا دل بہلانا اور بچے جننا ہے۔ عورت زندگی بھر محرومی اور حسرت کی آگ میں جلتی رہی۔ ذرا سی لغزش پر اسے مکار اور ہوس پرست ہونے کے الزام لگائے جاتے۔ شاعری، داستان، قصوں اور لوگ کہانیوں میں بھی اسے نفس پرست، بے وفا، فریبی دکھایا جاتا۔ عورت پر مکر و فریب اور بے وفائی کا الزام لگانے میں فلاسفر، فن کار، ادیب، تمثیل نگار،

مصلحین، شاعر سب برابر کے شریک تھے، انھیں اس بات کا ذرا احساس نہیں ہوتا تھا کہ عورت کو مکر و فریب کے حربے مرد ہی نے سکھائے ہیں۔ عورت کے اخلاق کو پست کرنے میں مرد ہی کا ہاتھ ہے۔

نسل انسانی کے ارتقاء میں عورت کے حالات جاننے کے بعد ہم ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کیا تھی اسے کس نشیب و فراز سے گزرنا پڑا یہ دیکھتے ہیں ابتدائی دور میں ہندوستان کی آریائی تہذیب مادری تہذیب تھی۔ آریا لوگ اس عہد میں ہندوستان میں خانہ بدوش کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ جاگیر دارانہ نظام کی بنیاد ابھی نہیں پڑی تھی۔ اس لیے عورت کا سماجی مرتبہ بلند تھا، لیکن آہستہ آہستہ عورت کی برتری کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا ایک اہم سبب برہمن کا عروج بھی تھا۔ سماج میں تفریق پیدا ہو گئی۔ عورتوں کو اچھوت کے زمرے میں شامل کر دیا اور تعلیم سے بھی محروم کر دیا۔ اس کے بعد بدھ مذہب وجود میں آیا۔ جو دراصل ہندو مت کے خلاف ایک شدید رد عمل تھا۔ عورت کے وجود کو جو برہمن کے دور عروج میں مٹا دیا گیا تھا۔ بدھ نے تسلیم کیا۔ بدھ کی سماجی و مذہبی اصلاحات کا اثر عورت کے لیے کسی حد تک خوش گوار ثابت ہوا۔ لیکن بدھ مت کے زوال کے باعث معاشرہ ہر اعتبار سے روبہ زوال ہوا۔ سماجی حالات میں ایک بار پھر تبدیلی پیدا ہوئی۔ طوائف کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مقبولیت کا اثر گھریلو عورت پر بھی پڑا اور سماج میں عورت کے دو طبقے سامنے آئے۔ ایک طوائف جو معاشرے میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری بیوی جو ایک معزز خادمہ سے بلند نہ تھی۔ تعددِ ازواج کی رسم بھی اسی عہد میں وجود میں آئی۔ عقدِ ثانی کا حق جو بیوہ کو پہلے حاصل تھا لے لیا گیا۔ ہندوستانی تہذیب کے زوال کے ساتھ ہی عورت کی سماجی حیثیت بھی انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ کم سن بچیوں کی شادی کا رواج عام ہو گیا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کا قیام بارہویں صدی کے اختتام میں ہوا۔ ابتدا میں مسلمان عورت کی حالت ہندو عورت سے قدرے بہتر تھی۔ اس لیے کہ اس کا تعلق فاتح حکمران قوم سے تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہندو معاشرت کا اثر مسلمانوں پر پڑنے لگا۔ اور ان کا بھی عورتوں کے ساتھ رویہ ہندوؤں جیسا ہو گیا۔ ان عورتوں کی بھی حالت ہندو عورتوں سے مختلف نہ رہی عورت کا سماجی رتبہ بتدریج پست ہوتا گیا۔ دہلی کا سیاسی زوال اخلاقی پستی کا بھی باعث بنا۔ عیاشی کا رجحان بڑھا اور مسلم معاشرے میں بھی طوائف کو پھلتے پھولنے کا موقع ملا۔ لیکن طوائف کا یہ رجحان امرا طبقے تک ہی محدود رہا کیوں کہ عوام الناس عام طور پر غریبی و مفلسی کا شکار تھے۔ اس عہد کے سیاسی زوال اخلاقی پستی کے سبب عورت کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس کی حیثیت میں بھی کمی آ گئی۔

اودھ کی حکومت کو عروج دہلی کے زوال کے ساتھ حاصل ہوا۔ لکھنوی تہذیب میں اخلاقی انحطاء دہلی سے زیادہ نظر آتا ہے کیوں کہ یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ رنگین مزاجی کا رجحان جو دہلی میں امرا طبقے تک محدود تھا نہ رہا

اور عوام کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ عورت مرد کے لیے محض آلہ تفریح بن کر رہ گئی۔ پردے کے رواج کی بنا پر دل بہلانے کا ذریعہ طوائف بن گئی۔ شاعری کا سرمایہ بھی طوائف پر مشتمل ہو گیا۔ غزل، مثنوی میں بھی یہی طوائف نظر آنے لگی۔

ہندوستان میں سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اعتبار سے تبدیلیاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پیدا کی۔ قدیم و جدید کی آمیزش ظہور میں آئی۔ سرمایہ دارانہ اور صنعتی تہذیب کا آغاز ہوا۔ اس دور کی اصلاحی دور کہا جاتا ہے۔ مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں اس دور میں شروع ہوئیں کسانوں اور مزدوروں کو اپنے حقوق کی پامالی کا احساس دلوایا۔ وہی عورت کو بھی ہزاروں برس کی غلامی سے نجات دلائی۔ صنعتی انقلاب نے عورت کے سامنے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ اب وہ علم اور عمل کے ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔ انقلاب نے ثقافتی اور تاثراتی سطح پر بھی اک الگ صورت حال کو جنم دیا۔ برصغیر عصر جدید میں داخل ہوا۔ نئے تعلیم اداروں اور طریق تعلیم نے ہندوستان میں ترقی کی راہیں کھولیں۔ یورپی اقوام کے قرب میں توہمات کی جگہ سائنسی، عقیدت کی جگہ عقلیت اور رسوم و رواج کی تقلید کی جگہ اصلاح کا رجحان پیدا کیا۔ ہندو میں آریا سماج پرارتھنا سماج، رام کرشن اور مسلمانوں میں سرسید تحریک، سید احمد شہید کی تحریک جیسی بہت سی معاشرتی تحریکیوں نے زندگی کے متعلق تمام قدیم رویے یکسر بدل کر رکھ دیئے۔ اس کا بالخصوص اثر اردو ادب پر پڑا۔ کہانی اور داستان ماورائی فضا سے نکل کر ارضی حقائق کی راہ کی طرف گامزن ہوئی۔ معاشرے کی ناقدانہ عکاسی نے باقاعدگی کا رجحان اختیار کیا تو ناول کی صورت سامنے آئی۔

ناول نگاری کے فن میں نذیر احمد کا اپنا ایک اکتساب تھا۔ اسی نے سرشار کو ناول نگاری کا ایک شعور عطا کیا۔ ناول نگاری کو نئی منزل کا پتا دیا۔ ناول کی روایت کا ابتدائیہ نذیر، سرشار اور شرر نے لکھا۔ افسانوی دنیا میں نذیر احمد کو یہ امتیاز حاصل رہے گا کہ انھوں نے عورت کے کردار اور مسائل پر سب سے پہلے توجہ دی۔ اس سے قبل عورت کا تذکرہ تو بہت تھا۔ لیکن ایک طوائف اور محبوبہ کی شکل میں عورت کے وجود کی دوسری تصویریں بیوی، بہو اور بیٹی ادب میں ناپید تھی۔ ہمارے معاشرے میں عورت ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے جسے تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ احساس سب سے پہلے نذیر احمد نے دلانا شروع کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ عورت کی اہمیت کو گھر کی فضا کی تعمیر میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اصغری ایک مثالی تصویر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نذیر احمد کے تمام ناولوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔ بنات النعش اور مراۃ العروس براہ راست تعلیم نسواں کی تحریک سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ تعلیم کے بارے میں نذیر احمد کا نقطہ نظر یہی ہے کہ تعلیم ہر عورت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے خانہ داری کے فرائض انجام دینے کے قابل ہو سکے۔

نذیر احمد نے خواتین کو جن ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی تعلیم دی۔ وہ اس معاشرتی پس منظر میں کچھ نئی نہیں کھانا پکانا، گھر کی دیکھ بھال، گھر کے اخراجات، مذہب کی تعلیم ہمارے معاشرے میں صرف اتنا سا اضافہ کیا کہ انھوں نے تمام معاملات میں تہذیب، تنظیم، سلیقہ مندی پیدا کرنے پر زور دیا۔ وہ ایک نئے سماج کی تشکیل کے آغاز میں ہی عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عورت کو معاشرے کی نظروں میں ایک کارآمد انسان بنانے اور منفی رویوں سے بچانے کی کوشش کی۔

رتن ناتھ سرشار نے بھی تعلیم کے بنیادی مسئلے پر اظہار خیال کیا۔ وہ بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے تصورات نسواں کا ایک مثالی نمونہ ''فسانہ آزاد'' کی ہیروئن حسن آرا ہے۔ اس کردار کی گفتگو سے سرشار کے ذہن میں جو تعلیم نسواں کا معیار تھا عیاں ہوتا ہے۔ وہ شادی کے معاملے میں بھی خواتین کی آزادی رائے کے قائل تھے۔ اس معاملے میں آکر ان کی سوچ نذیر احمد سے کچھ الگ ہو جاتی ہے۔ ان کی ہیروئن حسن آرا، میاں آزاد کا انتخاب خود کرتی ہے۔ البتہ عورتوں کے معاشرتی منصب کے بارے میں سرشار کے خیالات نذیر احمد اور سرسید کے خیالات کا عکس ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے بھی سرسید کے اصلاحی پروگرام سے اثر قبول کیا۔ انھوں نے دو سماجی ناول بدرالنساء کی مصیبت اور آغا صادق کی شادی بھی لکھے۔ ان کے ناولوں میں متوسط طبقے کی عورتوں کی اصلاح کا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ بہت سی خامیاں عورتوں کے مزاج میں راسخ ہو چکی ہیں اور ان خامیوں کا اثر ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر پڑ رہا ہے۔ شرر اپنے ناول خوف ناک محبت میں جاگیر دارانہ معاشرت میں پلی ہوئی عورت کا کردار پیش کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ جاہل اور ناتربیت یافتہ عورتیں معاشرت کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔ ان کے نزدیک جہالت اور غلط تربیت کی وجہ سے عورتوں میں وہ تمام صفات معدوم ہو گئی ہیں۔ جن کی بدولت اعلیٰ کردار کی تخلیق ہوتی ہے۔ نذیر احمد اور سرشار ناول کے تشکیلی دور کے وہ نور گوشے ہیں جن کی روشنی میں آنے والے ناول نگاروں نے اپنی راہ متعین کی۔

موضوع کے حوالے سے تینوں ادیبوں کا ایک ہی مقصد تھا۔ وہ معاشرتی اصلاح تھا۔ انھوں نے تین اہم طرزیں وضع کیں۔ اجتماعی تہذیبی ناول، تاریخی ناول اور معاشرتی اصلاحی ناول۔

نذیر احمد، سرشار اور شرر کے بعد راشد الخیری کا نام سامنے آتا ہے۔ انھوں نے عورت کی معاشرتی حیثیت کو بلند کرنے کی نذیر احمد سے زیادہ سعی کی۔ عورت کے مسائل کے بارے میں وہ ایک ہم دردانہ جذبے کی روش کو ناول کا حصہ بناتے ہیں۔ اور بجا طور پر عورتوں کے سرسید اور مصور غم کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد رسوا آتے ہیں۔ امراؤ جان

ادا اردو ناول کی روایت میں عام ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ تھا۔ یہ واجد علی شاہ کا لکھنو تھا۔ اور امراو اس مخصوص تہذیب کی کہانی تھی۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جو طوائف کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ یہ معاشرہ طوائف کے بغیر نہ تو زندہ رہ سکتا تھا اور نہ ہی اسے گھر بلا سکتا تھا۔ اس دور میں مرد اخلاقی معیار کی پستیوں میں گھر گیا اور اس کا اثر عورتوں کے کردار پر بھی ہوا۔ چناں چہ اس دور کی تحریب میں عورتوں کی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رسوا نے اپنے عہد کی تقریباً تمام طبقات کی عورتوں کو پیش کیا ہے، لیکن زیادہ تر نچلے طبقے کی عورتوں کی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ نچلے طبقے کی عورت کا لکھنو کی تہذیبی معاشرت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں زبردست کردار رہا ہے۔ کیوں کہ لوگوں کی کم زوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کو لوٹنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ جہالت اور افلاس کی وجہ سے یہ عورت اپنے مقام سے اتنا گر جاتی ہے کہ معاشرے کو بربادی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔

طوائف کے ادارے کو زوال کی ایک اہم وجہ قرار دیا گیا۔ قومی اصلاح اور تعمیر کی تحریکیوں نے اس پیشے کو عورت کی تذلیل قرار دے کر عورت کو اس سے نکالنے کے لیے نعرے بھی بلند کیے۔ خواتین کے کردار کا یہ رخ بھی ناول کا موضوع بنتا رہا۔ اس سماجی مسئلے کو سلجھانے کی کوشیش ہوتی رہی۔ لیکن ناسود ثابت ہوئی۔ طوائف کی زندگی کے نشیب و فراز پیش کرنے کے لیے کئی ناول لکھے گئے۔

سرفراز حسین کا ناول شاید راعنا اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس کے بعد ناول نگاری کے عہد میں شخصیت اور انفرادیت کا ایک نیا تصور ملتا ہے۔ یہ رومانویت کی ابتدا تھی۔ ایک ایسا نوجوان طبقہ سامنے آرہا تھا جو جذباتی و ذہنی ناآسودگی کا تضادات کا شکار ہو کر ذہنی سطح پر باغیانہ رویہ اپنا رہا تھا۔ آزاد خیالی کی شکل میں زندگی کے بارے میں ایک رومانی رویہ پروان چڑھنے لگا۔ اس کا سب سے پہلا ادبی اظہار سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں سے ہوا۔ رومانویت کے زیر اثر جتنا بھی ادب تخلیق ہوا اس میں زیادہ تر لذت پرستی کے تحت عورتوں کے کچھ مخصوص رویے سامنے آئے۔ عورت کئی لائق پرستش کئی حور کئی وجہ سپردگی اور کئی مرد کی بے قراری کا وسیلہ بنتی نظر آئی۔ رومانوی ادیب عورت کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے عملی اقدامات کی بجائے خواب و خیال کا سہارا لیتا رہا۔ عورت کے حسن و عشق اس کے خاص موضوعات رہے۔ اس میں توازن نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں عورت ایک وجود کے طور پر نہیں بل کہ تصور کے طور پر معاشرے میں اہم بن گئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں تعلیم یافتہ خواتین کا ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جس میں خواتین پر ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف قلمی محاذ قائم کیا۔ اس زمانے میں کئی رسالے بھی ایسے شائع ہوئے جو خواتین سے مخصوص تھے۔ ان میں تہذیب النسواں (لاہور) خاتون (علی گڑھ) اور عصمت (دہلی) خاص اہمیت کے حامل

ہیں۔ محمدی بیگم "تہذیب نسواں" کی ایڈیٹر تھی۔ ان رسائل میں لکھنے والوں میں سے اکثریت خواتین کی تھی۔ ان رسالوں کا مقصد عورتوں میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی عورتوں میں علمی مذاق پیدا کرنا تھا۔ بہت جلد یہ رسائل ہندوستان کے متوسط اردو دان گھرانوں میں پہنچنے لگے۔ تعلیم یافتہ خواتین میں تصییف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ دیکھتے دیکھتے انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنے شروع کر دیے۔ خواتین نے خود بھی اپنے مسائل کے بارے میں لکھا اور مرد ادیبوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

اس کے علاوہ مختلف انجمنیں بھی قائم کی گئی۔ جلسے بھی منعقد کیے گئے مدرسہ نسواں علی گڑھ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ آزادئ نسواں اور حقوق نسواں کی تحریکیں چل پڑی۔ خواتین نے مضامین اور ناولوں کے ذریعے اصلاحی رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی تیس(۳۰)پنتیس(۳۵) سال تک خواتین کی ناول نگاری اسی اصلاحی مقصد کا اظہار کرتی ہے۔

رشیدۃ النسا بیگم پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ناول لکھنے کی ابتدا کی۔ یہ ناول اصلاح النساء کے نام سے لکھا گیا۔ اس کا موضوع اور مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ رشیدۃ النساء کے ناول کے بعد مسز مولوی سراج الدین کا ناول ناول رکن کے نام سے سامنے آیا۔ اس ناول کے کرداروں میں مشرقی و مغربی تعلیم و تہذیب کے بہترین عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کے بعد محمدی بیگم اور پھر خواتین کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ان میں اکبری بیگم، صغرا ہمایوں، ا۔ض۔ حسن بیگم، بیگم شاہ نواز، عباسی بیگم، طیبہ بیگم اور نذر سجاد قابل ذکر ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خواتین کی ناول نگاری بنیادی طور پر نذیر احمد کی روایت کی ترقی یا تجدید ہے۔ لیکن تمام خواتین ناول نگاروں پر ہم یہ کلیہ لاگو نہیں کر سکتے۔ کچھ ناول نگار نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثر سے بالکل آزاد ہیں۔

ابتدائی خواتین ناول نگاروں کے ناول میں ایک بڑی خوبی سماجی و تہذیبی زندگی کی پیش کش ہے۔ اس دور کے گھرانوں کی فضا شادی بیاہ کی تقریبات کی زندہ اور حقیقت پسندانہ تصویریں ملتی ہیں۔ اکثر ناولوں میں اعلیٰ مسلم خاندان کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کے عناصر سے آراستہ تھے۔

ناول کی صنف میں عورتوں نے جس قدر اہم اور دقیع کارنامے سر انجام دیے وہ کہیں اور نہیں ملتے۔ خواتین ناول نگار مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مشرقی قدروں کو بھی اپنانے پر زور دیتی ہیں۔ یہ رجحان صغرا ہمایوں کے ناول زہرا یا مشیر نسواں سے لے کر بیگم ا۔ظ۔ حسن، کے روشنک بیگم تک سبھی کے پاس ملتا ہے۔

"زہرا" میں انگریزی وضع پر آراستہ مکان بھی ملتے اور صغرا اپنے ناول سرگزشت ہاجرہ میں تہذیبی امتزاج کو کردار کے ذریعے ظاہر کرتی ہیں۔ وہ اپنی ہیروئن کو مشرق و مغرب دونوں کے آداب مجلس میں ماہر کر دیتی ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کو اپنانے کا جذبہ بھی بہت سے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ روشنک بیگم کا ہیرو ہمایوں دس برس تک انگلستان میں رہتا ہے۔ لیکن وہ صوم صلوۃ کا پابند ہے۔ وہ مغربی لباس کو اختیار کرنا اسلام کے منافی نہیں سمجھتا۔ وہ ہندوستان کی لڑکیوں کے موسیقی سیکھنے کو ہنر خیال کرتا ہے۔ اچھے عناصر خواہ وہ مغربی تہذیب کے ہو یا مشرقی حاصل کر لینے کا جذبہ تمام ناول نگاروں کے ہاں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ البتہ مذہب و اخلاق کی پابندی پر ہر ناول نگار نے زور دیا۔ مشرقی اقدار کے ساتھ مغربی تہذیب کی اہمیت کو ظاہر کر کے خواتین ناول نگاروں نے دونوں کے امتزاج کی ضرورت کو نمایاں ہے۔ اور اس مسئلے کو انھوں نے روزمرہ کی گھریلو زندگی کے تعلق سے دیکھا اور دکھایا۔ اپنے آپ کو مخصوص دائرے میں رکھنے کی وجہ سے خواتین کی ناول نگاری میں حقیقت و واقعیت آجاتی ہے۔

ایک محدود دائرے میں رہنے کی وجہ سے ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہے کہ خواتین کی نظر ملک و قوم کی سیاسی تبدیلیوں پر نہ تھی۔ سیاسی تبدیلیوں اور سیاسی واقعات سے واقفیت کا ثبوت اس دور کی ناول نگاروں نے دیا ہے۔ جیسے نذر کے ناول "جاں باز" کا موضوع وطن پرستی ہے۔ ان کی ہیروئن ملک کی جدوجہد آزادی میں شامل ہوتی ہے۔ اور اس وقت کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیتی ہے۔ انھی مسائل کا بیان بعض دوسری اور خواتین کے ہاں بھی ملتا ہے۔ جیسے ''سرگوشت ہاجرہ'' میں صغرا ہمایوں نے اس وقت کی سیاسی ہلچل کو پیش کیا۔ خواتین ناول نگاروں کے سیاسی مسائل بھی پیش کیے لیکن مجموعی طور پر ان کے ناول کا موضوع معاشرتی و سماجی زندگی ہی رہی۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے خواتین نے اپنے ناولوں میں معاشرتی زندگی کی تصویریں اور مسائل کو نہ صرف کامیابی سے پیش کیا بل کہ نئی نسل کو ایک الگ راہ بھی دکھائی۔ کئی ناول نگار خواتین نے گھریلو زندگی میں پیش آنے والے مسئلوں کو محسوس کیا اور کرایا۔ عورتوں کی مجبوری لاچاری اور بے بسی کو دیکھ کر خواتین میں بے داری، شعور اور اصلاح کے جذبات ابھرنے لگے۔ یہ مغربی تعلیم کا اثر تھا کہ عورتیں اپنی روایتی زندگی سے ہٹ کر نئی چیزوں کو اپنانے کے لیے غور و فکر کرنے لگی۔ جلسوں، سیاسی کاموں اور تحریک کا آغاز کر کے جدوجہد کی بھیڑ میں شامل ہوئیں۔ رفتہ رفتہ جاگیر داری نظام کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ البتہ دولت مند طبقہ جاگیر دارانہ نظام کو کئی نہ کئی گلے لگائے بیٹھا تھا اور یہی طبقہ غلط رسموں کا نگہبان بھی نظر آتا ہے۔ اس طبقاتی نظام کا مکمل عکس خواتین ناول نگاروں نے بڑی کامیابی اور دل کشی کے ساتھ اپنے ناولوں میں اتارا ہے۔ جو یقیناً مردوں کے ناولوں میں نہیں ملتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خواتین ناول نگاروں کا یہ دور سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ مشرق و مغرب کا تہذیبی ٹکراو اور کش مکش کی تبدیلیاں نمایاں طور پر ان کے ناولوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان خواتین نے ان تبدیلیوں کی عکاسی اور نئے شعور کی رائیں ہم وار کر کے اس کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید تبدیلیوں میں خود کو مدغم کر سکیں۔ ان ناول نگار خواتین نے ایک نیا ذہن اور ایک نئے شعور کا احساس پیدا کیا۔

خواتین کی قصہ نگاری کی روایت میں ایک اور اہم نام نذر سجاد حیدر کا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۰ء میں چودہ برس کی عمر میں اپنا پہلا قصہ اختر النساء بیگم لکھا۔ ان کا دوسرا قصہ مذہب و عشق تھا۔ ان کا ناول آہ مظلوماں کسی خاتون کا تحریر کردہ اردو زبان کا پہلا ناول ہے۔ نذر سجاد ہندوستان میں آزادئ نسواں کی ایک متحرک رکن تھی۔ ان کی تمام تحریریں آزاد خیال نسوانی کرداروں کے سبب منفرد اور اہم قرار دی گئی۔ وہ اپنی تحریروں میں ایک مخصوص طبقے کے ذہنی پس منظر کی عکاسی کرتی ہیں۔

نذر سجاد حیدر تانیثی سوچ و فکر کی مالک ہیں۔ ان کی تحریریں اور منتخب موضوعات ان کے نسائی خیالات کے ترجمان ہیں۔ خواتین کے جذبات و احساسات اور مسائل کو نذر سجاد مقابلتہً زیادہ دل آویز و دل کش انداز میں اپنے ناولوں کا حصہ بناتی ہیں اور ایک عورت ہونے کے ناطے سماج میں عورت کی حیثیت کا پرچار کرتی ہیں۔ رسوم و روایات تلے جکڑ کر اسے بے حیثیت کرنے کی ریت عام تھی۔ وہ اپنے ناولوں میں صرف عورت کی محکومیت کے نقشے ہی نہیں کھینچتیں بل کہ اسے سوچ و فکر کی بنیاد بھی فراہم کرتی ہیں۔ ان کے ناول اختر النساء بیگم، نجمہ، ثریا ، حرماں نصیب، جاں باز، مزہب اور عشق، آہ مظلوماں، شہید وفا، دُکھ بھری کہانی، موضوعاتی و فکری، ہر اعتبار سے عورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ناول اختر النساء بیگم کا اہم کردار اختر النساء بیگم ہے۔ اختر کے والدین پڑھے لکھے اور جدید خیالات کے حامی ہیں۔ اختر اپنی سلیقہ شعار ماں کے زیرِ تربیت آٹھ سال گزارتی ہے۔ ماں کی موت کے بعد باپ کی دوسری شادی کے نتیجے میں اختر سوتیلی اَن پڑھ ماں کی بے رخی کا شکار ہو کر ایک بے جوڑ شخص سے منسوب کر دی جاتی ہے جس پر اختر کبیدہ خاطر ہو کر کہتی جس شخص سے وہ بیاہی جا رہی ہے اس کی عادات و مزاج، تعلیم و خیالات سے آگاہی تو درکنار نام تک نہیں معلوم۔ اختر کی رنجیدگی اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ وہ اپنے طبقے کی بے بسی اور مظلومیت کو محسوس کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسٹر وقار و مسز وقار اپنی لڑکیوں کی نسبت طے کرتے وقت ان کی رائے لینا ضروری سمجھتے ہیں تو اختر معاشرے کے استحصالی اور ناانصافی پر مبنی اصولوں کے خلاف اپنے خالہ اور خالو کے اقدام کو قابلِ تحسین گردانتی ہے۔ اختر النساء بیگم کے کردار کی تشکیل کے ذریعے نذر معاشرے میں عورت کے لیے استحصال سے ماورا حیثیت حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں۔

سسرال میں اختر پر ظلم و ستم اور گھٹن بھرا ماحول دراصل رفیق احمد کی دوسری شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قباحتوں کا ہی شاخسانہ ہے۔ اختر کی زندگی میں گھلنے والی تلخیوں کا ذمہ دار ناول نگار اختر کے والد کی دوسری شادی کو قرار دیتے ہوئے سماج سے اس رسم کی اصلاح چاہتی ہیں۔ اس ضمن میں مسز وقار اور ستارا کے مکالمے کی نذر ی اسی حسیّت کا احساس دلاتے ہیں۔

بیوہ کی زندگی ہندوستانی عورت کی زندگی کا ایک اور کرب ناک پہلو ہے۔ اختر کی بیوگی کی زندگی میں نذر نے ہندوستانی بیوہ عورتوں کی مظلومیت، محرومیت، ذلت اور درد و کرب کے نقشے کھینچے ہیں۔ اختر کا یہ کہنا کہ آپ نہیں جانتے کہ ہندوستانی بیوائیں کس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں، بیوگی کی اذیت کا عکاس ہے۔

نذر اس بے بسی اور گھٹن کے ماحول میں اختر کو کم زور نہیں ہونے دیتی بل کہ حالات کے تھپڑ نذر کی ہیروئین کو طاقت ور بنا دیتے ہیں۔ نذر عورت کی اس محرومی اور بے بسی کی تصویر تو دکھاتی ہیں جس میں معاشرے نے اسے جکڑ رکھا ہے، لیکن بے بسی اور محرومیت کی زندگی جینا نہیں سکھاتی۔ وہ متحدہ ہندوستان کی عورت کو با اعتماد، باوقار اور تعلیم یافتہ عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ایسی عورت کا تصور دیتی ہیں جو فیصلہ کرنے کی اور کم زور حالات میں بہہ جانے کی بجائے اپنا اور دوسروں کا سہارا بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اختر کا تلخ حالات میں تعلیم کے سلسلہ کو بحال کر کے انسپکٹر مدارس تعلیم کے عہدے تک پہنچانا اور خود کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کرنا نذر کے اسی تصور کی دین ہے۔

کا علم بردار ہے اور عورتوں کے حقوق کے لیے متحرک عمل ہے۔ مسز وقار ہر اس رواج اور عمل کے خلاف ہیں جو عورت کو بے حیثیت کر کے محکومیت کے درجے تک لے جاتا ہے۔ نذر سجاد عورتوں کے مسائل، جذبات و احساسات کو بڑی عمدگی سے پیش کرنے کے ساتھ اس کے مسائل کا حل تعلیم نسواں کو قرار دیتی ہیں۔

نذر آزادی اور تعلیم کو عورت کے لیے ضروری تو قرار دیتی ہیں مگر اس بے راہ روی کے خلاف ہیں جو عورت کی نسوانیت کو تباہ کر دے۔ نجمـــــہ مصنف کا ایک ایسا ہی ناول ہے جس میں انھوں نے مغربی تعلیم کو فیشن پرستی سمجھنے کا غلط انجام دکھایا ہے۔ نجمہ مغربی تعلیم یافتہ نئے زمانے کی لڑکی ہے اس کے خیالات بھی نئے ہیں۔ جمیل سے اس کی ملاقات مسوری میں ہوتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں مگر جب کامران نامی شخص نجمہ کی طرف بڑھتا ہے وہ جمیل سے کنارہ کش ہو کر کامران سے منسوب ہو جاتی ہے۔ کامران ایک انتہائی روشن خیال اور عیاش پرست کردار ہے جس کے ساتھ منسوب ہو کر نجمہ اپنا نسوانی وقار کھو دیتی ہے۔ کامران کی خوش نودی حاصل

کرنے کے لیے اس کے ساتھ آزادانہ گھومتی اور ناچ گھروں میں رقص کرتی لیکن جلد ہی کامران کا دل نجمہ سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ جب تک نجمہ کو جمیل کی قدر معلوم ہو وہ شادی کر چکا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک محروم حسرت و یاس سے بھری تشنہ زندگی کسم پرسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ نذر کا یہ کردار ایک الٹرماڈرن کردار ہے جو اپنی نادانی اور روشن خیالی کی رو میں بہہ کر اپنی زندگی گنوا بیٹھتا ہے۔

نذر سجاد حیدر عورت کی بے باکی کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ ایک عورت میں مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات کا امتزاج دیکھنا چاہتی تھی اور معاشرتی قدروں اور آزادی کی حدود کے احساس کے ساتھ عورت کے لیے اظہار رائے کی آزادی کی داعی تھی مگر مشرقی روایات پر آزادی عورت کو درکنار مرد کو بھی دینے کی مجاز نہ تھی۔ بالخصوص شادی کے معاملے میں فریقین کی رضا یا مرضی کو گناہ اور بے شرمی سے تعبیر کیا جاتا۔ نتیجے میں کئی زندگیاں تلخ و بے مزہ ہو کر رہ جاتیں۔

شکیلہ اور جمیل کی شادی انھی خاندان روایات کی دین ہے جس کے سامنے یہ دونوں بے دست و پا ہیں۔ نتیجے میں جمیل کا دوغلا پن سامنے آتا ہے۔ نام نہاد شرافت کے اظہار میں شادی تو شکیلہ سے کر لیتا ہے مگر محبتوں کا حق دار نجمہ کو ہی بنائے رکھتا ہے۔ یہاں نذر کی حسیّت مرد کے دوغلے پن کو نمایاں کر کے عورت کے ان نسائی جذبات کو زبان دیتی ہے جو وہ بیوی کے روپ میں محسوس کرتی ہے۔ اسی وجہ سے نذر شادی کے لیے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ اگر شادی سے قبل لڑکا یا لڑکی کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور شادی دوسری جگہ ہو جائے تو دونوں کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے لیکن نذر سجاد یہ بھی محسوس کرتی ہیں کہ روایت کے اسیر معاشرے میں یہ کہنا تو آسان ہے مگر اس پر عمل یقیناً مشکل ہے کہ ہماری سماجی اقدار کی قیود ایسے بندھن پسند نہیں کرتی۔ وہ سماج کی دقیانوسیت کا احساس رکھتی تھی۔ اسی لیے کہتی ہیں کہ جو لوگ پہلے محبت پھر شادی کرتے ہیں وہ ناکامیاب رہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سماج کے بندھنوں سے سخت نالاں ہیں۔

آہ مظلوماں میں نذر کی حسیّت دوسری شادی کے خطرناک نتائج کو سامنے لاتی ہے۔ ناول میں دو کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ دونوں ہی دوسری شادی کے بُرے اثرات کے پیشِ نظر بنی گئی ہیں۔ پہلی کہانی ڈپٹی صاحبہ، سلطنت آرا اور زرین جان اور چند ضمنی کرداروں پر مبنی ہے۔ ڈپٹی صاحب ایک صاحبِ ثروت انسان ہیں۔ ان کی شادی سلطنت آراء سے ہوتی ہے جس کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ دونوں میاں بیوی میں محبت بھی موجود ہے لیکن زریں نامی عورت ڈپٹی صاحب کو اپنے دامِ فریب میں پھانس لیتی ہے۔ وہ بہانے سے بیگم کو میکے بھیج کر زریں جان سے نکاح کر لیتے ہیں۔ سلطنت آراء شوہر کی دوسری شادی کا سن کر واپس آتی ہے اور صبر کے ساتھ رہتی ہے۔ زریں جان

آہستہ آہستہ ڈپٹی صاحب کے دل سے سلطنت آراء کی محبت نکال دیتی ہے۔ سلطنت آراء یہ سب خاموشی سے سہہ گزرتی ہے۔ کچھ عرصے بعد ڈپٹی صاحب بیمار پڑ جاتے ہیں۔ دولت ختم ہونے لگتی ہے۔ زریں جان، ڈپٹی صاحب کی صحت سے مایوس ہو کر اور یہ خیال کر کے کہ اب اسے اپنے زیورات بھی علاج کے لیے فروخت کرنے پڑ سکتے ہیں۔ گھر سے فرار ہو جاتی ہے۔ سلطنت آراء کو ان حالات کی خبر ہوتی ہے تو وہ ڈپٹی صاحب کی ساری غلطیاں معاف کر کے واپس آ جاتی ہے۔

اس کہانی کا دوسرا پلاٹ نچلے متوسط طبقے سے متعلق ہے۔ اس کے مرکزی کرداروں میں عظمت، زبیدہ اور عظمت کی ماں شامل ہیں۔ زبیدہ ایک سلیقہ شعار اور خاموش طبع عورت ہے لیکن عظمت کی ماں کم ظرف اور سنگ دل ساس کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ وہ عظمت اللہ کی دوسری شادی (جس میں خود عظمت کی بھی خواہش شامل ہے) کرا دیتی ہے اور زبیدہ کو گھر سے نکال دیتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ گھر کی معاشی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔ ماں بیٹے کے بیمار پڑ جانے پر نئی بہو ساس اور شوہر کو چھوڑ کر میکے چلی جاتی ہے۔ بعد میں ایک بچے کی پیدائش کے وقت اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ بگڑے ہوئے حالات میں زبیدہ گھر واپس آ کر شوہر و ساس کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور گھر کا خرچ بھی سلائی کڑھائی کر کے سنبھالتی ہے۔

نذر اس ناول کے ذریعے یہ بتانا چاہتی ہیں کہ دوسری شادی کا چلن اعلیٰ اور متوسط دونوں طبقات میں پایا جاتا ہے اور معاشرے میں اس رسم کو نہ صرف مرد کی ہوس پرستی بنیاد فراہم کرتی ہے بل کہ عظمت کی ماں جیسی کچھ کم ظرف خواتین بھی اسے پھیلانے میں شریک ہیں۔

ناول میں نذر اس خطرناک نتائج کے حامل رواج کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں۔ بل کہ اس کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہیں۔ سلطنت آراء ایک تعلیم یافتہ عورت ہے جو اپنے حقوق کا ادراک رکھتی ہے۔ اگرچہ وہ بھی شوہر کی دوسری شادی کو بے بسی سے قبول کرتی نظر آتی ہے لیکن شوہر سے دوسری شادی کی وجہ ضرور پوچھتی ہے۔

زبیدہ بھی شوہر کے اس اقدام پر رنجیدہ ہیں لیکن رونے دھونے کی بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ زبیدہ اور سلطنت کے کردار مظلوم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی ہیں۔ نذر زبیدہ کے کردار میں ایسی آئیڈیل عورت کو پیش کرتی ہیں جو مجبور ہوتے ہوئے بھی مضبوط ہو۔ خود بے سہارا ہوتے ہوئے بھی اوروں کا سہارا بنے۔ ناول کے آخر میں نذر کا قوم کے ریفارمروں سے خطاب احتجاجی رنگ لیے ہوئے ہے۔

دکھ بھری کہانی میں مصنفہ کی نسائی حسیّت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ کہانی دوسری شادی اور جہیز کی لعنت پر مبنی ہے۔ قصے کا مرکزی کردار نجیبہ ہے جو حالات کے سامنے بے دست و پا کھڑی ہے۔ نجیبہ ایک غریب

گھرانے میں پیدا ہوئی۔ یتیمی اور لاوارثی نے ماموں ممانی کے در پر لا پھینکا۔ احسان علی سے شادی نے نئی مصیبتوں کے در وا کر دیئے۔ شوہر بیوی کا قدر دان ہوا تو ساس کے روپ میں جو عورت کی ازلی دشمنی آڑے آئی۔ اولاد نرینہ کے بہانے احسان کی دوسری شادی طے کر دی۔

حمیدہ ایک تو نئی بیوی تھی دوسرے جہیز بھی نجیبہ سے زیادہ لائی تھی۔ پدر سری ذہنیت نے نئی بیوی کے آنے پر پرانی بیوی کو مالکن سے نوکرانی کی حیثیت پر لایا اور پھر گھر سے نکال کر کھنڈر مکان میں ڈال دیا۔ نذر سجاد حیدر سماج میں عورت کے اس مرتبے پر سیخ پا ہو کر ایسے مردوں کو سنگ دل اور وحشی کا خطاب دیتی ہیں جو ذرا سی مذہب کی آڑ لے کر بلا ضرورت دوسری شادی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ نجیبہ کی الم ناک صورت میں نذر نے سجاد میں مرد کے عورت پر ہونے والے مظالم کو پیش کیا ہے۔ نذر کا یہ ناول اگرچہ مختصر ہے لیکن پھر بھی یہ مختصر جملے اور مختصر کہانی عورت کی بے بسی اور استحصال کی سچی تصویریں سامنے لے آتی ہے۔

مذہب اور عشق دیگر ناولوں سے الگ ہے۔ یوں تو یہ بھی ایک اصلاحی ناول ہے۔ اس میں انھوں نے عورت کی اصلاح اپنے طور پر کرانے کی بجائے مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے کرائی ہے۔ ناول کی ہیروئین سوشیلا جب بیرونِ ملک سے تعلیم حاصل کر کے لوٹتی ہے تو اس کی ملاقات شبیر سے ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق کو لے کر دونوں میں گفتگو ہوتی ہے۔ شبیر اسے اسلام میں عورت کے مرتبے سے آگاہ کرتا ہے۔ سوشیلا اسلام قبول کر کے شبیر سے شادی کر لیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک رومانوی کہانی ہے لیکن سوشیلا کے سوالات کے ذریعے نذر نے ہندوستانی عورت کے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ عورت کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک، بغیر مرضی کی شادی، پردے کی سختی سماج کے وہ کھوکھلے اصول تھے جن پر صدیوں سے عورت کی زندگی قربان ہو رہی تھی۔ جب سوشیلا اسلام میں عورت کے حقوق میں مرد کے مساوی نظر آتی ہے تو وہ شبیر سے شادی کر لیتی ہے۔ نذر سوشیلا کے اس عمل کو پیش کر کے یہ باور کرانا چاہتی ہیں کہ عورت اپنی اصلی حالت سے کس قدر نالاں و شاکی تھی۔ مصنفہ کا نسائی مزاج سماج میں عورت کو جس روپ میں دیکھنا چاہتا تھا وہ انھیں مذہب اسلام میں نظر آیا اسی لیے انھوں نے اس بات کو سوشیلا اور شبیر کے مکالمے کے ذریعے واضح طور پر بیان کیا۔

ناول جاں باز کا موضوع وطن پرستی کے حوالے سے عورت کی سوچ اور کردار ہے۔ یہ ناول نذر نے سوریشی تحریک کے پس منظر میں لکھا جو اس امر کا عکاس ہے کہ مصنفہ اپنے دور کے تہذیبی ٹکراؤ، سماجی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی بدلاؤ سے بھی بخوبی آشنا تھیں۔ ناول کی ہیروئن زبیدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور آزاد خیال لڑکی ہے جس کی نسبت قمر سے طے ہو چکی ہے۔ وہ اپنے منگیتر قمر پر دل و جان سے فدا ہے لیکن قمر مغربی تہذیب کا پرستار ہے۔ وہ

چاہتا ہے کہ زبیدہ ایک الٹرا ماڈرن روپ اختیار کرے اور وہی روش اختیار کرے جس کا وہ خود راہی ہے۔ یہ بات زبیدہ کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ قمر ایک انتہائی روشن خیال لڑکی نجمہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یوں زبیدہ اس کے دل سے اتر جاتی ہے۔ قمر کی بے وفائی کے بعد زبیدہ وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر تحریک عدم تعاون میں عملی حصہ لیتی ہے۔ قمر نجمہ سے شادی کر کے ناکام ہونے پر زبیدہ کی طرف لوٹتا ہے۔ اب اسے زبیدہ کا محب وطن روپ بہت بھاتا ہے۔ قمر کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر زبیدہ اس کی شریکِ حیات بننے کی حامی بھر لیتی ہے۔

ناول میں مصنفہ نے عورتوں کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار زیادہ نہیں کیا۔ نسائی حسیّت کے اعتبار سے یہ اتنا اہم نہیں البتہ زبیدہ کا کردار نذر کا آئیڈیل کردار ہے۔ ناول کا موضوع وطن پرستی اور مغربی تہذیب کی نقالی کے بڑے نتائج کے گرد گھومتا ہے۔

حرماں نصیب ایک رومانوی ناول ہے تاہم اسے مکمل رومانوی ناول بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ناول میں مقصدیت موضوع پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول کا موضوع بہن بھائی کی محبت ہے۔ بھائی فیروز کی اچانک وفات سے فیروزہ کا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنے محبوب (ظفر) سے بھی کنارہ کر لیتی ہے اور زندگی سے بے زار ہو کر ایک ویران گوشے میں پڑی رہتی ہے اور یہ فیصلہ کرتی ہے کہ باقی ماندہ زندگی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے مرحوم بھائی کی مغفرت کے لیے دکھی انسانیت کی خدمت میں گزر بسر کرے گی۔ فیروزہ ایک تعلیم یافتہ باحوصلہ اور خود اعتماد لڑکی ہے جو اپنی زندگی کے فیصلے کو د کرتی ہے۔ ڈاکٹر بننے کے لیے انگلستان جاتی ہے اور اتنی خود مختار ہے کہ بھائی کی وفات کے بعد دل برداشتہ ہو کر تنہا ایک انجان جگہ پناہ لیتی ہے لیکن اس کی خود اعتمادی جذباتیت میں دب کر رہ جاتی ہے۔

ظفر جو اسے سہارا دینے کے لیے تیار ہے اس سے بے گانگی اختیار کر لیتی ہے اور ڈاکٹری پڑھنے انگلستان روانہ ہو جاتی ہے۔ بالآخر ظفر والدین کے اصرار پر شادی کر لیتا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں اور وہ مسوری میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر اس کی ملاقات فیروزہ سے ہوتی ہے۔ ظفر یہ جان کر غمگین ہوتا ہے کہ فیروزہ اس کی محبت دل میں سجا کے کنواری ہی ہے۔ اس کے اپنے بیوی بچے بھی ہیں پھر بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فیروزہ کے پاس پہنچتا ہے لیکن چوں کہ فیروزہ پڑھی لکھی اور حساس دل کی مالک عورت ہے اسی لیے وہ دوسری عورت یعنی ظفر کی بیوی کا حق چھیننا نہیں چاہتی۔ اس لیے ظفر کے بڑھے ہوئے ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیتی ہے۔

یہ ناول ایک عورت کے نسائی جذبات کا بہترین مرقع ہے اور ایک عورت کی انتہاء محبت کا وہ رخ ہے جسے سمجھنے میں مردانہ سماج نے ہمیشہ دھوکا کھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیروزہ پر بھی بلا تحقیق اور بلا جھجک بے وفائی اور سنگ

دلی کی مہر ثبت کر دی گئی۔ ناول میں نسائی احساسات کو مصنفہ نے بڑے پُر اثر انداز میں بیاں کیا ہے۔ نذر کا یہ ناول ان کی نسائی حسیّت کا بین ثبوت ہے۔

ناول ثریـــــــا کا موضوع بھی ایک بے جوڑ اور بغیر مرضی کی شادی ہے۔ ناول کی ہیروئن کا نام ثریا ہے جو والدین کے انتقال کے بعد دادی کے پاس پلتی بڑھتی ہے۔ ایک روز اپنی سہیلی مرہنی کے ہاں اس کی ملاقات کیواں قدر سے ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔ کیواں، ثریا سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر گھر والے انکار کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ مصنفہ کیواں کی بچپن کی منگنی بتاتی ہیں۔ کیواں اپنی خالہ زاد بہن سلطنت آراء سے منسوب ہیں جس سے بغاوت کی اجازت نہ خاندانی روایات دیتی ہیں اور نہ ہندوستانی معاشرتی اقدار، گھر والوں کے انکار کی وجہ دونوں کے مابین حائل فرقِ مراتب بنتا ہے۔

کیواں قدر ایک عالی جاہ نواب کے چشم و چراغ ہیں اور ثریا ایک غریب، یتیم اور لاوارث لڑکی جس کو دادی نے پرورش کیا۔ کیواں قدر کے اصرار پر بھی جب بڑے نواب اس رشتے کو قبول نہیں کرتے تو کیواں اپنے دوست سندر لال اور اس کی بہن موہنی کی مدد سے خاموشی سے ثریا سے نکاح کر لیتا ہے۔

کیواں محل میں جب کیواں قدر اور سلطنت آراء کی شادی کی تاریخ مقرر ہونے لگتی ہے تو کیواں قدر ثریا سے اپنے نکاح کا راز افشاں کر دیتے ہیں اور ثریا کو بطور بیوی کیواں محل میں رخصت کرا کر لانے پر بضد ہو جاتے ہیں لیکن بڑے نواب بیٹے کو جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکی دے کر سلطنت سے زبردستی بیاہ دیتے ہیں۔ کیواں سلطنت سے شادی کے وقت ثریا ماں بننے والی ہوتی ہے۔ دادی ثریا اور کیواں کے چوری چھپے نکاح اور اب نواسے کی آمد کو ننگ و عار سمجھ کر ثریا کو تنہا چھوڑ کر بھتیجے کے ہاں روانہ ہو جاتی ہیں۔ ثریا بے سہارا ہو کر لکھنؤ چھوڑ دیتی ہے۔

کیواں قدر سلطنت سے شادی کے ایک سال بعد سول سروس کے لیے انگلینڈ چلے جاتے ہیں۔ ہندوستان واپسی کے بعد ایک روز ان کی ملاقات اپنی پہلی بیوی ثریا اور بیٹے آسمان قدر سے ہوتی ہے۔ اب کیواں قدر معاشی اعتبار سے خود انحصار ہیں۔ وہ سلطنت آراء کو تین بچوں کے ساتھ اپنے والد کے ہاں چھوڑ کر ثریا کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

نذر سجاد حیدر نے اس ناول میں بغیر مرضی کی شادی کے خطرناک نتائج دکھا کر معاشرے سے اس برائی کا سدباب کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں کئی معصوم عورتوں کی زندگیاں ویران اور تلخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ناول نگار نے یہ ثابت کیا ہے کہ والدین کی محترم حیثیت اپنی جگہ لیکن سماج میں ایسے خاندان اکثریت سے ہیں جو عاقل و

بالغ اور باشعور عمر تک پہنچنے کے باوجود اولاد کو والدین اپنی مرضی کے تابع رکھتے ہیں جو ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور عبرت ناک انجام کی صورت میں منتج ہوتا ہے۔

شہید جفا بھی دوسری شادی کے نتیجے میں جنم لینے والی ناگوار صورتِ حال پر لکھا گیا نذر کا ایک اصلاحی قصہ ہے۔ قصے کے کردار کو سلیا، سرلا، مسٹر چندر اور مسٹر روشن لال ہیں۔ مسٹر چندر اور کوشلیا لندن سے واپسی کے سفر میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں مگر تین سال بعد کوشلیا مسٹر چندر سے بے وفائی کر کے اپنی دوست سرلا کے شوہر سے شادی رچا لیتی ہے۔ سرلا اس صدمے کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر لیتی ہے۔ نذر کا یہ ناول بھی ان کے دوسرے ناولوں کی طرح اصلاحی مقصد کا حامل ہے۔

نذر کے یہ ناول اپنے عہد کی بڑی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف عورتوں کے مسائل کو آواز فراہم کی بل کہ عورت کے لیے سوچ و فکر کی راہ بھی متعین کی اور اس ضمن میں ان کی معاصر خواتین کی کاوشیں بھی بے مثال ہیں۔

خواتین کے حقوق کے حوالے سے کی جانے والی بے شمار کوششوں کے باوجود آج بھی عورتیں مردوں کے ہم پلہ نہیں قرار دی گئی اور وہ آج بھی اپنے حقیقی مرتبے سے محروم ہیں۔ جائز حقوق سے محروم کر کے تشنگی عورت کا مقدر بنا دی گئی۔ عورت سے ناروا سلوک اور عدم مساوات معاشرے میں ڈھکا چھپا نہیں۔ خواتین زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی تو ہوئی۔ مگر پھر بھی ان کے حقوق صرف کاغذائی کاروائی تک محدود رہے۔

آج ہم بائیسویں صدی میں سانس والے رہے ہیں۔ ہماری سوچ اور فکر مختلف ہو گئی ہے۔ اگر آج ہم اپنے اسلامی معاشرے میں رہنے والی عورت پر نظر ڈالیں تو کچھ حقائق سامنے آتے ہیں جو خواتین کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ شادی کرنا عورتوں کا بنیادی حق ہے اور یہ حق اسے ہمارے مذہب اسلام نے بھی دیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے کئی علاقوں میں خواتین کو اس حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور لڑکیوں کی قرآن سے شادی کر کے ان سے حق بخشوا لیا جاتا ہے۔ معاشرے میں یہ رواج قائم کرنے والوں کا تعلق جاگیرداروں اور وڈیروں کے خاندان سے ہے۔ اس لیے ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرتا۔

ہمارے مسلم معاشرے میں عورت کو اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ اپنی مرضی سے کئی شادی کر لیتی ہے تو غیرت مند بھائی اسے موت کے گھات اتار دیتا ہے۔

دیہی علاقوں میں وٹہ سٹہ کی شادیوں سے بہت سی خواتین متاثر ہوتی ہیں۔ اکثر خاندان سے باہر شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور خاندان میں مناسب بر ہونے کی وجہ سے عورتیں والدین کے گھر ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں، یا پھر بے جوڑ رشتے کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

غیرت کے نام پر عورت کا قتل پاکستان کے مختلف حصوں میں نظر آتا ہے۔ بعض اوقات تو صرف شک و شبے کی بنیاد پر عورت کو قتل کر دیا جاتا ہے اور جرگہ سسٹم کے تحت خواتین کو سزائیں دی جاتی ہیں۔

جہیز کی رسم سے نقصان ہمارے معاشرے میں ہمیشہ عورت کو پہنچتا ہے۔ کم جہیز لانے کی پاداش میں وہ ساری زندگی نوکرانی کی حیثیت سے عمر گزار دیتی ہے اور اسے بات بات پہ بات جہیز نہ لانے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

عورت کو شادی کے بعد صرف خاوند سے ہی نہیں بل کہ پورے گھرانے سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ شادی شدہ جوڑے کا الگ گھر لے کر رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے جب کہ اسلام نے مشترکہ فیملی میں رہنے کی کوئی پابندی نہیں لگائی۔

آج بھی یہ تمام مسائل ناول کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن اب ناول نگار مجموعی رویوں کی بات کرتا ہے۔ عورت کے انفرادی مسائل سے اسے کوئی سروکار نہیں رہا۔ وہ اپنی ذات کے حصار میں ہی الجھ کر رہ چکا ہے، وہ نہ ہی عورت کے ان مسائل کو سامنے لاتا ہے اور نہ ہی ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کتابیات

آر، ترچند، *History of Fredeam movement in India*، دہلی، ۱۹۶۵ء۔

آر، نسیم، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۸ء۔

آصف، محمد، تحریک آزادی نسواں اور اقبال، بازیافت، لاہور: شمارہ ۲۲، ۲۰۱۳ء۔

احمد، نذیر، دیباچہ مراۃ العروس، دہلی: کاک آفیسٹ پرنٹرز پریس، س۔ن۔

احمد، عزیز، اقبال کی نئی تشکیل، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء۔

احمد، لیلیٰ، عورت جنسی تفریق اور اسلام، مترجم خلیل احمد۔ لاہور: مشعل، ۱۹۹۵ء۔

احمد، نذیر، الطاف حسین حالی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۲ء۔

احمد، نذیر، ایامیٰ، دہلی، ۱۸۹۱ء۔

احمد، نذیر، بنات النعش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

احمد، نذیر، فسانۂ مبتلا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

احمد، نذیر، مراۃ العروس، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

اختر، سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

اختر، سید جاوید، اردو کی ناول نگار خواتین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

الاسلام، عبد، اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء۔

اشفاق، حمیرا، نثر رشید جہاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

اقبال، جاوید، آزادئ نسواں اور زوالِ نسواں، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔

اقبال، رابعہ، اردو ادب اور طبقہ نسواں، حیدرآباد: ادارۂ اُردو، ۱۹۹۰ء۔

اقبال۔ مقالاتِ اقبال۔ "شریعتِ اسلام میں مرد و عورت کا مرتبہ"، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء۔

اقبال، مقالاتِ اقبال، "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء۔

المجید، خواجا عبد، جامع اللغات، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء۔

انجم، تنویر، "نسائی تحریک کا ارتقاء" مشمولہ خاموشی کی آواز، مرتبہ فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۳ء۔

انسائی کلو پیڈیا آف براٹینکا۔

الباری، امت، اردو کی ناول نگار خواتین، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء۔

بخاری، سہیل، اردو ناول نگاری، لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۶ء۔

بخش، ایم سلطانہ، "اردو افسانہ نگار، قصہ نگار اور ناول نگار خواتین کا ادب"، پاکستانی ادبیات میں خواتین

کا کردار، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۱۹۹۶ء۔

براؤن، پی، *The Body and Society*، کولمبیا: کولمبیا یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء۔

بشیر، زینت، نذیر احمد کے ناولوں میں نسائی کردار، حیدرآباد: الیاس ٹریڈرز، ۱۹۹۷ء۔

بووا، سیمون دی، عورت کیا ہے؟، مترم یاسر جواد، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔

بیگم، اکبری، گودڑ کا لال، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، س۔ن۔

بیگم، طیہ، انوری بیگم، س۔ن۔

بیگم، محمدی، آج کل، لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۰ء۔

بیگم، محمدی، شریف بیٹی، لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۸ء۔

بیگم، محمدی، صفیہ بیگم، لاہور: تاج و حجاب دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۵۹ء۔

بیگم، محمدی، صفیہ بیگم، لاہور: دارالاشاعت، ۱۹۱۸ء۔

پانی پتی۔ شیخ محمد اسماعیل، تاج صاحب کے والدین، صحیفہ تاج نمبر لاہور۔

پانی پتی۔ شیخ محمد اسماعیل، سید احمد کا سفرنامہ پنجاب، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۱ء۔

پانی پتی۔ شیخ محمد اسماعیل، مکتوباتِ سرسید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸ء۔

پانی پتی۔ شیخ محمد اسماعیل، خطباتِ سرسید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء۔

تھانوی، شوکت، بہشتی زیور، لاہور: کتب خانہ جمیلی۔ س۔ن۔

جالبی، جمیل، ارسطو سے ایلیٹ تک، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۰ء۔

جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء۔

جاوید، عقیلہ، اردو ناول میں تانیثیت، ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

جمیل، عصمت، جدید ادبی تحریکوں میں نسائی شعور، ریسرچ جرنل سرگودھا، شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء۔

جیوریٹ۔ میری لوئیس جینس، "لسانیات میں تذکیر و تانیث کا فرق" مترجم مسعود اشعر مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، مرتبہ کشور ناہید۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔

حالی، الطاف حسین، "ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟"، کلیات نثر حالی، جلد اول، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔

حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء۔

حالی، الطاف حسین، کلیات نظم حالی مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء۔

حالی، الطاف حسین، مجالس النساء، پانی پت: حالی پریس، ۱۹۲۴ء۔

حالی، الطاف حسین، "مشیر نسواں"، کلیات نثر حالی، جلد دوم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء۔

حسن، فاطمہ، ز خ ش حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۷ء۔

حسن، فاطمہ، "نسائی ادب اور تنقید"، مشمولہ خاموشی کی آواز، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۳ء۔

حسین، شگفتہ، بنت نذر باقر اور آزادی نسواں، دریافت، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء۔

حسین، شائلہ، اردو ڈرامے کے نمائندہ نسائی کردار: تحقیق تقابل و تجزیہ، ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ۲۰۱۴ء۔

حسین، محمد شاہد، عوامی روایات اور اردو ڈراما نویسی، نئی دہلی: حسین پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔

حسین، ملک فدا، *Wives of the Prophet*۔، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۶۱ء۔

حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ و تنقیدی، لکھنؤ۔

حشر، بال مکند، بدھ اور عورت، آج کل، بدھ نمبر (نومبر ۱۹۵۶ء)۔

حنا، زاہدہ، عورت زندگی کا زنداں، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء۔

حنا، زاہدہ، نسائی ادب ایک سرسری جائزہ، ادبیات، جلد ۱۸، شمارہ ۷۱، (جنوری تا جون ۲۰۰۷ء)۔

حنیف، ابن، دنیا کا قدیم ترین ادب، ملتان: بیکن پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

حیدر، قرۃ العین، کارِ جہاں دراز ہے، جلد ۱، لاہور: مکتبہ اردو ادب، ندارد۔

حیدر، نذر سجاد، رسم منگنی، عصمت، دہلی: جلد ۳۸، ۱۹۲۷ء۔

حیدر، نذر سجاد، نجمہ، دہلی: عصمت بُک ڈپو، ۱۹۴۲ء۔

حیدر، نذر سجاد، اختر النساء بیگم، مرتبہ قرۃ العین حیدر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

حیدر، نذر سجاد، ایک تجویز، عصمت، دہلی: جلد ۴۰، ۱۹۲۸ء۔

حیدر، نذر سجاد، ثریا،

حیدر، نذر سجاد، جاں باز،

حیدر، نذر سجاد، حرماں نصیب، لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۵ء۔

حیدر، نذر سجاد، دُکھ بھری کہانی، لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء۔

حیدر، نذر سجاد، مذہب اور عشق، مرتبہ قرۃ العین۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

حیدر، نذر سجاد، اختر النساء بیگم، لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۵ء۔

خان، غلام مصطفیٰ، حالی کا ذہنی ارتقا، لاہور: مکتبہ کاروان، س۔ن۔

خان، اشفاق احمد، نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔

خان، اشفاق محمد، نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔

خان، سرسید احمد، اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷ء، فصل اول، سندھ: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۶ء۔

خان، سرسید احمد، خطبات سرسید مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء۔

خان، سرسید احمد، "کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا"، مقالات سرسید مرتبہ مولانا محمد اسماعیل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء۔

خان، سرسید احمد، مکتوبات سرسید، مرتب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۵ء۔

خان، سرسید احمد، "ہندوستان کی عورتوں کی حالت"، مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔

خان، سرسید احمد، بیوہ عورتوں کا نکاں نہ کرنے میں کیا فساد ہے؟۔مقالات سرسید مرتبہ مولانا محمد اسماعیل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔

خان، سرسید احمد، "عورتوں کے حقوق"، مقالاتِ سرسید، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔

خسرو، طیبہ، صغرا بیگم اور نسوانی دنیا ، مشمولہ یاد صغرا ہمایوں مرزا سرفراز علی۔

خورشید، عبدالسلام، داستانِ صحافت، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن۔

الخیری، رازق، "عصمت کے پچاس سال"، عصمت، دہلی، ۱۹۵۸ء۔

الخیری، علامہ راشد، صبح زندگی، کراچی: انجمن پریس، ۱۹۷۶ء۔

الخیری، علامہ راشد، نوحہ زندگی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

دی آکسفورڈ ڈکشنری، ۱۹۹۵ء۔

رپورٹ آف انڈین ایجوکیشن کمیشن، ۱۸۸۳ء۔۱۸۸۴ء۔

رحمانی، مولانا عبدالصمد، اسلام میں عورت کا مقام، لاہور: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۲ء۔

رزمی، ثاقب، آزادی نسواں اور نیا سویرا، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۲ء۔

ریاض، فہمیدہ، فیمینزم اور ہم مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء۔

ریاض، فہمیدہ، مرتب و مترجم ویمنز ورلڈ، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۱۹۹۶ء۔

زبیری، مولوی محمد امین، مسلم خواتین کی تعلیم، کراچی: زبیری ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۵۶ء۔

زیدی، ساجد، "تانیثی تنقید" مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت مرتبہ ڈاکٹر قاضی عابد، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔

سدید، انور، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء۔

سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء۔

سدید، انور، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اسلام آباد: رمنا پریس، س۔ن۔

سرشار، رتن ناتھ،فسانہ آزاد، جلد اول، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، س۔ن۔
سرمست، یوسف،بیسویں صدی میں اردو ناول، حیدرآباد: نیشنل بُک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۳ء۔
سعدوی، نوال، "غلاموں کی آزادی"، مشمولہ عورت زبان خلق سے زبان حال تک، مرتبہ کشور ناھید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
سعید، حمیرہ،اردو ناولوں میں نسائی حسیت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء۔
سہیل، سید عامر، "میں ایک زندہ عورت ہوں: تانیثیت مطالعہ "تحقیقی زاویے، بھمبر، شمارہ ۵۰، جنوری۔جون ۲۰۱۵ء۔
شرر، عبدالحلیم،بدر النساء کی مصیبت، لکھنؤ: نسیم بُک ڈپو، ۱۹۷۲ء۔
شرر، عبدالحلیم،حسن کا ڈاکو، لکھنؤ: دل گداز پریس، س۔ن۔
شرر، عبدالحلیم،مینا بازار، لکھنؤ: یونائیٹڈ انڈیا پریس، س۔ن۔
شفقت، شرافت حسین، عورت مذہب اور حکومت، لاہور: نسیم بُک ڈپو س۔ن۔
صابری، مولانا امداد،تاریخ صحافتِ اُردو، جلد ۳، دہلی: دہلی پریس، ۱۹۶۳ء۔
صابری، مولانا امداد،تاریخ صحافتِ اُردو، جلد ۴، دہلی: مطبوعہ یونین پریس، س۔ن۔
صدیقی، ابواللیث صدیقی،آج کا اُردو ادب، علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، س۔ن۔
صدیقی، عتیق احمد، سرسید اور تعلیم نسواں، مشمولہ سہ ماہی فکر و آگہی۔ دہلی: علی گڑھ نمبر، ۲۰۰۰ء۔
صدیقی، عظیم الشان، "اردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصّہ "مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین۔ دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۴ء۔
عارف، نجیبہ، تانیثیت کے بنیادی مباحث، اقبال کا نقطۂ نظر، تحقیق، جام شورو: شمارہ ۱۸، ۲۰۰۹ء۔
عارف، نجیبہ، حسن کی دیومالا کا استحصال، مشمولہ جنگ، راولپنڈی: ۲۲ اگست ۲۰۱۰ء۔
عارف، نجیبہ، رفتہ و آیندہ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء۔
عثمانی، داؤد، علامہ راشد الخیری کی تحریروں کا فنی مطالعہ، زبان و ادب، فیصل آباد: شمارہ ۱۵، ۲۰۱۴ء۔
عظیم، وقار، داستان سے افسانے تک، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔
علی، عابدہ علی، عورت قرآن و سنت کے آئینے میں، لاہور: قرآن منزل۔ س۔ن۔

علی، مبارک، "عورت: تاریخ کیا کہتی ہے" مشمولہ عورت: زبانِ خلق سے زبان حال تک مرتبہ کشور ناھید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔

علی، مبارک، تاریخ اور عورت، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

فاروقی، شمس الرحمان، "تانیثیت Feminism کی تفہیم" مشمولہ ادبیات: انتخاب خواتین کا عالمی ادب، اسلام آباد۔

فاروقی، محمد احسن، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لاہور: ساگر اکادمی، ۱۹۶۸ء۔

فاطمی، علی احمد، "تحریک نسواں اور اُردو ادب" مشمولہ اردو ادب کو خواتین کی دین، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء۔

فرمان، عظمیٰ، "نسائیت: ایک تعارف" مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت مرتبہ قاضی عابد، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔

فرمان، عظمیٰ، "نسائی تنقید: مسائل و مباحث" مشمولہ تحقیق۔ شمارہ ۱۸، ۲۰۰۹ء۔

فرمان، عظمیٰ، اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ، کراچی: کراچی یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء۔

فضل، سیمیں ثمر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، نئی دہلی: ادارہ فکر جدید، ۱۹۹۱ء۔

فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز۔

القرآن، سورۃ البقرۃ، آیت۔

القرآن، سورۃ التغابن، آیت ۱۴۔

القرآن، سورۃ آل عمران، آیت ۱۴۔

القرآن، سورۃ آل عمران، آیت ۱۹۵۔

القرآن، سورۃ مریم، آیت ۲۔

قریشی، محمد اسلم، ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔

قمر، نذر حسین، عورت کی تاریخی، معاشرتی اور مذہبی حیثیت، لاہور: اسلامیہ دارالتبلیغ۔

س۔ن

کریم، ارتضیٰ،قرۃ العین: ایک مطالعہ، دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء۔
کوثر، ریحانہ،محمدی بیگم زوجہ شمس العلماء مولوی ممتاز علی، اردو صحافت کی پہلی خاتون ایڈیٹر، ملتان: جرنل آف ریسرچ شمارہ ۲۰، ۲۰۱۱ء۔
کوکب، فرزانہ، "کشور ناھید اور زاہدہ حنا: تانیثی شعور، منتخب اخباری کالموں کے تناظر میں"، باز یافت۔ لاہور: شمارہ ۲۲، جنوری تا جون ۲۰۱۳ء۔
کول، کشن پرشاد، ادبی و قومی تذکرے، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، س۔ن۔
گوہر، ممتاز علی،منتخابات تہذیب نسواں، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔
لیکی، تاریخ اخلاق یورپ، مترجم عبد الماجد، لکھنؤ: الناظر پریس چوک، ۱۹۱۷ء۔
مارگریٹ، والٹرز، *A Very Short Introduction of Feminism*، پاکستان: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء۔
مرزا، صغرا ہمایوں، سرگزشتِ ہاجرہ، حیدرآباد، ۱۹۲۶ء۔
مریم ویبسٹر کالج ڈیجیٹل ڈکشنری۔
مسعود، اشعر، "عورت اور فطرت تقاضے"، مشمولہ، مرتبہ کشور ناھید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
مسعود، طاہر، اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۶ء۔
مظہر، نعیم، "سرسید کا نظریہ تعلیم نسواں"، مشمولہ تخلیقی ادب، اسلام آباد: شمارہ ۶، جون ۲۰۰۹ء۔
معظم، شعیب، اردو کی پہلی ناول نگار خاتون، نقوش، لاہور: شمارہ ۱۱۵، س۔ن۔
ملک، ایم۔اے، عورت کی نفسیات، لاہور: فیروز سنز ۱۹۹۸ء۔
مہدی، صغرا۔ "اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۳ء۔
مہدی، صغرا، "تحریک نسواں کے علم بردار: خواجا الطاف حسین حالی" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء۔
مودودی، سید ابو الاعلیٰ، پردہ، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔
میر، وارث، کیا عورت آدھی ہے، لاہور: نگارشات پریس، ۱۹۸۸ء۔

ناهید، کشور، "ادب اور نسائیت" مشمولہ خاموشی کی آواز مرتبہ فاطمہ حسن۔ کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۳ء۔

ناهید، کشور، "ہمارے ادب اور فنون لطیفہ میں میچور عورت کہاں ہے" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن۔ کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء۔

ندوی، شاہ معین الدین، دین رحمت، کراچی: ایجوکیشن پریس، ۱۹۶۷ء۔

النساء، رشیدہ، اصلاح النساء، کراچی: احمد برادرز، ۲۰۰۰ء۔

النساء، رشیدہ، دیباچہ اصلاح النساء، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۸ء۔

نقوی، نورالحسن، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ: ایجوکیشنل ہاؤس، ۱۹۷۹ء۔

نکہت، شمیم، "تحریک آزادی نسواں" مشمولہ اُردو ادب کو خواتین کی دین، دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۴ء۔

نیر، ناصر عباس، جدید مابعد جدید تنقید، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۴ء۔

نیر، نورالحسن، نور اللغات، جلد ۲، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۱۹۹۸ء۔

ہارون، انیس، "فیمینزم اور پاکستانی عورت" مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن۔ کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء۔

ہاشمی، نصیر الدین، "خواتین یورپ اور ہندوستان کی مسلمان عورتیں"، عصمت، اکتوبر ۱۹۳۱ء۔